نقوشِ زنداں

مؤلفہ

حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی

ناشر

مکتبہ قاسمیہ، شہر سیالکوٹ

نقوشِ زنداں

یعنی تحریکِ ختم نبوت کی قید و بند میں لکھے ہوئے
مختلف احباب کے نام خطوط، جن میں اسلام کے بنیادی
مسائل ختم نبوت، مسئلہ ارتداد، توحید و رسالت، مقامِ
نبوت، احسان و استحسان پر تبصرہ اور مختلف آیات قرآنی
اور ارشادات نبوت کی تشریح کی گئی ہے۔

—— از ——

حضرت مولانا الحافظ الحاج محمد علی صاحب صدیقی

صدر دار العلوم الشہابیہ سیالکوٹ

—— ناشر ——

مکتبہ قاسمیہ رنگپورہ روڈ شہر سیالکوٹ

سلسلہ مطبوعات نمبر ۴

تالیف ... ... حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی

عنادین ۳۳۷

آیات ۹۲

احادیث ۵۴

کل صفحات ۳۱۲

طابع ... ... محمد شریف قاسمی

ناشر ... ... مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ

مطبع ... ... اقبال پرنٹنگ پریس سیالکوٹ

قیمت مجلد ... ... پانچ روپے پچاس پیسے

تاریخ اشاعت ... ... رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ
فروری ۱۹۶۲ء

فہرست

اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اوصاف کا موصوف ذاتی پر اختتام ـــــ حضور انور کیلئے نبوت حادث ہے۔

خط مرقوم ۲۲ ستمبر ۵۳ء از ۵۰ تا ۶۵

انکارِ حدیث کے فتنے کو پرویزی فتنہ کہنے کی علمی توجیہہ ـــــ نبی صاحبِ کتاب کو نہیں بلکہ صاحبِ وحی کو کہتے ہیں ـــــ آغازِ بخاری میں آیتِ وحی لانے کی وجہ مصادر و مظاہرِ عمل سے وحی کا تعلق ـــــ نبی شناسی کا اخلاقی اور نوعی پیمانہ ـــــ

خط مرقوم ۲۹ ستمبر ۵۳ء از ۶۶ تا ۷۸

سالارِ نبوت کی زندگی کا نام اسلام ہے ـــــ صرف ارشاد قولی بگڑی ہوئی قوموں کیلئے اکسیر نہیں ہے ۔ نبوت کا دو ٹوک فیصلہ ـــــ دعوت کا کام اوپر سے نیچے شروع ہوتا ہے ـــــ رسالتِ محمدیہ اجتماعی بعثت کی حامل ہے۔

خط مرقوم ۳ اکتوبر ۵۳ء از ۷۹ تا ۱۰۲

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا دوسرا نام اسلام ہے ـــــ مسلمان زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کا قیدی ہے ۔ آزادی کا اسلامی مفہوم ـــــ تختِ حکومت سے اسلامی زندگی کا مطالبہ۔

خط مرقوم مورخہ ۱۰ اکتوبر ۵۳ء از ۱۰۳ تا ۱۱۰

عقل خود پرستی اور ایمان خدا پرستی کا نام ہے ـــــ مقام رسالت کے بارے میں ایمان کی تین شرطیں ـــــ اتباع اور اطاعت میں بنیادی فرق ـــــ قانون سازی میں خلافتِ راشدہ کا مقام نبوت سے نیچے اور اجتہاد سے اوپر ہے

خط مرقوم مورخہ ۱۲ اکتوبر ۵۳ء از ۱۱۱ تا ۱۲۴

موضوع تراویح پر روایت ابن عباس کی تحقیق ـــــ روایت کے مخارج ـــــ حدیث کے ضعیف ہونے کی وجہ ـــــ ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان کا چہرہ، تہذیب کے راویوں کی ثقاہت، امام شعبہ کی تکذیب کی کہانی۔

خط مرقوم مورخہ ۱۴ اکتوبر ۵۳ء از ۱۲۵ تا ۱۳۹

اللہ کی صفت اور اس کی قسمیں ـــــ مسلک تاویل یا تفویض ـــــ کلام کی اور علم کلام کی بیچارگی ـــــ معتقدات میں اطمینان کی راہ کلام نہیں بلکہ قرآن ہے ـــــ امام غزالی کا اعتراف قرآن میں غیبی حقائق کے ماننے کا مطالبہ نہ کر جانے کا۔

خط مرقوم مورخہ ۲۲ اکتوبر ۵۳ء از ۱۴۰ تا ۱۵۵

حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے نزدیک معاش کی حقیقت ـــــ اس کے عناصر ـــــ غربت میں انسان کا مقام

منظر — یہاں منٹ۔ پل اور گھڑی بڑی قیمتی ہے —

خط مرقوم مورخہ ۴ دسمبر ۵۳ء از ۱۹۳ تا ۱۹۵

کچھ اپنا حال — روزانہ کا لائحہ عمل — جیل کی زندگی کے چوبیس گھنٹے — دن بھر کے مشاغل اور روزمرہ کا پروگرام۔

خط مرقوم مورخہ ۷ دسمبر ۵۳ء از ۱۹۶ تا ۱۹۹

۱۹۵۳ء کا خونیں ڈرامہ — اللہ کی شانِ قدیری اور اس کی شانِ حکیمی کی توضیح اور ان میں باہمی فرق۔ ما بقوم اور ما بانفسھم کی تشریح — اسلامی قومیت کا فیصلہ وقت کا اہم تقاضا ہے۔

خط مرقوم مورخہ ۱۰ دسمبر ۵۳ء از ۲۰۰ تا ۲۰۳

وساوس دور کرنے کی پانچ تدبیریں — اصلاحِ نفس کے دو طریقے طریق نبوت اور طریق ولایت اور دونوں میں فرق — حواس کی اور مشاعر کی طرح لطائف بھی پانچ ہیں۔

خط مرقوم مورخہ ۱۵ دسمبر ۵۳ء از ۲۰۴ تا ۲۰۷

انسان ایک عالم صغیر ہے — روح سے اخلاق کا تعلق — حواس اور مشاعر کی طرح لطائف پنجگانہ بھی اگر کام نہ کریں تو انسان حیوانیت سے بھی گرجاتا ہے۔

خط مرقوم مورخہ ۱۸ دسمبر ۵۳ء از ۲۰۸

توحید بطور مقام حاصل کرنے کا نسخہ اور اس کی ترکیب استعمال۔

خط مرقوم مورخہ ۲۳ دسمبر ۵۳ء از ۲۰۹ تا ۲۱۲

خلوت کی لذتیں اور پرکیف نفع اندوزیاں — اللہ کی یاد وہ نعمت ہے۔ کہ اس سے آگے کسی نعمت کا تصور بھی نہیں — خواب میں بشارت — جرم کا کھلے بندوں اقرار —

خط مرقوم مورخہ ۲۷ دسمبر ۵۳ء از ۲۱۳ تا ۲۱۹

حکیم الامت شاہ ولی اللہ کی ذات صرف علمی نہیں بلکہ استدلالی شخصیت ہے۔ شاہ صاحب کے سینہ تجدید سے ابلی ہوئی ہدایت، علم الٰہی اور ربانی ہے — فکر و عمل کی دو قوتیں [illegible] افراط و تفریط —

نگاہِ اوّلین

۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختم نبوت میں مجھے تواصی بالحق کے نتیجے میں قید و بند سے دو چار ہونا پڑا۔ میں جیل میں چوبیس گھنٹوں کی مشغولیت کا پروگرام بنا کر زندگی گذارنے کا خوگر ہوں۔ ان مصروفیتوں میں فرصت کے جو لمحات مل جاتے۔ ان کو میں اس طرح گذارتا یا یوں سمجھئے کہ جیل سے باہر کی زندگی میں فکر و مطالعہ کی لگی ہوئی چاٹ اس طرح پوری کرتا کہ کسی نہ کسی دوست سے زبانِ دہن سے نہیں بلکہ زبانِ قلم سے باتیں کرتا۔ بس زبانِ قلم سے کی ہوئی مختلف وقتوں میں باتوں کا نام نقوشِ زنداں ہے — ان خطوط کا نہ کوئی پس منظر ہے اور نہ کوئی ایک خاص موضوع ہے بلکہ یہ مختلف وقتوں اور مختلف عنوانوں پر منتشر خیالات ہیں۔

رہائی کے بعد میرے عزیز شاگرد مولانا حافظ امیر علی نے ان منتشر اوراق کو یکجا کیا۔ یکجا ہو جانے کے بعد کچھ احباب نے ان کی اشاعت کے لئے اصرار کیا۔ بالآخر مولانا حافظ محمد شریف قاسمی مالک مکتبہ قاسمیہ نے ان کی اشاعت کے لئے کمر ہمت باندھی۔ اور ہمت بھی اس طرح کہ پہلے ان کو مرتب شکل میں صاف ستھرا کتابی صورت میں لکھا۔

میرا کام صرف اس قدر ہے کہ ہر خط کی پیشانی پر خلاصہ میرا لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ساری محنت کا سہرا میرے ان دو عزیزوں کے سر ہے۔ اختصار یا تطویل کسی خاص تاثر کے پیش نظر نہیں بلکہ یہ وقت کی موافقت

اور طبیعت کے نشاط کی وجہ سے ہے ـــــ ان میں توحید، رسالت، مقام نبوت، انکار حدیث۔ مسئلہ ارتداد، ختم نبوت اور دوسرے کلامی، فقہی، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مسائل پر تبصرہ کے ضمن میں مختلف آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی تشریح کی گئی ہے اور بتایا ہے کہ ہم اس مقصد کو بھول گئے جس کے لئے اللہ نے بے شمار قوموں کی موجودگی میں ہمیں منتخب کیا تھا۔ ہمیں نبوت سے جو مقصد ملا تھا۔ کہ لوگوں کو انسانوں کی خدائی سے نکال کر خدائے واحد کا پرستار بنائیں۔ اسے فراموش کر دیا۔ لوگ اللہ کی شریعت کی جگہ اپنے من گھڑت قوانین نافذ کرنے لگے۔ ہم اسلامی اور نبوی قید و بند سے آزاد ہو کر ایک طرح کی اباحی زندگی کے خوگر ہو گئے۔ گویا نہ نبی کی امت ہیں۔ اور نہ وحی و رسالت پر ایمان ہے۔ نہ حساب کا ڈر ہے اور نہ آخرت کا خوف ہے۔ ہم تمدن و اجتماع، سیاست۔ اخلاق اور معاشرت میں ان قوموں کی کاپی کرنے لگے جن کی وجہ سے اللہ ان سے ناراض ہوا تھا۔ اور ان پر اپنا غضب نازل کیا تھا۔ فیا للاسف ویا للعار۔

ہمارے پیش نظر کوئی صحیح اور اعلیٰ مقصد نہیں رہا۔ ہماری تگ و دو اور جد و جہد کھانے پینے اور عیش و عشرت تک محدود ہو گئی۔ دُنیا کی قوموں میں ہماری کوئی خصوصیت اور امتیاز باقی نہیں رہا۔ ہم اپنے ہم جنسوں کی طرح ہی انسانوں کا ایک گلہ ہو کر رہ گئے۔

ہمارے بادشاہ اور سلاطین اپنی زندگی کے ایک گوشہ میں دنیا کے جبابرہ سے بھی بازی لے گئے۔ اور فراعنہ و نماردہ کی طرح دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے سے ہٹ کر کلمۃ الکفر کی بلندی میں مصروف ہو گئے۔

ہمارے دولت مندوں میں تکبر پیدا ہو گیا۔ ہمارے سردار اور اکابر قوم فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے۔ یہاں تک کہ ہمارے فساق و فجار بغض و حسد، جاہ طلبی، دنیا پرستی، عیش پسندی۔ آخرت سے غفلت، خونریزی، بے حیائی، حق تلفی، بدعہدی، بے وفائی، حدود اللہ سے تجاوز، ظلم و بے انصافی، اسراف و تبذیر اور فواحش و منکرات میں آج اپنی مثال آپ ہیں۔ فانا للہ و الی اللہ المشتکیٰ۔

اس کا نتیجہ ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر ہم پیچھے دھکیلے جا رہے ہیں اور ہر قدم پر ہمیں ناکامیوں سے ہمدوش ہونا پڑتا ہے۔

آج بھی ہم ناکام نہیں اگر ہم اپنی اندرونی اور بیرونی قوتوں کی اصلاح کر لیں ـــ یعنی ہمارا قلب ایمان سے معمور ہو جائے۔ اور روح دینی تعلیمات اور اسلامی اخلاق کے ذریعے پاکیزہ ہو جائے۔ سینہ میں دینی حمیت جوش مارنے لگے اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ پوری دنیا میں آگ لگ رہی ہے۔ اور اسے بجھانے کے لئے پانی مسلمان کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے۔ اس کے لئے دوڑ دھوپ، محنت اور جد و جہد کو ہم اپنا نصب العین بنا لیں۔ اس راہ میں اپنی لذتیں، اپنی مسرتیں، اپنا خواب و خور بھول جائیں تو ہم آج بھی قضاء الٰہی اور حکم ربانی بن کر سب پہ غالب آ سکتے ہیں۔ قرآن، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام کی سیرت آج بھی موجود ہیں۔ ہمیشہ یہی مسلمانوں کے لئے قوت اور زندگی کا منبع، جوش ایمان کا مخزن رہی ہیں مسلمانوں نے ہمیشہ ان سے زندگی اور طاقت حاصل کی ہے۔ آج بھی اگر ہم ان پر خاص توجہ کریں۔ ان کی اشاعت میں خاص حصہ لیں۔ خود پڑھیں اور اپنے بچوں کو

پڑھائیں تو ہم عزت اور قوت کے مالک ہو سکتے ہیں ۔ ان سے ہٹ کر کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی ہے ۔

۱۹۵۳ء میں لکھی ہوئی یہ دستاویز اب احباب کی کوششوں سے ۱۹۶۲ء میں شرمندۂ طباعت ہو رہی ہے ۔ اللہ کرے کہ میری یہ آہیں کسی کی اصلاح حال کا سامان ہو کر میرے لئے رضاء مولیٰ اور نجات آخرت کا ذریعہ ہو جائیں ۔ وما ذالك على الله بعزيز ۔

محمد علیؒ الصدیقی
کان اللہ لہٗ

۱۹ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۵ فروری ۱۹۶۲ء

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

یکم ستمبر ۱۹۵۳ء

زندگی کی ساری بدحالیوں کا بنیادی سبب، معاصی اور مصائب کے اندر مبتلا ہونے میں جوہری فرق اور دونوں کے نتائج، مشقتیں اور تکلیفیں راہ محبوب میں ترقیٔ مدارج کا سامان ہیں۔ مومن کو گھبراہٹ مصائب سے نہیں بلکہ معاصی سے ہوتی ہے۔

السلام علیکم   جیتی بی اللہ و نفعنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ

مصائب بھی اللہ جل شانہٗ کا بہت بڑا انعام ہیں۔ شیخ جیلانی رح نے فتوح الغیب میں لکھا ہے کُلُّ بَلَاءٍ نِعْمَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ ۔ اور کیوں نہ ہو وفائے محبوب سے جفائے محبوب زیادہ قیمتی ہوتی ہے بشرطیکہ صاحبِ بلا دانائے رازِ در صاحب حال ہو۔ اگر صاحب حال نہ ہو تو خوش حالیوں میں منوعیت اور بدحالیوں میں جزوعیت نمایاں ہوتی ہے۔ اللہ پناہ دے۔ ان دونوں سے مل کر جو حالت و کیفیت رونما ہوتی ہے اس کا نام ہلوعیت ہے یعنی انسانی نفسیات کی وہ کیفیت جسے ہم لالچی اور بے صبراپن کہتے ہیں

اذا مسّہ الشر جزوعًا و   بدحالی میں گھبرانے والا اور خوش حالی
اذا مسہ الخیر منوعًا۔   میں اچھائی کے راستہ میں روک بن
                    جانے والا۔

میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ کبھی سنا یا پڑھا تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ رحہ ایک مجلس
میں بلاؤں کے انعام الٰہی ہونے پر کچھ فرما رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور بیماری کے
لئے دعا کی درخواست کی۔ حاضرین حیران تھے کہ دیکھئے اب اس نعمت کے بارے
میں کیا فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں ہاتھ اٹھائے اور فرمایا۔ الٰہا! بیماری بھی ہم پر تیرا
انعام ہے لیکن اس انعام کے تحمل کی ہم میں طاقت نہیں تو اس نعمت کو صحت کی نعمت سے
مبدل فرما دے۔

یہی وہ انعام ہے جس سے مدارج میں ترقی ہوتی ہے۔ مقامات طے ہوتے ہیں
قرب الٰہی زیادہ سے زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ مگر بے حال اسے قدر کی نگاہ سے کب دیکھتے
ہیں۔ وہ تو دنیا کی اس ٹیپ ٹاپ کو ہی مقصود بنا لیتے ہیں۔ آخرت سے آنکھیں
اندھی ہوتی ہیں ایسی اندھی کہ وہاں کا کروڑ بھی یہاں کی رتی کے مقابلے میں نظر
نہیں آتا۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ ۔

دنیوی زندگی کی ٹیپ ٹاپ کو جانتے ہیں اور آخرت کی زندگی سے غافل ہیں۔

آہ آج ہماری ساری بدحالیوں کی داستان اسی ایک نقطہ میں سمٹی ہوئی ہے
کہ صحابہ کرام کے برعکس ہماری دن رات کی تگ و دو ہمارے سفر، ہماری تجارت
ہماری سیاست، اور ہماری تعلیم آخرت سے الگ ہو کر دنیا اور صرف دنیا کی ہو
کر رہ گئی ہے۔ روحِ ایمان میں ناسور پھوٹ آیا زندگی کے کسی گوشے میں بھی اس
زندگی کے اعمال کے محاسبے اور جزا کا تصور نہیں اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے کردار و
گفتار میں تباین ہے اور ہر فعل ہر ادا اور ہر حرکت اخلاص کی دولت سے محروم ہے
فانا للہ والی اللہ المشتکیٰ

غالباً ازالۃ الخفاء میں حضرت فاروق اعظمؓ کا یہ ارشاد گرامی پڑھا تھا کہ جب بھی کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہوں تو اپنے اندر چار حمتوں کا احساس پاتا ہوں۔ اول یہ کہ اس سے میرے دین کو صدمہ نہیں پہنچا۔ دوسری یہ کہ اس مصیبت سے بڑی مصیبت سے دوچار نہیں ہوا تیسری یہ کہ اس کی وجہ سے میں رضائے حق سے محروم نہیں ہوں۔ چوتھی یہ کہ اس پر اللہ پاک سے اجر کا امیدوار ہوں۔

دراصل گھبرانے کی چیز مصائب نہیں معاصی ہیں۔ ایمان کی روح اس سے بے چین ہوتی ہے معاصی کے ابتلاء سے اور سکون آتا ہے راہ محبوب میں رضائے محبوب کی خاطر تکلیفیں اٹھانے سے۔ اور یہ سکون ترقی کر کے اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اس میں لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور یہ لذت ہی ہے کہ مضطرب و بے چین لبوں پر یہ تمنا آجاتی ہے۔

وَدِدتُّ ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیٰ ثم اقتل۔ — مجھے پسند ہے یہ بات کہ راہ مولیٰ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مجھ پر اللہ جل شانہ کا بڑا انعام ہے پہلی بار بھی اور اس بار بھی بڑی ترقی ہے اور بہت سیر و سیاحت ہے روح لذت کی جن سرشاریوں سے دوچار ہے اس کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں۔ میں قربان جاؤں ذات قدوس جل جلالہ کے کہ مجھ پر کیسی مہربانی کی اور اپنے قریب کرنے کے لئے غیب سے کیسی امداد فرمائی۔ فللّٰہِ الحمد وللہ الشکر۔

پہلی بار تین ماہ میں اپنی کم مائگی کی وجہ سے جو چیز ہاتھ نہ آئی تھی وہی الحمدللہ اب قریب سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس دفعہ عرصہ چھ ماہ کا ہے۔

یقین کامل ہے کہ بے پایاں عنایات ہوں گی۔ رحمتیں ہوں گی اللہ علی شانہٗ

اپنی لگن اور دل کی وادیوں میں اپنی محبت کا سوز عطا فرمائے یہی باقی ہے اور اس کے سوا سب فانی ہے۔ زاد آخرت بننے کی اسی میں صلاحیت ہے ؎

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ

بنام حضرت مولانا محمد حسین صاحب فاضل دیوبند خطیب جامع چاہ جٹاں سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ
مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۵۳ء

اللہ پاک کی یاد میں بہتات اور دوام، آیت قرآنی وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا میں یادالٰہی کے سودمند ہونے کے لئے مبالغہ اور تدریج کی شرطیں تبتّل کی انواع اور ان کا اصطلاحی نام، دعوت اور دعویٰ میں فرق، غرور تقویٰ سب سے خوفناک مرض ہے، دعوت کے فرائض واجبات اور مستحبات، انسان صرف حیوان ناطق نہیں بلکہ ایک ذمہ دار اخلاقی وجود ہے، قرآن نے امت کو نیکی کی دعوت سے نہیں دعویٰ سے منع کیا ہے۔

عزیزم! سلمکم اللہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آج تم یاد آئے زندگی کے سانس الحمدللہ نہ صرف بہتر بلکہ بہترین گذر رہے ہیں۔ اتنے بہترین جو بہتوں کے لئے شاید سامانِ رشک ہوں ایسا رشک کہ تمنائیں کریں اور گڑگڑاکر یہاں پہنچنے کی دعائیں کریں۔ ہر روز اللہ جل شانہٗ سے قرب ہو رہا ہے زبان ہر آن ذکر اللہ سے مرطوب رہتی ہے الحمدللہ۔

یقین مانو یہ نعمت عظمیٰ باہر نصیب نہ تھی اور ایک عرصہ سے باوجود کوشش کے ہاتھ نہ آتی تھی اللہ جل شانہٗ کی عنایت سے یہاں اس راہ کی ساری مشکلیں حل ہو رہی ہیں۔ خدا سے دُعا کرو کہ ذکر اسم رب کے مطالبے کی بجاآئی میں دو باتیں نصیب ہوں۔ بہتات اور دوام۔ قرآن کے اشارات سے یہی ٹپکتا ہے سورۂ مزمل میں تم نے یہ آیت بارہا پڑھی گی۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا

یاد کر اپنے رب کے نام کو اور کٹ جا اس کی طرف کٹ جانا

اسم رب کے ساتھ تبتّل کی جو قید لگائی گئی ہے۔ وہ بڑی ہی معنے خیز ہے پھر تبتّل کے ساتھ تبتیل کی قید اس سے زیادہ اور پھر فعل اور مصدر کا وزنی اختلاف خلاف قیاس بہت زیادہ گہری معنویت رکھتا ہے شائد مدارج میں اسلام کے مشہور محقق حافظ ابن القیم نے اس اختلاف کی طرف ایک چلتا سا اشارہ کیا ہے یاد پڑتا ہے لکھا ہے کہ تبتّل تفعّل ہے۔ اس کا خاصہ مبالغہ ہے۔ اور تبتیل تفعیل ہے۔ اس کا خاصہ تدریج ہے۔ آیت کا حاصل یہ ہے کہ ذکر اسم رب بہتات کے ساتھ دیر تک اور لگاتار ہو تو مفید و مطلوب ہے تبتیل یعنی انقطاع ایک جنس ہے اس میں ساری انواع داخل ہیں۔ یعنی تبتیل عن الہواجس۔ تبتّل عن الخواطر۔ تبتّل عن اللذائذ۔ اور یہی انواع ہیں۔ جنہیں اصطلاحی زبان میں تقلیل طعام۔ تقلیل کلام، تقلیل منام اور تقلیل اختلاط مع الانام کہتے ہیں۔ ان چار میں بہتات ہو اور عرصہ دراز تک ہو تو ذکر اسم ذات رنگ پیدا کرتا ہے۔ اسی رنگ کے پیدا ہونے کے بعد تسلیم و توکل کی صفات ظاہر ہوتی ہیں۔ شاید رب المشرق و المغرب لا اله الا ھو فاتخذہ وکیلاً کے مفہوم میں اسی طرف اشارہ ہے۔ مفہوم کی قید اس لئے لگا رہا ہوں۔ کہ یہ آیت کا مدلول اور منطوق نہیں ہے۔

بہر حال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ذکر اللہ دوام اور بہتات کے ساتھ عجیب نعمت ہے یہ راہ خود بہت ہی عجیب ہے۔ مگر راہ نوردی میں رہبر کامل کے بغیر بہت ہی مشکلات ہیں۔

اچھا اب رخصت ہوتا ہوں تقریباً پونے دس بجے ہیں کھانا کھا چکا

ہوں پر بھنی ہوئی دال ماش کھائی ہے۔ مولوی حبیب احمد نے پکائی تھی کچھ کسر تھی مولوی صاحب داد چاہتے تھے۔ مگر افسوس کہ میں تصنع نہ کر سکا اگرچہ میری صاف گوئی ان کی کچھ دل شکنی کا باعث ہوئی۔ اے کاش وہ نہ پوچھتے اور نہ میں کسر کو ظاہر کرتا اللہ مجھے معاف کرے۔

آج رات بھی کچھ بدمزہ گذری تہجد کو آنکھ نہ کھلی۔ ایک خواب بھی بارہ بجے دیکھا کہ کسی جگہ پانی میں ہوں ایک سرکش گھوڑا اپنے مالک سے بگڑا اور سرپٹ پانی کی طرف آیا مجھے دیکھ کر مجھ پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ خود اس کے مالک ہی نے شور مچایا میں چپ رہا۔ مالک نے گھوڑے کو مار کر میری طرف سے ہٹا دیا۔ الحمد للہ بیدار ہوا تو لا الہ الا اللہ رب العرش الکریم پڑھا۔ مولوی حبیب احمد جو بیدار ہوئے ان کو خواب سنایا انہوں نے بھی بے ساختہ الحمد للہ کہا۔

بدمزگی کی کہانی بھی سن لو۔ میں نے لیٹے لیٹے اپنے ایک رفیق سے کہا ہم تین ہیں۔ اور تینوں مزاج کے اعتبار سے مختلف ہیں مولوی حبیب احمد کی طبیعت میں تازگی اور اس تازگی کا ظہور ان کی حسن پسند طبیعت سے ہوتا رہتا ہے۔ غلام محمد صاحب! آزاد منش آدمی ہیں رات کو لیٹے لیٹے ان سے کہا کہ اب باہر جاکر کسی برائی میں حصہ نہ لینا بات طول کھینچ گئی اور بدمزگی ہو گئی۔ توبہ و استغفار کی، پچھتایا کہ بات کا آغاز کیوں کیا تھا قصور اپنا تھا بات کہنے کا انداز غلط، داعیانہ اور حکیمانہ نہیں بلکہ اندازہ حاکمانہ تھا۔ کوفت ہوئی اور نیند اڑ گئی پھر آنکھ لگی پھر کھلی۔ اسی کشمکش میں تہجد سے محروم ہو گیا۔ یہ ساری آفت اپنے متعلق ایک بڑی غلط فہمی سے ہوئی اپنے کو عالم سمجھا بلکہ نفس کے

چھپے چور نے اپنے تئیں تقویٰ کی اتراہٹ دیکھی۔ طاعت اور بندگی کا سب سے خوفناک مرض غرور تقویٰ ہے۔

بہت بڑی انسانی زندگی آج گناہوں کا شکار صرف اس لئے ہے کہ ارباب علم کا انداز سخن غلط ہو گیا دعوت کا نہیں بلکہ دعویٰ کا ہو گیا اللہ ہم پر رحم کرے۔ کتنے ہی دل ہیں جو صرف ہماری اس غلط روش کی وجہ سے محروم ہدایت ہیں۔ جب بھی داعی مدعی کے مقام سے بولتا ہے۔ دعوت کی روح سر پیٹ کر بیٹھ جاتی ہے اور بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ نہیں بلکہ غلط نتائج پیدا کرتی ہے۔ ہدایت کی جگہ ضلالت، سعادت کی جگہ شقاوت ابھر آتی ہے۔

شاید شیخ زادہ نے امر بالمعروف کے فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات شرح شرعۃ الاسلام میں قلم بند کئے ہیں۔ بڑی کٹھن منزل ہے۔ لوگوں کو دعوت کی ضرورت کے ساتھ اس کی نزاکت کا احساس نہیں ہے۔ حالانکہ اصلی کامیابی کا راز اسی میں ہے۔

افسوس ہے کہ لوگ اپنے کو دعوت کے مقام سے بچانے کے لئے عموماً قرآن کی یہ آیت تلاوت کر دیتے ہیں۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ

حالانکہ اس آیت میں دعوت سے نہیں بلکہ دعویٰ سے منع کیا گیا ہے۔ دعوت یہ کہ تم کسی سے نماز پڑھنے کی درخواست کرو اور دعویٰ یہ کہ تم نماز نہیں پڑھتے ہو اور کہتے ہو کہ نمازی ہوں۔ قرآن کو دعویٰ پسند نہیں ہے۔ قرآن نے شعراء کے معائب میں سب سے بڑا عیب یہی بتایا ہے کہ

اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ

ورنہ جہاں تک دعوت کا تعلق ہے۔ یہ تو قرآن کا قائم کردہ وہ فریضہ ہے۔ جس کا امت سے مطالبہ ہے۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ

امام رازی فرماتے ہیں کہ مِنْ بیانیہ ہے۔ اور ترجمہ یوں ہے۔ چاہیئے کہ ہو یعنی تم ایک ایسی امت جو لوگوں کو نیکی کی دعوت دے۔ اس خیال کی بھی کوئی قیمت نہیں کہ نیکی کی دعوت کے لئے پہلے نیک ہونا ضروری ہے نیکی کی دعوت دینا خود مستقل فریضہ ہے۔ اور نیک ہونا الگ چیز ہے۔

یاد پڑتا ہے کہ ملّا علی قاری محدث نے شرح بدء الامالی میں لکھا ہے کہ نیکی نہ کرنا ایک گناہ اور نیکی کی دعوت نہ دینا دوسرا گناہ ہے۔ چونکہ ایک گناہ کر رہے ہیں اس لئے ضرور دوسرا گناہ بھی کریں گے۔ یہ کوئی عقل کی بات نہیں ہے پوری تفصیلات چاہتے ہو تو احیاء العلوم، مجالس الابرار اور شرح شرعتہ الاسلام کا مطالعہ کرو۔

تلاوتِ قرآن طولِ قراءت کے ساتھ، نماز اور لا الٰہ الا اللہ کی پابندی کرو کہ اُس عالم میں کام آنے والی چیز یہی ہیں۔

عزیز! یہ جہانِ فانی ہے یہاں کی ہر چیز مٹ جانے والی ہے۔ آخرت ہی توجہ کی چیز ہے اسی کا یقین انسان کو اس زندگی میں ایک ذمہ دار اخلاقی وجود بناتا ہے اس تصور سے الگ ہو کر انسان مناطقہ کے حیوان ناطق کے سوا کچھ نہیں۔ بے قیدی اور اباحت مطلقہ اس کے اثرات ہیں۔ اور بس۔ سلجھانے کی گتھی دنیا نہیں آخرت اور صرف آخرت ہے دنیا دارِ فنا ہے یہاں آنا رہنے کے لئے صرف چند روزہ ہے اور اصلی گھر آخرت بنانے کے لئے ہے۔

میرے عزیز! یہاں سے لگی ہوئی بھوک کا مداوا روٹی سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ روٹی بھیک سے بھی مل سکتی ہے اور یہاں پیٹ پتوں سے بھی بھر سکتا ہے۔ آہ بندوبست تو اس بھوک کا ہونا چاہیئے جس کا مداوا کوئی نہیں اور جہاں کوئی غذا بھوک کو دور نہ کر سکے گی۔

لَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ

الغرض

لَا عیش الاّ عیش الآخرۃ

دھیان کی چیز آخرت ہے۔ اور اس کے لئے یہاں ایمان کے ساتھ عمل صالح کی ضرورت ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی کو بھی معمولی نہ سمجھو۔ بلکہ خدا کا شکر کرو کہ اس نے کرنے کی توفیق دی چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو معمولی نہ سمجھو بلکہ توبہ کرو اور استغفار پڑھو۔

والسلام علیکم و رحمت اللہ و برکاتہ،

بنام:۔ مولوی حافظ محمد شریف قاسمی مدرس دارالعلوم الشہابیہ و مالک مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ
مورخہ ۱۰ستمبر ۵۳ء

قرآن کی بیان کردہ وحی کی دو قسمیں، اتباع وحی اور تلاوت وحی میں فرق، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کا اجتہاد و استنباط اور اس بارے میں قرآن کی ہدایت، قرآن کی زبان میں وحی سے دو چیزیں مراد ہیں ایک ماارک اللہ اور دوسری ماانزل اللہ حدیث ابوسعید خدریؓ کا صحیح موقف، حدیث کی حضور انور کی جانب سے اجازت۔

صدیقی شوکت صاحب

حیرت ہے کہ اس قدر جلدی کیوں مرعوب ہو جاتے ہو بات سنو سننے کے بعد دلیل کی ترازو میں تولو اور سوچو کہ کیا کہا گیا ہے۔ کیوں کہا گیا ہے۔ صرف اتنی سی بات سے پریشان ہو گئے ہو کہ

"قرآن حکیم سے باہر وحی کوئی نہیں قرآن سے باہر وحی ہونے کی قرآن میں کوئی سند نہیں۔ قرآن میں واضح طور پر موجود ہے کہ وحی وہی ہے جو قرآن میں اور جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔"

میں تو سمجھتا تھا کہ تم قرآن کا سمجھ کر مطالعہ کرتے ہوگے مگر مجھے بہت گہرے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تمہارے تاثرات دیکھ کر میری امیدوں پر اوس پڑ گئی میں محسوس کرتا ہوں کہ ایک دفعہ خود قرآن کی مدد سے اصل بات تک تمہاری رسائی ہونی چاہیئے۔

اتنی بات تو تم جانتے ہو کہ قرآن حکیم نے خود وحی کے بارے میں جس چیز پر جگہ جگہ زور دیا ہے وہ صرف دو باتیں ہیں ایک وحی کا اتباع

دوم وحی کی تلاوت۔

قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر اتباع وحی کا جس انداز سے مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس پر غور کرو۔ سورہ انعام پارہ ۷ میں ہے۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ

توچل اس چیز پر جو وحی کی گئی ہے۔ تیری طرف تیرے پروردگار کی جانب سے۔

سورہ یونس کی آخری آیت ہے۔

اِتَّبِعْ مَا یُوْحٰٓی اِلَیْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰی یَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ۔

توچل اس چیز پر جو وحی کی گئی ہے تیری طرف اور صبر کر یہاں تک کہ فیصلہ کردے اللہ اور وہ بہترین فیصل ہے۔

کچھ آیات وہ ہیں جن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا موقف بیان کیا ہے

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ۔ (سورہ انعام)

میں صرف اس چیز کا پیروکار ہوں جس کی میری طرف وحی آتی ہے

سورہ یونس میں ہے۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔

میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کا نافرمان ہوں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات میں جہاں کہیں وحی کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ بلا قید حکم دیا ہے کسی بھی قسم کی کوئی قید نہیں لگائی نہ زمان کی اور نہ مکان کی اور نہ کوائف کی۔

اور ایسے موقعہ پر جب نبوت کا ذکر آیا ہے۔ تو مَا اُوْحِیَ اِلَیْكَ کی جگہ خود ذات نبوت کو رکھا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ	کہدو! اگر تم اللہ سے محبت کرتے
فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ	ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے پیار کریگا
یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ	اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔

اِتَّبِعُوْنِیْ میں یائے متکلم کا مصداق خود ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہے۔ اور اس کے ذریعے قرآن نے امت سے آپ کی اتباع مطلق کا مطالبہ کیا ہے یعنی یہ فرمایا ہے کہ ذات نبی کی اتباع کرو لیکن یہ نہیں فرمایا کہ زندگی کے کس گوشے میں کرو۔ خود ذات نبی کو مَا اوحی الیك کی جگہ لانا بتا رہا ہے کہ نبی کی ذات کی اخلاق، افعال اور اعمال میں پیروی ما اوحی کی پیروی ہے۔ خیر یہ مبحث ذرا تفصیل طلب ہے کہنا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن نے جہاں بھی وحی کیلئے اتباع کو بتایا ہے، یا ذات نبوت کے اتباع وحی کو جتایا ہے بلا قید اور بلا وصف ہی بتایا ہے قرآن کے اوراق تمہارے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ کوئی لکی ڈھکی بات نہیں دیکھ لو جہاں بھی وحی کی اتباع کا ذکر ہوگا بے قید ہوگا۔ لیکن اس کے برعکس قرآن ہی میں ما اوحی کی تلاوت کا جہاں بھی ذکر آیا ہے۔ وہاں الکتاب کی ضروری قید کا اضافہ کیا گیا ہے۔

سورہ کہف میں ہے۔

وَاتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْكَ	اور تلاوت کر جو کچھ وحی کی
مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا	گئی ہے تیرے رب کی کتاب سے
مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهٖ وَ	نہیں ہے کوئی بدلنے والا اس
لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ	کی باتوں کو۔
مُلْتَحَدًا۔	

اکیسویں پارے کا آغاز بھی یہی ہے۔

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتَابِ۔	تلاوت کر اس چیز کی جو وحی کی گئی تیری طرف کتاب سے۔

ان آیات کو پڑھئے اور بار بار پڑھئے کسی بھی ترجمہ کی مدد سے ان میں ما اوحی الیك کے ساتھ من الکتاب کے زور کو دیکھئے۔ قرآن میں جہاں بھی تلاوت کا ذکر ہے۔ وہاں کتاب کا بھی تذکرہ ہے صرف وحی کے ذکر میں تلاوت کہیں بھی مذکور نہیں ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ میں ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ	جن کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ تلاوت کرتے ہیں کتاب کی جیسا کہ تلاوت کا حق ہے

سورہ فاطر میں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ۔	بلاشبہ وہ لوگ جو کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں اور انہوں نے نماز قائم کی۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اتباع کے مطالبہ پر صرف ما اوحی کہنا اور تلاوت کے موقعہ پر کتاب کی ضروری قید کا اضافہ کرنا صاف بتا رہا ہے۔ کہ وحی کتاب ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ کتاب سے باہر بھی وحی ہے جس کی پیروی کی جانی چاہیئے۔ اس کی تائید سورہ نساء کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں فرائض نبوت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ۔	بیشک ہم نے نازل کی تیری طرف کتاب حق کیساتھ تاکہ تو فیصلہ کرے لوگوں کے درمیان اس چیز سے جو تجھ کو اللہ نے دکھائے

یقیناً اس آیت میں ما اراك اللہ الکتاب سے الگ چیز ہے اور یہ قرآن ہی سے پیش پاافتادہ مسائل کیلئے آپ کا اجتہاد اور استنباط ہے۔ حافظ ابن القیم نے

ما اراک اللہ (جو دکھلائے آپکو اللہ) کی تعبیر میں ایک لطیف نکتہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہاں بما رایت (جو دیکھیں آپ) اس لئے نہیں فرمایا کہ دین کے معاملے میں اطاعت خدا و رسول کی ہے۔ حتیٰ کہ رسول بھی یہاں اپنی ذاتی رائے نہیں رکھتا، یہاں رسول کا دیکھنا بھی خدا کے دکھانے کے تابع ہے۔ اسی کے مطابق آپ فیصلہ کرتے تھے اور جو کچھ فیصلہ فرماتے تھے اس کا ماننا ایمان کی ناگزیر شرط تھی۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ قرآن کی زبان میں وحی سے ما اراك اللہ اور ما انزل الیك دونوں مراد ہیں۔ اور قرآن میں اسی کے اتباع کا حکم ہے۔ لیکن تلاوت کا حکم صرف ما انزل الیك اور الکتاب ہی کیلئے ہے اور چونکہ الکتاب کی تلاوت میں تعبدی حیثیت غالب ہے اسی لئے اس کو تغلیباً "قرآن" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی پڑھنے کی چیز۔

یہیں سے اس حدیث کا مفہوم بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو سعید خدریؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور جس کے متعلق شور مچانے والے شور مچاتے رہتے ہیں کہ حدیث کے لکھنے اور جمع کرنے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

حدیث سن لیجئے!

عن ابی سعید الخدریؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ۔	حضور انورؐ نے فرمایا ہے کہ مجھ سے قرآن کے سوا نہ لکھو۔ اور جس نے قرآن کے سوا لکھا ہو وہ اسے مٹا دے۔
وحدثوا عنی ولا حرج ومن	مجھ سے حدیث روایت کرو اور یاد رکھو

کذب علیّ متعمدا فلیتبوّأ مقعدہ من النار۔ | جو شخص جانکر میرے خلاف جھوٹ اڑائے گا اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

اس حدیث میں جس چیز سے روکا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ تعبدی طور پر قرآن کے علاوہ پڑھنے کی کوئی چیز نہ لکھو۔

اصل میں لفظ غیر سے پہلے اس کا موصوف محذوف ہے اور خود قرآن میں بھی کئی مقامات پر ایسا ہی ہے۔ مثلاً مَن یتبع غیر سبیل المؤمنین اصل میں یوں تھا۔ من یتبع سبیلاً غیر سبیل المؤمنین

اسی طرح حدیث کی اصل عبارت یوں تھی۔ لاتکتبوا عنی قرآنا غیر القرآن یعنی مجھ سے قرآن کے علاوہ پڑھنے کی کوئی چیز نہ لکھو کیونکہ جس چیز کی تلاوت وقراءت تعبدی ہے وہ صرف الکتاب ہے آسمان کے نیچے اور کوئی کتاب نہیں ہے۔ جس میں تعبّد ہو ورنہ تلاوت سے الگ ہو کر صرف تحدیث کی تو خود اس حدیث میں حدّثوا عنی سے اجازت ہو رہی ہے اس لئے تحدیث کی یا کتابت کی ممانعت اس حدیث سے کھینچ تان کر نکالنا خود ارشاد نبوت کو منشاء نبوت کے خلاف استعمال کرنا ہے۔

الغرض مقصد یہ ہے کہ اتباع کے موقعہ پر صرف ما اوحی کہنا اور تلاوت میں ما اوحی کے ساتھ من الکتاب کا اضافہ کرنا اس بات کی صاف اور واضح دلیل ہے کہ ما اوحی الیک کی دو قسمیں ہیں۔ متلوّ۔ اور غیر متلوّ

جہاں تک اتباع کا تعلق ہے۔ اس میں متلوّ اور غیر متلوّ دونوں یکساں ہیں۔ کیونکہ قرآن نے بلا استثناء اتباع کا مطالبہ کیا ہے۔ اور جہاں تک تلاوت کا تعلق ہے وہ صرف متلوّ کی یکجائی ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

بنام جناب شوکت علی صاحب صدر فی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی محلہ دائی شہیداں سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

مورخہ ۱۱ ستمبر ۵۳ء

قرآن میں بیان کردہ علائق محبت اور ان سے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ، ہمارے یہاں دین دنیا کے تابع ہے۔ اور صحابہ میں دنیا دین کے تابع تھی۔ ہمارے دین اپنانے کی کیفیت، نماز چھوڑنے پر نبوت کی وعید، دینی زندگی کی الٹی ہوئی بساط اور اس کی تصویر، دنیا اور اس کی تمام دولت سامان عبادت ہے۔ حکومت مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ؛ خالص دیوانی قوانین میں تذکار قیامت، زبان قلم یا زبان دہن سے نکلے ہوئے الفاظ کا حکم۔

صدیقی قاضی صاحب　　　　السلام علیکم

نماز اشراق سے فارغ ہوا ہوں پونے چھ بجے ہیں۔ آسمان ابر آلود ہے رات ایک بجے بارش آئی بستر سے اٹھ کر اندر آگئے موسم بڑا ہی خوشگوار ہے۔ تم یاد آئے ہو اسی کی تلافی خط سے کر رہا ہوں تمہاری یاد کے ساتھ تمہاری باتیں بھی یاد آرہی ہیں۔ اس لئے نہیں کہ میرے لئے ان باتوں میں کوئی پیغام ہے بلکہ اس لئے کہ یہ تمہاری سادگی اور بھولے پن کی آئینہ دار ہیں۔

تم ہر چیز کو خالص دنیا دارانہ نقطہ نظر سے دیکھتے ہو دنیا داری خود غلط نہیں ہے صحابہ کرام بھی . . . . دنیا دار ہیں ان کے ساتھ بھی نفس کے تقاضے، شکم کی الجھنیں اور کام و دہن کی لذتوں کی تمنائیں تھیں مگر یہ سب دین کے تابع ہو کر تھیں جب اور جس جگہ دین ان کے مقابلے پہ آتا ان کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑتا۔ قرآن نے ان کو سمجھایا بھی یہی تھا۔ سورہ براءت میں محبت کے سارے علائق کی ایک فہرست دی ہے۔ اور ان علائق کی اپوزیشن

اللہ ورسول اور خدا کی راہ میں جان کھپانے کو قرار دیا ہے لو لگے ہاتھ یہ علائق سن لو۔ والدین، اولاد، بیوی، خاندان، دولت وسرمایہ، تجارت ودوکان، مکان، ان سے دل لگاؤ کا نام دنیا ہے۔ ایک دنیادار ان کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا ہے۔ مگر قرآن میں اب تک اللہ جل شانہ کی یہ صدائے غریب موجود ہے۔

اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ
فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ

مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کی خاطر جدوجہد کے مقابلے میں تمہیں یہ چیزیں پیاری ہیں۔ یعنی ان کی خاطر تم اللہ کا اللہ کے رسول کا کہا نہیں مانتے اور دین کے لئے قربانی نہیں کرتے تو پھر انتظار کرو۔

ایک دوسری جگہ پر یہ بتاتے ہوئے کہ انسان کو خواہشوں سے پیار ہے۔ اور یہی خواہشیں اسے بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ خواہشوں کی فہرست میں عورتوں، بچوں، دولت کے دلربا انبار، مویشی اور زراعت کو درج کرکے بتایا ہے کہ

ذالک متاع الحیوٰۃ الدنیا یہ دنیاوی زندگی کا سامان ہے۔

پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا ہے اور کہا ہے کہ آپ ان لوگوں کو بتادیجئے جن کے دامن خدا کی نافرمانی کے داغ سے آلودہ نہیں ہیں کہ اس متاع سے بہتر وہ متاع ہے جو اللہ جل شانہ کے پاس ہے اور یہ جنات تجری من تحتھا الانھار وازواج مطھرۃ ورضوان من اللہ ہے۔

ہم میں اور صحابہ کرام میں فرق ہے تو صرف یہ کہ یہاں دنیا مقصود ہے۔ اور دین تابع ہے ہم دین کو اور اسلام کو صرف اس حد تک اپنانے اور قبول کرتے ہیں۔ جس حد تک دنیا ہمیں اجازت دیتی ہے۔

آہ! اگر نماز جو دین کا سب سے بڑا ستون ہے۔ آج ہماری کمائی۔ ہماری تعلیم، ہماری ملازمت اور ہمارے کھیل میں رکاوٹ بنتی ہے تو اسے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مسلمان ہوتے ہوئے اسلام کے گھر سے کان پکڑ کر نکال دیا جاتا ہے اور نکال دینے کے بعد پیغمبر کی وہی امت جو کبھی پیغمبر کی زبان سے نماز چھوڑنے والوں کے بارے میں یہ روح گسیل پیغام سنتی تھی کہ

مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَر

شادیانے بجاتے ہیں اور اسلام زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہیں۔ اس پر بس نہیں بلکہ اس خدا کی نافرمانی اور خالص نافرمانی کو کلمہ پڑھا کر اسلام میں داخل کر لیا جاتا ہے۔

میرے عزیز! اسلام کے ساتھ یہ طرز عمل صرف زندگی کے ایک گوشے میں نہیں بلکہ پوری کی پوری زندگی میں ہے۔ دین کی پوری بساط الٹی ہوئی ہے۔ دنیا کی مقصودیت ہم پر اس درجہ غالب ہے کہ ہم اس کے خلاف کچھ سننا بھی گوارا نہیں کرتے حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ دنیا و مافیہا ہمارے لئے ہے اور یقیناً ہمارے لئے۔ لیکن ہم اس دنیا میں دنیا کے لئے نہیں بلکہ اللہ جل شانہ کے لئے ہیں۔ دنیا کی تخلیق کا مقصد ہماری منفعت ہے اور ہماری تخلیق کا مقصد صرف اللہ جل شانہ کی عبادت ہے اور یہ عبادت زندگی کے ایک گوشے میں نہیں بلکہ سارے گوشوں میں مقصود ہے۔

یاد پڑتا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند نے اپنے کسی مکتوب میں لکھا ہے کہ انسان عبادت کیلئے ہے اور دنیا انسان کیلئے اس لئے دنیا جب تک سامان عبادت بنی رہے اور انسانی زندگی کے مقصد تخلیق میں خادم کی حیثیت سے رہے اس وقت تک رحمت ہے۔ ورنہ یہ سراپا زحمت ہے۔

میرے عزیز! عقل بھی یہی کہتی ہے۔ روٹی پکانا مقصود ہوتا ہے۔ تو توا، چمٹا، چولہا وغیرہ

خادم کی حیثیت سے فراہم کئے جاتے ہیں ورنہ یہ چیزیں خود مقصود بالذات نہیں ہیں۔
یا للاسف کیسی بے عقلی ہے کہ زندگی میں نہ عبادت کا آٹا چھانا جاتا ہے نہ گوندھا جاتا ہے اور نہ روٹی پکانے کا ارادہ ہوتا ہے مگر بازار سے وہ چیزیں لائی جارہی ہیں جو مقصود کیلئے وسائل ہیں۔ آہ زندگی کے سارے گوشوں میں نظر مقاصد سے ہٹ کر صرف وسائل میں اٹک کر رہ گئی ہے صرف دنیا داروں کا نہیں بلکہ دین داروں کا بھی یہی حال ہے۔ دینی مدارس کو دیکھو کہ پہلے صرف و نحو کی کتابیں نہ باندانی کا ذریعہ تھیں اور اسی حیثیت سے اُنکی تعلیم ہوتی تھی۔ اب معاملہ الٹ گیا۔ زباندانی ختم ہوگئی صرف کتاب کا گھوٹنا اور ہر پہلو سے اس کے مصنف پر من ملنے اعتراضات اور من گھڑت جوابات سوجھنا رہ گیا ہے۔ اور جسے یہ چیز زیادہ آتی ہے۔ اسکی کتاب کی حد تک امامت مسلّم ہے چاہے وہ زباندانی میں صفر ہی کیوں نہ ہو۔

خانقاہوں کو دیکھو کہ صوفیائے کرام نے جو اوراد، اشغال اور وظائف مقاصد کے وسائل کے درجے میں رکھے تھے آج وہ خود مقاصد ہیں۔ یاد رہے وِرد وہ کہلاتا ہے جو شیخ طریقت روحانی بیماری کو دور کرنے کے لئے پڑھنے کو بتائے۔

وظیفہ وہ کہلاتا ہے جو کسی جسمانی بیماری یا مادی تکلیف کو دور کرنے کے لئے پڑھا جائے۔
شغل وہ عمل کہلاتا ہے جس میں شیخ کیفیت مخصوص اور ہیئت مخصوص سالک کیلئے تجویز کرے مراقبے اسی میں داخل ہیں۔ ذکر الفاظ کا وہ مخصوص پیمانہ ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے منقول ہو۔

حکومت کو دیکھو کہ صحابہ کے زمانے میں یہ اسلام کی زندگی میں تابندگی کا ذریعہ تھی۔ مگر آہ آج اسلام کی جگہ ہر باطل، ہر کفر، ہر ارتداد، ہر الحاد اور ہر زندقہ حکومت کے صدقے پھلتا اور پھولتا ہے۔ حکومت کا مقصد تو قرآن نے یہ بتایا تھا کہ

ان مکنّا ھم فی الارض اقاموا
الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ

وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر

مگر آج معاملہ الٹا ہوا ہے نہ اقامت صلوٰۃ ہے اور نہ ایتاء زکوٰۃ نہ امر بالمعروف ہے اور نہ نہی عن المنکر۔ بلکہ اس کے برعکس نماز کی جگہ بے دینی اور بد دینی کی ترویج ہو رہی ہے فلم سے لیکر ریڈیو کی مشین تک سے امر بالمنکرات کی علانیہ اور کھلم کھلا خدمت لی جا رہی ہے اور دنیا میں اسلام کی سب سے بڑی حکومت ہونے کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ فانا للہ وانا الی اللہ المشتکیٰ۔ حکومت پر تنقید مقصود نہیں ہے۔ بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ وسائل نے مقاصد کی جگہ لے لی ہے۔ ذرائع منزل مقصود ہو گئے۔ اور مسافر راہ کی بوقلموں دلفریبیوں میں پھنس کر رہ گیا اتنا پھنسا کہ اب مرور زمان اور جہل و کوری سے اپنے مسافر ہونے کا بھی احساس نہیں رہا ہے دراصل یہ نتیجہ ہے آخرت کے بارے میں مطمح نظر غلط ہونے کا۔ اور جب بھی امتوں میں آخرت کے متعلق فکر و نظر نے غلطی کھائی یہی اور اسی قسم کے غلط نتائج پیدا ہوئے۔

یاد پڑتا ہے کہ تذکرہ الحفاظ میں حافظ ذہبی نے ابو اسحاق الفزاری کے حوالہ سے شیخ الاسلام امام اوزاعی کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ صحابہ و تابعین میں پانچ چیزیں عام تھیں۔ لزوم جماعت، اتباع سنت، مساجد کی آبادکاری، تلاوت قرآن اور اللہ کے دین کی خاطر محنت کرنا۔ لیکن آہ اب دین چند سطحی رسموں کا نام رہ گیا۔ دینداری مٹ کر فن دینداری اور پیشۂ دینداری نے جگہ لے لی۔

قرآن میں قصص انبیاء اور ایام اللہ کا غور سے مطالعہ کرو تو صاف معلوم ہوگا۔ کہ ہر برائی کی اصل جڑ عدالت الہٰی کے محاسبہ اور یوم جزا سے غفلت ہے۔ میں کبھی کبھی سوچا کرتا تھا کہ سورہ البقرہ میں جہاں مالیاتی مسائل پر بحث کی ہے پہلے سود کا ذکر ہے۔ پھر قرض کے لین دین کا تذکرہ ہے اور درمیان میں یہ آیت ہے۔

واتقوا یوماً ترجعون فیہ الی اللہ الخ

سوچنے کے باوجود جوڑ اور ربط سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ایک جمعہ عین تقریر کے دوران میں شرح صدر ہوا کہ آیت سود کی بحث کے خاتمہ پر ہے اور خلاصۃ البحث یہ ہے کہ سود کو حرام کر دینے کے بعد بتایا ہے کہ اگر مقروض تنگدست ہو تو مہلت دو اور اگر معاف کر دو تو کیا ہی کہنے ہیں۔ اس کے بعد یہ آیت ہے بتانا یہ چاہتے ہیں کہ اگر تم یہاں اپنے محاسبہ میں آسانی کرو گے اور لوگوں سے رواداری کا برتاؤ کرو گے تو کل کو جب تم اپنا حساب دینے کے لئے چیکنگ کی خاطر پیش ہو گے اس دن سے ڈرو یہاں تم آسانی کرو گے۔ وہاں ہم حساب میں آسانی کریں گے۔

میرے عزیز دھیان کی چیز دنیا نہیں ہے آخرت ہے جہاں تولے اور ماشے کا نہیں بلکہ رتی رتی کا حساب ہوگا۔ زبان سے بولے ہوئے الفاظ جسم کا لبادہ پہن کر سامنے ہوں گے۔ زبان قلم سے نکلی ہوئی تحریر موجود ہوگی۔ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاید حضرت معاذؓ سے فرمایا تھا۔

رسول اللہ ۔ الا ادلک بملاک الامر کلہ؟ کیا میں تم کو سارے معاملہ کی گانٹھ نہ بتا دوں؟

حضرت معاذؓ ۔ بلیٰ یارسول اللہ ہاں اے اللہ کے رسول

رسول اللہ ۔ کف لسانک اپنی زبان پر قابو رکھو۔

دہان نبوت سے نکلی ہوئی آواز سن کر کانپ گئے اور بولے

أإنا لمواخذون بما نتکلم یارسول اللہ؟

کیا ہماری اپنی گفتار پر بھی گرفت ہوگی یارسول اللہ؟

فرمایا۔ ثکلتک امک یامعاذ ما النار الا حصائد السنتکم

واہ اے معاذؓ دوزخ تو زبان ہی کی لگائی ہوئی کھیتوں کا نام ہے۔

میرے پیارے اصل دنیا نہیں اصل تو آخرت ہے دنیا کے پیچھے وہاں تک چلو

جہاں تک آخرت کا فکر اجازت دیتا ہو۔ یہاں ہمیشہ رہنا نہیں ہے یہ دار البقاء نہیں دار فنا ہے۔ یہاں بندے بن کر رہنے والے وہاں کامیاب ہیں خواہ تمہاری نظروں میں کتنے ہی گرے ہوئے ہوں اور حقیقت میں وہی دور اندیش ہیں۔ جو آگے کی زندگی کی تیاری میں ہیں۔ کیسی نادور اندیشی ہے یہ کہ ساٹھ سالہ زندگی کے لئے یہ اہتمام یہ تگ ودو یہ دوڑ دھوپ اور آنے والی ابدی زندگی سے یہ غفلت۔ اللہ سے دعا کرو۔

اللّٰھم لا عیش الا عیش الآخرۃ

اللّٰھم انی اسئلک نعیما لا ینفد

وقرۃ عین لا تنقطع۔

آمین ثم آمین!

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

بنام جناب قاضی مقبول محمد صاحب بی۔ اے محلہ دھارووال سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

مورخہ ۲۵ ستمبر ۵۳ء

تقدیر کو برائیوں کے لئے آڑ اور خوبیوں کو اپنا کمال سمجھنا، اللہ جل شانہ، کا بندوں کے نام پیغام انسان مناطقہ کا حیوان ناطق نہیں بلکہ ایک ذمہ دار اخلاقی وجود ہے۔ اتباع سے مومن درجہ محبوبیت پاتا ہے۔ گردوپیش کے لحاظ سے دو حکم، اصطلاح شریعت میں استغفار کی حقیقت۔ غفر کے لغوی معنے حفاظت کی دو صورتیں عصمت اور حفظ۔ استغفار اور توبہ میں ایک لطیف فرق۔ اعمال جنت میں داخل ہونے کا سبب ہیں۔ بدل اور قیمت نہیں ہیں۔ زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا تقویٰ ہے۔

عزیزی! سلمکم اللہ السلام علیکم

تم ایم۔اے کے سال اول میں کامیاب ہو گئے ہو گے اور خدا کرے کہ دوسرے سال میں اسی طرح کامران رہو دنیا ظل ظلیل ہے۔ تم اب تعلیم کے ملک کی سیر کر کے بارڈر پہ پہنچ چکے ہو اللہ کا تم پر کتنا بڑا احسان ہے کہ حالات کی ساری ناسازگاریوں اور واقعات کی پوری ناموافقتوں کے باوجود تم مولوی۔ مولوی عالم، مولوی فاضل، منشی فاضل، میٹرک، ایف۔اے، بی۔اے اور ایم۔اے تک پہنچ گئے ہو۔ کتنے ہی سرمایہ داروں کے بچے ہیں جو سرمایہ کے نشے میں چور ہیں۔ لیکن جہل و کوری کی گود میں کھیل رہے ہیں اسے کہتے ہیں۔ اللہ کا فضل۔

لوگ آجکل تقدیر کو برائیوں کیلئے آڑ اور بہانہ بناتے ہیں اور خوبیوں کو اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ صحابہ کرام خوبیوں کو منجانب اللہ کہتے تھے۔ اور برائیوں کو اپنی طرف منسوب کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث قدسی میں اللہ جل شانہ، کا جو پیغام

بندوں کے نام لائے ہیں۔ غالباً اس کے الفاظ یہ ہیں ۔

انما ھی اعمالکم احصیھا لکم	یہ صرف تمہارے ہی اعمال ہیں جن کو تمہاری خاطر
فمن وجد خیرا فلیحمد اللہ	سمیٹتا ہوں یاد رکھو۔ جسے نیکی کی توفیق ملے اسے
ومن وجد غیر ذالک فلا	اللہ کا شکر کرنا چاہئے اور جو کسی برائی کا ارتکاب
یلومن الا نفسہٗ	کرے اسے اپنے سوا کسی کو ملامت نہ کرنا چاہیئے۔

العقد الفرید میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حالات میں پڑھا ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے تھے ۔

ھذا ما رای ابوبکر ان	یہ ابوبکر کی رائے ہے اگر حق ہو تو اللہ کی
کان حقا فمن اللہ والا فمنی	جانب سے ہے ورنہ میری اور شیطان کی
ومن الشیطان	جانب سے ہے ۔

صحابہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقدیر کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں تو بولے ۔

افلا نتکل	کیا ہم رہ نہ جائیں یعنی کام نہ چھوڑ دیں ۔

جواب میں جو حکیمانہ بات ارشاد فرمائی سننے کے قابل ہے۔

اعملوا کل میسر لما	کام کرو ہر ایک کو اپنے اپنے مقدر
خلق لہ	کے لئے آسانی بہم پہنچا دی جائے گی ۔

دنیا جدوجہد، سعی اور کوشش کا گھرانہ ہے یہاں سرگرم کار کن اور ان تھک محنتی حیات جاوداں حاصل کر جاتے ہیں۔ نکمے اور اپاہج ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اچھائیوں کی نسبت اللہ جل شانہٗ کی طرف کرنی چاہیئے شائد مدارج میں ایک حدیث ہے کہ

بندہ جب کہتا ہے کہ اے اللہ میں نے فلاں نیکی کی تو اللہ جل شانہٗ کہتے ہیں کہ

اے بندے میں نے تجھے توفیق دی۔ بندہ جب کہتا ہے کہ اللہ تو نے توفیق دی۔ تو اللہ جل شانہ فرماتے ہیں کہ اے بندے تو نے ارادہ کیا۔ او کما قال

اللہ کی توفیق، تمہارے ارادے، تمہاری محنت اور سعی و کوشش کا نتیجہ آج تمہارے سامنے ہے بڑائی اور شادمانی دراصل محنت ہی کا ثمرہ ہے۔ شاہ عبدالحق نے اپنے متعلق لکھا ہے۔

چہ دودہائے چراغ کہ در دماغ نہ رفت
کدام بادہ محنت کہ در ایاغ نہ رفت
کدام خواب وچہ آسائش و کجا آرام
چہ خار خار کہ دربستہ فراغ نہ رفت
بجیر تم زدل خود کہ عمر رفت ولے
کنج غمکدہ ہرگز صحن باغ نہ رفت

بیس سال کی عمر میں تم نے تکمیل کر لی الحمد للہ علی ذالک

اب تمہاری زندگی کا دوسرا مرحلہ سامنے ہے اگرچہ اللہ جل شانہٗ کی عنایت سے امید تو یہی ہے کہ جس طرح مرحلہ اول جو قرآن کی زبان میں لہو ولعب کا گوشہ ہے تعلیم میں گذرا اسی طرح دوسرا مرحلہ جسے زینت کہا ہے اور تیسرا مرحلہ جیسے تفاخر اور پھر چوتھا مرحلہ جسے تکاثر فی الاموال والاولاد کہا گیا ہے، یہ بھی اچھا اور بہترین گذرے گا مگر میرے عزیز انسان ایک ذمہ دار اخلاقی وجود کی حیثیت میں دوسرے جانداروں میں ممتاز ہے نہ کہ صرف ناطق کی حیثیت میں جسے مناطقہ کہتے ہیں۔ اور پھر انسان ہونے کے علاوہ ایک مسلمان کی زندگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہے۔ اسلامی فکر کے مطابق مرنے کے بعد جی اٹھنے اور اس زندگی کی رائی رائی کا حساب دینے کی ذمہ داری ہے اسی ذمہ داری پہ آخرت کی نجات اور

ابدی فلاح کا دارو مدار ہے۔ اس ذمہ داری کا احساس یہاں جس قدر شدید ہوگا۔ اسی قدر یہاں تکلیفیں ہوں گی کہ

حفت الجنۃ بالمکارہ — جنت ناگواریوں کے ساتھ ڈھانپ دیگئی ہے۔

اور

الدنیا سجن المؤمن — دنیا مومن کا قید خانہ ہے۔

لیکن وہاں آرام ہی آرام اور راحت ہی راحت ہوگی۔

تکلیفیں مطلقاً مقصود نہیں شاید تم سوچو کہ میں تمہیں جوگ، یا رہبانیت کی طرف لیجا رہا ہوں اسلام تعذیب جسم کا نظریہ لے کر نہیں آیا بلکہ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اُس جہاں کی کامیابی رسالتمآب کے اتباع سے وابستہ ہے اور اس اتباع کی راہ میں ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے یہ کہتے ہوئے کہ ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست — ہر جا کہ می برد خاطر خواہ اوست

برداشت کرتے جانا ایمان کا تقاضا اور اسلام کی روح ہے اسی اتباع سے ایک مسلمان درجہ محبوبیت پر پہنچ جاتا ہے

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی — اگر تم اللہ سے پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔

یحببکم اللہ۔ — اللہ تم سے پیار کرے گا۔

اور اسی سے مرتبۂ عبدیت ملتا ہے جو تمام مراتب کمال سے بالا ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس دوسرے مرحلہ پہ تمہاری زندگی کچھ ایسی اچھوتی ہو کہ لوگ دیکھ کر ہی اسلام یاد کرلیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ پورے اسلام کو اپنانے کیلئے اسلامی ماحول کی ضرورت ہے اسی ماحول اور گردوپیش کے لحاظ سے قرآن میں دو حکم ہیں ایک جگہ اس ماحول کے مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے جہاں کفر بازاروں میں، محفلوں میں، گھروں میں، تعلیم گاہوں اور مجلسوں میں تن کر چلتا ہے۔ فرمایا۔

فاتقوا اللہ ما استطعتم   جتنا بس میں ہے اللہ کی نافرمانی سے بچو

دوسری جگہ اس گرد و پیش میں رہنے والے مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے جہاں فضاؤں اور ہواؤں میں اسلام ہے فرمایا۔

اتقوا اللہ حق تقاتہ   ایسا نافرمانی سے بچنے کا حق ہے بچو

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ زندگی کے ان گوشوں میں اسلام کی تم جیتی جاگتی تصویر ہو جن پر تمہاری دسترس ہے یہی ما استطعتم کا مدلول ہے۔ اور جو تمہاری دسترس سے باہر ہیں ان کیلئے استغفار کرو لیکن استغفار عوامی عرف میں نہیں بلکہ اصلاح شریعت میں یعنی دل میں ندامت کے احساس کے ساتھ خدا کی جناب میں معافی کی درخواست۔

استغفار صرف کردار اور گفتار کی غلط کرتوتوں سے نہیں کی جاتی بلکہ کام اور مطالبے میں کوتاہیوں پر بھی ہوتی ہے۔ یہ غفر سے نکلا ہے۔ عام لوگ غفر کے معنے ڈھانپنے کے بتاتے ہیں۔ اور اسی لحاظ سے استغفار کے معنے پردہ خواستن کرتے ہیں لیکن یہ غلط ہے غفر کے معنے حفاظت کے آتے ہیں مغفر خود کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سر کو تلوار کی مار سے محفوظ رکھتی ہے غفار بٹے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ازار کو گرنے سے محفوظ رکھتا ہے اسلئے استغفار کے معنے حفاظت چاہنے کے ہیں۔ حفاظت دو طرح کی ہوتی ہے ایک اعلیٰ اور ایک ادنیٰ۔ اعلیٰ یہ کہ بندے کو گناہ سے محفوظ رکھا جائے۔ ادنیٰ یہ کہ بندوں کو پیش پا افتادہ معاصی کے نتائج سے محفوظ رکھا جائے۔ اعلیٰ یعنی بندے کو گناہ سے محفوظ رکھا جائے۔ اسکی دو صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ بندے کے راستے سے گناہوں کو ہٹا دیا جائے اسے عصمت کہتے ہیں۔ یہ خاصۂ انبیاء ہے۔ دوم یہ کہ بندے کو گناہ کے راستے سے ہٹا لیا جائے اسے حفاظت کہتے ہیں یہ اولیائے کیلئے ہے۔ اولیاء اللہ گناہوں سے محفوظ اور انبیاء گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ تفصیل دیکھنی ہو تو مولانا شہید کا منصب امامت اور ابن القیم کا مدارج لکھو۔

ہمیں استغفار پیش پا افتادہ گناہوں کے نتائج اور گناہوں دونوں سے بچنے کی کرنی چاہیئے اور سچ یہی ہے۔ کہ گناہوں سے وہ ہی بچائے تو بچ سکتا ہے۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلّم کی دُعا کا یہ جملہ کیسا معنی خیز ہے۔

اصلح لی شانی کلہ لا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین ان تکلنی تکلنی الی ذنب وعورۃ وخطیئۃ لا یغفر الذنب الا انت۔

اے اللہ میرا حال ٹھیک کر دے مجھے مجھ پر آنکھ جھپکنے کی برابر بھی نہ چھوڑ اگر تو نے مجھے چھوڑ دیا تو مجھ میں گناہ اور خطائیں ہوں گی۔ پروردگار! گناہ تیرے سوا بخشنے والا کوئی نہیں ہے۔

مدارج میں استغفار اور توبہ میں ایک لطیف فرق یہ بھی لکھا ہے کہ ماضی پر استغفار اور مستقبل کے لئے گناہ نہ کرنے کا عہد توبہ ہے۔

اب قرآن کی آیت سنو۔

اِسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ

تم اپنے مالک سے معافی چاہو اور توبہ کرو

بات کیسی بچ گئی اور بن گئی۔ رحمت حق جل شانہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا بہترین ذریعہ استغفار ہے۔

لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو اللہ سب گناہ معاف فرمادے گا

میں اسی طرف اشارہ ہے اور یہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے

لن یدخل الجنۃ احد بعملہ یا عائشۃ قالت ولا انت یا رسول اللہ قال وما انا الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ

کوئی بھی شخص اپنے عمل کے بدلے جنت میں نہ جائے گا حضرت عائشہ نے کہا نہ آپ فرمایا نہ میں مگر یہ کہ اللہ مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لے۔

تو اس کا اس کے سوا اور کیا مطلب ہے کہ جنت کردار و گفتار کے گھمنڈ سے نہیں بلکہ رحمتِ حق سے ملے گی۔

شاید تمہیں وسوسہ ہو کہ قرآن میں تو جنت کو اعمال کی جزا قرار دیا گیا ہے۔ اور جگہ جگہ بما کانوا یعملون آیا ہے۔ جوابات بہت ہیں۔ مگر مجھے حافظ ابن تیمیہ کا جواب پسند آیا ہے۔ حدیث میں بعملہ کی باء باءِ مقابلہ ہے۔ اور قرآن میں بما کانوا کی باء باءِ سببیہ ہے۔

مطلب یہ ہے۔ کہ اعمال جنت کی قیمت نہیں بلکہ دخول جنت کا سبب ہیں۔

بہر حال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اب تمہارے پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا مرحلہ سامنے ہے۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ یہی زندگی کے سارے بگاڑ کا سرچشمہ ہے پھونک پھونک کر قدم رکھنا تقویٰ کے ٹھیٹھ اور واقعی معنے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ابی بن کعب سے اس پر گفتگو کی تھی یہ مکالمہ ابن کثیر نے نقل کیا ہے۔

ما التقوىٰ یا ابی فقال اما سلکت طریقاً ذا شوك

قال عمر بلیٰ قال ابی فما عملت هنالك قال شمرت و

اجتهدت قال فذالك التقوىٰ

اے ابی تقویٰ کیا ہے فرمایا کیا خاردار راستہ سے کبھی نہیں گذرے حضرت عمر نے کہا ہاں ابی نے پوچھا وہاں کیا کیا؟ فرمایا احتیاط کی اور کپڑے سمیٹ لئے۔ فرمایا بس یہی تقویٰ ہے

یہ یا اسی کے لگ بھگ عبارت ہے اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا مطالبہ اگرچہ ساری زندگی میں ہے۔ لیکن جہاں تک انفرادی زندگی یعنی تزکیۂ نفس، اصلاح اخلاق اور درستیٔ اعمال کا تعلق ہے اسے قرآن و سنت کے سانچوں میں ڈھال لینا تمہارے اختیار میں ہے۔ اس کے بغیر انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں کوئی امتیاز نہیں۔ دنیا اور اس کی تڑپ

ہیں خواہ کیسے ہی بلند مراحل پر پہنچ جاؤ مگر ایک روز بہرحال اسے ختم ہو جاتا ہے۔ بچپن سے جوانی اور جوانی سے پیری اور پیری سے موت کی منزل ناگزیر ہے۔ سلطان محمد تغلق شاعر تھا حالت نزع میں اس نے چند اشعار کہے ہیں۔

بسیار دریں جہاں تپیدیم   بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپان بلند بر نشستیم   ترکاں گراں بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط و آخر   چوں قامت ماہ نو خمیدیم

کیسی اچھی تصویر ہے۔

عزیز من نماز پنجگانہ باجماعت کی پابندی اور کبائر سے اجتناب کے ساتھ اگر روزانہ صبح و شام رب اغفر لی و تب علی انک انت التواب الغفور سو سو بار کلمہ سوم سبحان اللہ، الحمدللہ، لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر سو سو بار، درود شریف سو بار۔ بعد نماز صبح تا طلوع تہلیل خفیہ اور بعد از طلوع تلاوت قرآن کو عادت کے درجہ میں اپنا لو تو سمجھو کہ اللہ جل شانہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ بس اب رخصت ہوتا ہوں۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ

بنام جناب امین اللہ صاحب۔ وثیر ایم۔ اے پولیٹیکل پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۵۳ء

نبوت کے بارے میں مولانا محمد قاسمؒ کا نظریہ، اوصاف کی قسمیں، نبوت بھی ایک وصف ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اوصاف کا موصوف ذاتی پر اختتام، وصف ذاتی لازوال اور انمٹ ہوتا ہے۔ حضور انور کے لئے نبوت حادث ہے، حدوث اور خلق میں فرق، حدیث عائشہ کا مطلب، امت کی بعثت اور اس کے فرائض، مقام نبوت اور اس کی تشریح، خاتم النبیین سے حیات النبی پر استدلال، صرف یہ نہیں کہ نبی نہیں آئے گا۔ بلکہ نبی کا آنا آپ کے بعد عقلاً ناممکن اور محال ہے۔

تلمیذی العزیز! والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

شائد آپ نے تحذیر الناس خود نہیں پڑھی دل نہیں مانتا کہ کتاب پڑھنے کے بعد آپ جیسا ذکی ان خیالات کا شکار ہو چھوٹی سی کتاب ہے۔ صرف چالیس صفحات کی۔ ایک دفعہ غور سے پڑھ لیجئے اطمینان دلانا تو میرے بس سے باہر ہے اس کا تعلق دل سے ہے اور دل کا معاملہ اللہ جل شانہٗ کے قبضے میں ہے۔ بہرحال جو کچھ میں جانتا ہوں عرض کرتا ہوں۔ اور اس دعا کے ساتھ کہ یا مصرّف القلوب صرّف قلب .... علیٰ طاعۃ الحق۔

آپ تو کہہ رہے ہیں کہ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ ختم نبوت کے قائل نہیں مگر جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ کچھ اور ہے۔ صرف یہ نہیں کہ "نبی نہ آئے گا" کہ اسے تو سب ہی مانتے ہیں اور جانتے ہیں۔ مولانا کا نظریہ نبوت کے بارے میں اس سے بھی زیادہ اونچا ہے ان کا دعویٰ ہے کہ صرف آئے گا نہیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے بعد کسی اور نبی کا آنا ممکن ہی نہیں۔ فرمایئے کہ جو شخص امکان کی نفی کر رہا ہو اسے ہی وقوع کا مدعی بنا کر پیش کرنا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

لیجئے مولانا نے اسی تحذیر الناس میں بات یہاں سے شروع کی ہے۔

۱:- اوصاف دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ذاتی اور عرضی۔ موصوف ذاتی کا وصف خانہ زاد اور اصلی ہوتا ہے۔ اور موصوف عرضی کا وصف موصوف ذاتی سے مانگا ہوا اور مستعار ہوتا ہے۔

۲:- موصوف عرضی میں اوصاف کا خواہ کتنا ہی تعدد ہو مگر سب موصوف ذاتی پر ختم ہو جاتے ہیں اور کسی وصف عرضی کا کوئی بھی سلسلہ کبھی موصوف بالذات سے متجاوز نہیں ہوتا۔

نبوت ایک وصف ہے نبی اس کا موصوف ہے عقلاً ضروری اور ناگزیر یہ ہے کہ چاہے اس وصف کے موصوف کتنے ہی متعدد ہوں مگر ایک موصوف بوصف نبوت بالذات ہو اور باقی موصوف بوصف نبوت بالعرض۔ مولانا قاسم العلوم نے تحذیر الناس میں دعویٰ کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی وصف نبوت کی موصوف بالذات ہے اور دوسرے انبیاء موصوف بالعرض ہیں سب کی نبوت آپ کا فیض ہے اور آپ کی نبوت کسی کا فیض نہیں ۔۔۔ یہ دعویٰ کر کے مولانا نے سمجھنے والوں کے لئے اس کے دلائل کی طرف بھی اشارات کئے ہیں فرماتے ہیں کہ جس طرح موصوف عرضی کے سارے اوصاف بہت کچھ پھیلاؤ کے باوجود موصوف ذاتی پر ختم ہو جاتے ہیں اور آگے سلسلہ بند ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح یہ بات بھی طے شدہ اور مسلّم ہے کہ اوصاف ذاتی اپنے موصوف سے جدا نہیں ہو سکتے اور اوصاف عرضی اپنے موصوف سے جدا ہو سکتے ہیں مثلاً چار کیلئے جفت، تین کیلئے طاق، شعاع کیلئے نورانی، جسم کیلئے مکانی اور حرکت کیلئے زمانی ہونگے کیلئے

مرئی اور آواز کے لئے مسموع ہونا وصف ذاتی ہے کسی زمانے میں اور کسی موقعہ پر بھی ان سے یہ اوصاف جدا نہیں ہو سکتے ہوتے نہیں بلکہ اوصاف ذاتی کا اپنے موصوفوں سے جدا ہونا ممکن ہی نہیں ہے برخلاف اوصاف عرضیہ کے کہ وہ قابل زوال ہوتے ہیں جیسے زمین کی دھوپ، آئینہ کی چمک، کپڑے کی سپیدی۔ الغرض اوصاف اصلیہ اور خانہ زاد انمٹ ہوتے ہیں ان کا اصلی اور خانہ زاد ہونا ہی اس کی دلیل ہے۔

یہ قاعدہ سننے کے بعد سمجھئے کہ نبی کریم صلی اللہ وسلم موصوف بوصف نبوت ذاتی ہیں اور دوسرے انبیاء موصوف بوصف نبوت عرضی ہیں۔ اور وصف کا اپنے موصوف ذاتی سے جُدا ہونا ناممکن ہے اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آجانے کے بعد کسی نبی کا آنا ناممکن ہے یعنی وصف نبوت آپ کی ذات سے الگ ہو کر وجود کی گود میں کہیں پایا نہیں جا سکتا اسی کی طرف حدیث لا نبیّ بعدی میں اشارہ ہے اور اسی سے یہ بات بھی نکل آئی کہ چالیس سال کی عمر میں مکہ معظمہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ وصف ذاتی ہونے کی وجہ سے حادث ہے۔ مخلوق نہیں ہے حدوث اور خلق میں تھوڑا سا فرق ہے تفصیل کا موقعہ نہیں دونوں میں عموم و خصوص کی نسبت ہے زیدٌ قائمٌ میں صفت قیام زید کے لئے حادث ہے زید قیام کا خالق نہیں ہے نبوت کا تعلق براہ راست اللہ جل شانہ کی صفت علم سے ہے اور یہی صفت اس کی مربی ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ صفات باری میں صفت علم کا مقام کیا ہے اسی لئے تو عرفاء بھی کہتے ہیں کہ مربی ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تعین اول ہے یعنی اللہ جل شانہٗ کی صفت علم وعلّمک ما لم تکن تعلم وکان فضل اللہ علیک عظیما میں اسی طرف اشارہ بھی ہے۔

کوئی مانے یا نہ مانے اپنا خیال یہی ہے کہ ذات رسالت علم خداوندی سے بے واسطہ

مستفید ہے اور علم پر صفات حاکمہ کا اختتام ہے۔ اس لئے آپ پر نبوت کا اختتام ہے اور نبوت آپ کیلئے عالم میں حادث ہوئی ہے۔ ہمیں صرف اس کے حدوث کا پتہ ہے اور اسی کی تاریخ سے ہم واقف ہیں ہمیں مخلوقیت کی تاریخ کا پتہ نہیں ہے صرف اتنا بتانے والے نے بتایا ہے کہ اوّل ما خلق اللہ نوری او کما قال۔ نتیجہ یہ کہ آپ عبائے نبوت پہننے سے پہلے ہی نبی تھے۔ شاید حدیث عرباض میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے انی عند اللہ مکتوب خاتم النبیین اور کنت نبیاً وادم بین الماء والطین او کما قال۔

اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ چونکہ ایک موصوف ذاتی کیلئے موصوف بالعرض متعدد ہوتے ہیں اس لئے مختلف گوشوں اور مختلف وقتوں میں انبیاء موصوف بوصف نبوت بالعرض متعدد آئے ہیں اور چونکہ وصف عرضی اور موصوف عرضی موصوف بالذات کی فرع ہوتے ہیں اور موصوف بالذات اوصاف عرضیہ کی اصل ہوتا ہے۔ اور مقصود بالذات وجود میں موصوف بالذات ہی ہوتا ہے۔ مثلاً روٹی کہ موصوف بالذات ہونے کی وجہ سے مقصود بالذات ہے اور توا، چمٹا، چولھا، لکڑی، آگ موصوف بالعرض ہیں اور غیر مقصود۔ لیکن شہود وظہور میں موصوف بالذات سے مقدم ہیں اسی طرح انبیاء جو موصوف بالعرض ہیں ظہور میں موصوف بالذات سے مقدم ہیں اور جسطرح موصوف بالذات کے ظہور کے بعد موصوف بالعرض ختم کر دیئے جاتے ہیں جیسے روٹی تیار ہونے کے بعد چولھے کی آگ بجھا دی جاتی ہے اور کسی موصوف بالعرض کی طرف توجہ نہیں رہتی بلکہ توجہات کا مرکز موصوف بالذات ہو جاتا ہے اسی طرح موصوف بوصف نبوت بالذات کے ظہور کے بعد انبیاء کی اطاعت واتباع بھی ختم کر دی گئی اسی کی طرف لوکان موسیٰ حیاً واتبعتموہ وترکتمونی لضللتم ضلالاً بعیداً ابین اشارہ ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی مشہور کتاب الخیر الکثیر میں بڑی تحدی سے یہ بات کہی ہے۔

تعلق بانّ موسیٰ لوکان بعد رسول اللہ حیًّا لما وسعہ الّا الاتباع

اسی سے اس بات کا تعلق ہے کہ اگر حضرت موسیٰ حضور کے بعد زندہ ہوں تو ان کو حضور کی اتباع کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اور یہیں سے ایک بات اور بھی سمجھ میں آتی ہے کہ موصوف بالذات میں وصف کبھی مؤثر اور کبھی علت ہوتا ہے مثلاً آفتاب کی روشنی اپنے موصوف آفتاب کا اثر ہے اور دنیا میں روشنی اور گرمی کی آفتاب علت ہے۔ ستارے چمک رہے ہیں مہتاب رات کی تاریکی میں چاندنی تانے ہوئے ہے یہ آفتاب کا اثر ہے۔ پانی گرم ہو رہا ہے کھیتیاں پک رہی ہیں۔ زمین تپ رہی ہے آدمی اور جانور پسینے سے شرابور ہو رہے ہیں۔ آفتاب اسکی علت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ موصوف بالذات ہیں ضروری ہے کہ آپ میں یہ دو باتیں ہوں ایک جگہ وصف نبوت مؤثر بن کر آئے اور دوسری جگہ یہی وصف نبوت اپنے موصوف کی علت بن کر آئے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اثر اپنے مؤثر سے اور علت اپنے معلول سے کبھی جدا ہو کر نہیں آتا۔ یقیناً اور بلا ریب ذات نبوت میں دونوں حیثیتیں موجود ہیں۔

ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ آفتاب جب تک نگاہوں سے پوشیدہ رہتا ہے۔ مؤثرانہ حیثیت میں مقام غیبت پر اثر انداز رہتا ہے آفتاب پوشیدہ ہے مگر ستاروں کی چمک اور چاند کی مہتابی آفتاب کے اثر سے اپنا کام کر رہی ہے یہ اثر اپنے مؤثر سے قطعاً جدا نہیں ہے۔ موصوف بوصف نبوت بالذات کے آفتاب نبوت طلوع ہونے سے پہلے انبیاء کا موصوف بوصف نبوت بالعرض بن کر آنا آفتاب نبوت کا اثر ہے۔

غالباً مستدرک حاکم میں جو حدیث آتی ہے خواہ وہ سند کے لحاظ سے کیسی ہو اس میں اسی طرف اشارہ ہے۔

اوّل ما خلق اللہ نوری — سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا فرمایا ہے

اور یہ پہلے معلوم ہو چکا کہ موصوف بالذات کے لئے موصوف بالعرض چند در چند

ہو سکتے ہیں مگر متاثر ہونے کی صورت میں موصوف بالعرض متعدد ہونے کے باوجود خارجی طور پر معدود اور محدود ہوں گے۔ دیکھ لیجئے۔ صبح کو آفتاب نکلنے کے بعد روشنی جو کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے معلول ہونے کے درجہ میں اس کی علت آفتاب ہے جب موصوف بالذات پیغمبر کا آفتاب نبوت طلوع ہوا تو اس گرمی اور روشنی ایمان کی علت ذات نبوت نے اپنے معلول میں جو کچھ کام کیا وہ سب کے سامنے ہے شاید طلوع آفتاب ہی کی مناسبت سے حضرت عائشہؓ نے نبوت سے پہلے واقعہ بیان کرنے کے لیئے فلق الصبح کی تعبیر اختیار کی تھی۔ غالباً بخاری کی حدیث میں حضرت عائشہؓ کے یہ الفاظ پڑھے ہیں۔

فکان لا یری رؤیا الاجاءت	آپ جو خواب بھی دیکھتے صبح کو
مثل فلق الصبح۔	سپیدہ صبح کی طرح سچا ہوتا۔

دیکھئے آفتاب ظہور کے بعد جب علت موثرہ کی حیثیت اختیار کرتا ہے تو معلول تعدد کے باوجود محدود اور متحدد نہیں ہوتا بلکہ اس میں ہمہ آن اور ہمہ وقت وحدت ہی وحدت نظر آتی ہے اس کی ضیا پاشی بلا تمیز یکساں طور پر ہوتی ہے لیجئے آفتاب نبوت نے بھی طلوع کے بعد بالکل یہی حیثیت اختیار کی ہے۔ قرآن نے شاید اسی حیثیت کو بیان کیا ہے۔

وما ارسلنٰک الا کافۃ	ہم نے آپ کو سب لوگوں کے لئے
للناس بشیرا و نذیرا	بشیر و نذیر بنا کر روانہ کیا ہے۔

جس طرح آفتاب کے لئے علت ہونے کی حیثیت میں معلول بالعدد نہیں ہوتا۔ اسی طرح آفتاب نبوت کا بھی معلول علت ہونے کے وقت میں بالعدد نہیں رہا۔

یاد رکھئے اور خوب سمجھ لیجئے کہ جس طرح موثر ہونے کی حیثیت میں متاثر موصوف بالعرض ہوتا ہے اسی طرح علت ہونے کی حیثیت میں معلول بھی موصوف

بالعرض ہوتا ہے۔

موصوف بالعرض متاثر ہونے کی حیثیت میں معدود ہوتا ہے اور تفرد وانفرادیت ہوتی ہے اور جب یہی موصوف بالعرض معلول بن کر آئے تو جمہوریت اور عمومیت کا لبادہ پہن کر آتا ہے۔ موصوف بوصف نبوت بالذات نبی کریم ؐ آفتاب نبوت طلوع ہونے سے پہلے موثر ہونے کی حیثیت میں ہیں اور متاثرین ستاروں کی طرح محدود ہیں۔ جس طرح ستاروں کی چمک میں تفاوت ہوتا ہے۔ اسی طرح انبیائے سابقین موصوف بوصف نبوت بالعرض متاثرین میں فرق مراتب تھا۔ قرآن میں اسی طرف اشارہ ہے

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ	یہ پیغمبر ہیں ہم نے ان کو باہم ایک
عَلٰى بَعْضٍ ۔	دوسرے پر فضیلت دی ہے۔

اور جس طرح آفتاب کے طلوع کے بعد علت کی حیثیت میں معلول بالعرض کے لئے علت نہیں ہوتا بلکہ اس کا علت ہونا سب کے لئے یکساں ہوتا ہے اسی طرح آفتاب نبوت کے طلوع ہوجانے کے بعد معلول بالعرض کو ختم کر دیا گیا اور ایسے معلول نے اس کی جگہ لی جو کہ اوراین کی قید سے نہ صرف ناآشنا بلکہ نامانوس ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے آپ ؐ کو خاتم النبیین کہا ہے۔ نتیجتہً وہی نبوت جس کے موصوف بالعرض متاثر ہونے کی حیثیت میں آتے تھے اب بھی قائم ہے مگر اب اس کا موصوف معلول ہونے کی حیثیت میں بالعرض نہیں ہے بلکہ پوری امت ہے۔

قرآن کو غور سے پڑھئے آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے ان تمام فرائض کو امت کا فرض قرار دیدیا ہے۔ جو نبی بوصف نبوت بالذات دیتا تھا۔ مثلاً ایمان، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دعوت الی اللہ، تبلیغ، شہادت علی الناس وغیرہ وغیرہ یہ امت کے وہ فرائض ہیں جن کی ادائگی کے لئے قرآن نے امت محمدیہ کو برپا کیا ہے یہ اوصاف بالذات تو نبی کریم ؐ میں پائے جاتے ہیں مگر بالعرض اور بالتبع امت میں نہ صرف قائم رکھے

گئے ہیں بلکہ ان کے قائم رکھنے کے لئے ہی امت برپا کی گئی ہے بالفاظ دیگر نبوت کے اوصاف کی امت موصوف بالعرض اور بالتبع ہے مگر فرق ہے تو صرف یہ کہ آفتاب نبوت محمدی نکلنے سے پہلے جب نبوت محمدی موثر کی حیثیت میں تھی اور انبیاء موصوف بالعرض متاثر تھے اور گنے چنے تھے اور نبوت محمدی کے آفتاب طلوع ہو جانے کے بعد آفتاب نبوت علت کے درجہ میں ہے اور امت اس کا معلول ہے اور معدود نہیں ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اسی طرف الخیر الکثیر میں اشارہ کیا ہے۔

فَھُنَاکَ کَانَ شَمْسًا وَاحِدًا   یہاں اپنی بزرگی میں ایک ہی
فِی جَلَالتہ   آفتاب ہے

موصوف بالعرض دونوں جگہ ہے ایک جگہ متاثر ہے اور دوسری جگہ معلول ہے متاثر ہونے کی صورت میں ستاروں کی طرح معدود ہے اور معلول ہونے کی حالت میں غیر معدود ہے لیکن دونوں جگہ نبوت ہی کی بعثت ہے۔ متاثر بھی مبعوث تھا۔ اور معلول بھی مبعوث ہے۔ متاثر میں انفرادیت تھی اس لئے نبوت کا لفظ اطلاق ہوتا تھا معلول چونکہ اجتماعیت کا لبادہ پہن کر آیا ہے اور طلوع آفتاب کے بعد آیا ہے اس لئے نبی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔

وَاَعْظَمُ الْاَنْبِیَاءِ شَانًا مَنْ   انبیاء میں بلحاظ مرتبہ سب سے اونچا
لہ نوع آخر من البعثۃ   وہ شخص ہے جو ایک اور بعثت
اَیْضًا۔   کا بھی حامل ہو۔

اور جس طرح آفتاب نکلنے کے بعد آفتاب یکساں طور پہ چمکتا ہے یہ معلول کی اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد ہے کہ علت سے کتنا اور کیا فائدہ اٹھائے۔ آئینہ، پینسل، لوہا، مٹی، کاغذ سب پر دھوپ تو یکساں پڑتی ہے اور علت سب کے لئے ایک ہے لیکن ہر معلول فائدہ اٹھانے میں اپنی استعداد و قابلیت کے لحاظ سے الگ الگ ہے

اسی طرح آفتاب نبوت بھی یکساں طور پر روحانی ضیا پاشی کر رہا ہے اور فائدہ اٹھانے والے اپنی اپنی استعداد کے مطابق فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان ہی فائدہ اٹھانے والوں میں ایسی تیز صلاحیت والے بھی ہوتے ہیں کہ دھوپ سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ نہ صرف خود گرم ہوتے ہیں بلکہ اپنے اثر سے اوروں کو بھی گرما دیتے ہیں۔ شاید زبان نبوت نے صحابہ کرام کے بارے میں اسی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے

أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ — صحابہ ستاروں کی طرح ہیں جس کے پیچھے چلو گے راہ پاؤ گے۔

یہیں سے ایک بات اور بھی سمجھ میں آتی ہے جس سے آپ جان لیں گے کہ امت کو کار نبوت سپرد کرنے کے باوجود نام نبوت سے کیوں محروم کیا گیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ضروریات وصف کی ضرورت صرف موصوف بالذات کو ہوتی ہے اور وصف کے آثار و نتائج سے موصوف بالذات اور بالعرض دونوں بہرہ وش ہوتے ہیں۔ مثلاً ریل میں بیٹھنے والے ریل میں بیٹھے ہیں۔ حرکت ریل میں ہوتی ہے تو متحرک بیٹھنے والے بھی ہوتے ہیں اور ریل جب چلتی ہے تو ریل میں بیٹھنے والے ضرور چلتے ہیں مگر چلنے اور حرکت کرنے کی نسبت موصوف بالذات یعنی ریل کی طرف ہو گی اور موصوف بالذات ہی کو ان افعال کا فاعل اور مسند الیہ قرار دیا جائے گا۔ نہ کہ موصوف بالعرض کو یہی ماجرا نبی کے اوصاف میں ہے موصوف تو سب ہیں مگر نبی بالذات ہے اس لئے قاعدے کے مطابق نبی کا اطلاق موصوف بالذات ہی پر ہو گا نہ کہ موصوف بالعرض پر لیکن نام کے مخصوص ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وصف نبوت کے آثار و نتائج سے امتی بہرہ وش نہ ہوں گے بلکہ امت کو وصف نبوت کے آثار و نتائج سے بواسطہ موصوف بالذات اسی طرح حصہ ملے گا جس طرح ریل میں بیٹھنے والوں کو بواسطہ ریل حرکت کا حصہ ملتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں الخیر الکثیر میں شاہ صاحب

نے ان الفاظ میں،

فَکَذَالِکَ بَعْدَ تمثلہ فی — ایسے ہی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم
موطن الوجود الجسدی — کے دار گاہ وجود میں آنے کے
امتنع تلقی حقیقۃ ناماسن — بعد کسی بھی کمال کا حاصل ہونا
الحقائق کما الا من قبل نفسہا — بذات خود بغیر ترجمان محال ہے

بلا ترجمان۔

اسی طرف اشارہ ہے جو کچھ مولانا قاسم العلوم کی زبان سے ہم اب تک علمی مقدمات کے ذریعے سن چکے ہیں یعنی موصوف بالذات آجانے کے بعد اب کسی موصوف بالعرض کا بالعدد آنا ناممکن ہے۔ حرف بحرف شاہ صاحب نے بھی امتناع کے لفظ میں وہی بات کہہ دی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہہ آیا ہوں کہ آفتاب نبوت نکل آیا ہے استعداد اور صلاحیت شرط ہے ضیا پاشی ہو رہی ہے اور ہر جگہ ہو رہی ہے۔ رات نہیں ہے کہ واحد بالعدد کی حیثیت میں ذرا سی چمک کی ہر متاثر نمائش کر سکے جیسا کہ ہوتا رہا ہے۔ دن ہے اور کڑاکے کی دھوپ نکلی ہوئی ہے اور واحد بالعدد کی ہستی کو

سد ذالک باب النبوۃ — اس نے نبوت کا دروازہ بند کر دیا

کہہ کر ختم کر دیا ہے اور صرف ختم نہیں بلکہ واحد بالعدد کی تلقی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے لفظوں میں ممتنع اور ناممکن ہو گی۔

امتنع ان یکون بعدہ نبی — ناممکن اور محال ہے کہ آپ کے بعد
مستقل بالتلقی ذالخیر الکثیر — کوئی مستقل نبی ہو۔

شاہ صاحب کی عبارت میں استقلال سے دھوکے میں نہ پڑ جائیے۔ یہ مطلب نہیں کہ مستقل نبی نہیں آئے گا۔ لیکن نبی کا تابع بن کر آئے گا۔ بعض کج بینوں کو یہ دھوکہ ہو چکا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وصف نبوت کا موصوف بالعرض واحد بالعدد نہ ہو گا۔

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ شاہ صاحب ہی نے فرمایا ہے

فما طائر طائر من اولی اجنحۃ	کوئی پرندہ خواہ کیسی ہی استعداد رکھتا ہو
استعدادا الا وقع فی شبکۃ	جب بھی اڑے گا تو اس کا مقام آپ ﷺ
تربیتہ جذبہ الی نفسہ	کے تربیتی جال کے سوا کوئی نہیں
کجذب المغناطیس	آپ ﷺ اسے اپنی طرف اس طرح کھینچتے
بالحدید	ہیں جیسے مقناطیس لوہے کو۔

اسی کو عرفاء کی اصطلاح میں مقام نبوت کہا جاتا ہے۔ شیخ اکبر نے المحکم المربوط میں مقام نبوت کی جو تعریف کی ہے کہ

اعلم ان مقام الدعوۃ الی	لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کا نام
اللہ ھو مقام النبوۃ	مقام نبوت ہے ۔

ختم نبوت ہوئی ہے، مقام نبوت ختم نہیں ہوا۔ بالفاظ دیگر انبیاء نہ آئیں گے انبیاء کا کام ہوگا یہ کار نبوت ہی مقام نبوت ہے شیخ اکبر ہی نے لکھا ہے کہ

وھو مقام النبوۃ والوراثۃ	یہی مقام نبوت ہے اور یہی وہ
الکاملۃ الحاصل فیہ یقال	وراثت کاملہ ہے کہ اس کے بار بردار
لہ النبی فی زمان النبوۃ و	کو زمانہ نبوت میں نبی۔ اور علماء کے
یقال لہ الشیخ والاستاذ	حق میں شیخ اور استاذ کہا جائے۔ یہ
والوارث فی حق العلماء باللہ	علماء نبوت کا کام کرتے ہیں۔ مگر
من غیر ان یکونوا انبیاء۔	نبی نہیں ہوتے ۔

بازاروں میں شور ہے کہ شیخ اکبر نے فتوحات میں ختم نبوت کا انکار کر دیا ہے مقام نبوت کی حقیقت شیخ کی زبانی آپ سن چکے ہیں اب ذرا ایک چھپتی نظر شیخ کی اس عبارت پر ڈال لیجیے جس کو اچھالا جا رہا ہے۔

ان النبوة التی انقطعت	جو نبوت حضور انور کی آمد سے ختم
بوجود رسول الله انما	ہوئی ہے وہ منصب نبوت ہے
ھی نبوة التشریع لامقامھا	نہ کہ مقام نبوت۔

فرمائیے لا مقامھا کا کیا مطلب ہے جسے میں کار نبوت کہتا ہوں۔ شیخ اسے ہی مقام نبوت کہتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک، تو اس امت کے خیر امت ہونے کی علت، ہی اس امت کا مقام نبوت پر کھڑا ہونا ہے آخر آپ

کُنتُم خَیرَ اُمَّةٍ اُخرِجَت	تم بہترین امت ہو۔ بپا کئے گئے ہو
لِلنَّاسِ تَامُرُونَ بِالمَعرُوفِ	لوگوں کے لئے حکم کرتے ہو تم
وَتَنهَونَ عَنِ المُنکَرِ۔	نیکی کا اور برائی سے روکتے ہو

کے لئے مطلب کا کون سا جامہ تراشیں گے۔

دیکھئے بات کہاں تھی اور کہاں پہنچ گئی۔ کہاں یہ مزعومہ کہ مولانا محمد قاسم ختم نبوت کے قائل نہیں اور کہاں مولانا کا یہ فکر بلند کہ ختم نبوت صرف یہی نہیں کہ اب بالفعل کوئی نبی نہیں آئے گا بلکہ نبی کے آنے کا امکان ہی نہیں ہے ایک بات ذہن میں آئی ہے وہ بھی سن لیجئے وہ یہ کہ وصف نبوت بالعرض کا موصوف بالعدد نہیں آئے گا اور نہ آسکتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود وصف ناپید ہو چکا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس وصف کا موصوف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کہیں بالعدد نہ موجود ہو سکتا ہے اور نہ ہوگا قرآن نے آپ کو خاتم النبیین کہا ہے خاتم النبوة نہیں کہا۔ نبی موصوف بوصف نبوت کو کہتے ہیں۔ وصف قائم اور موجود ہے اس کی موجودگی کی خود آیت دلیل ہے۔

مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّن	محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں
رِّجَالِکُم وَلٰکِن رَّسُولَ اللّٰہِ	میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن

وَخَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ   اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں

دلیل عقلی یہ ہے کہ موصوف بالذات اپنے وصف سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا جیسا کہ پہلے عرض کر آیا ہوں اگر واقعہ یہ ہے تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ نبوت کا موصوف ذاتی بقید حیات بھی عالم برزخ میں عنصری ہو۔ قرآن سے بھی کچھ اسی طرح کا اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ موضوع تفصیل طلب ہے میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مولانا قاسم العلوم نے صرف یہ نہیں بتایا کہ نبی نہیں آئے گا بلکہ یہ بتایا ہے کہ نبی کا آنا ممتنع اور ناممکن ہے۔

عربی زبان سے تو آپ آشنا ہیں کہ عربی میں ممتنعات، یقینیات اور مشکوکات کو جب تعبیر کرنا چاہیں تو اسالیب مختلف ہیں۔ ممتنعات کے لئے لو یقینیات کے لئے اذا اور مشکوکات کے لئے اِن آتا ہے۔

سب مانتے ہیں کہ الٰہ حقیقی کے سوا دوسرے الٰہ کا وجود ممتنع ہے اس لئے اس امتناع کو قرآن میں ان لفظوں میں ظاہر کیا گیا ہے:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔

فلاسفۂ اسلام کی اصطلاحی زبان میں جس دلیل کا نام دلیل تمانع ہے وہ اسے قرآن کی اس آیت پر منطبق کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ مجھے ان کی اس تفسیر سے اختلاف ہے۔ بہرحال عربی زبان میں لو ممتنعات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ سکاکی کی مفتاح العلوم میں ہے:-

اِنَّمَا يَتَعَلَّقُ بِمَا امْتَنَعَ بِامْتِنَاعِ غَيْرِهٖ عَلٰى سَبِيْلِ الْقَطْعِ

لیکن عربی زبان کی طرح اردو زبان میں ممتنعات کے لئے الفاظ کا کوئی خاص پیمانہ نہیں ہے۔ لفظ اگر اردو میں مشکوک اور ممتنع دونوں میں مشترک ہے۔ اردو میں جب اگر کو ممتنعات کے لئے بولیں گے تو بالفرض یا بفرض محال کا اضافہ کریں گے۔

مولانا قاسم العلوم کے خیال میں چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصف نبوت میں موصوف بالذات ہونے کی وجہ سے کسی اور نبی کا آپؐ کے بعد آنا ممتنع، محال اور ناممکن ہے۔ اس لئے اس امتناع کو ظاہر کرنے کے لئے پیرایہ تعبیر یہ اختیار کیا ہے کہ ــــ "اگر بالفرض آپؐ کے زمانے میں بھی الخ"

والسّلام علیکم ورحمتہ اللہ

بنام جناب مولوی حبیب احمد صاحب محلہ مبارک پورہ سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۲ رستمبر ۵۲ء

انکار حدیث کے فتنے کو پرویزی فتنہ کہنے کی علمی توجیہہ، یہ بات کہ وحی قرآن ہی میں محدود ہے خود قرآنی تصریحات کے خلاف ہے، نبی صاحبِ کتاب کو نہیں بلکہ صاحب وحی کو کہتے ہیں، آغاز بخاری میں آیت وحی لانے کی وجہ مصادر و مظاہرِ عمل سے وحی کا تعلق، نبی شناسی کا اخلاقی اور نوعی پیمانہ، قرآن کی رو سے قرآن کے لئے بیان کی ضرورت ہے۔ قرآنی وحی اور وحی سنت کے نزول کی صورتیں۔ امام ابو محمد الجوینی کا بصیرت افروز بیان، ممانعت کتابت کے متعلق حدیث ابو سعید کا مطلب، وحی کی تلاوت اور اتباع میں فرق۔

تلمیذی العزیز! السلام علیکم ورحمتہ اللہ

جو بات آپ نے پوچھی تھی اس کا مختصر سے مختصر جواب بھی ہو سکتا ہے مگر اجمال، اختصار اور اشارات سے بات آپ کے پلے نہ پڑے گی۔ اس لئے قدرے تفصیل ضروری ہے۔

آپ نے انکار حدیث کے فتنہ کے لئے "پرویزی فتنہ" کا عنوان خوب تجویز کیا یاد پڑتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے ۶ھ ہجری میں جب مختلف ملکوں کے سربراہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کئے تو سربراہ ایران کے نام بھی ایک دعوتی خط روانہ کیا تھا۔ اس سربراہ حکومت کا نام تاریخ میں خسرو پرویز ہے۔ حکومت کی وسعت کا حال یہ تھا کہ ایک طرف اگر ہندوستان تک علاقہ تھا تو دوسری طرف عراق عجم، شام اور روم کے قلب تک دامانِ سلطنت پھیلا ہوا تھا اور درفش کاویانی نہ صرف ایران بلکہ روم کے اکثر علاقوں پر بھی لہرا رہا تھا۔ یہ چھٹی صدی کا آغاز تھا۔ ۶۱۶ء میں رومیوں نے اگرچہ اپنا علاقہ واپس لے لیا تھا۔ مگر تاہم ایرانی حکومت

کادبدبہ ایشیاویورپ دونوں پر قائم تھا ایران کی حکومت ایشیا کی سب سے بڑی حکومت تھی اور جیسی حکومت تھی ویسی ہی دربار حکومت کی بھی شان وشوکت تھی۔ آداب شاہی کے طریق، درباریوں کے درباری لباس، شاہی باڈی گارڈ کی ہیبت سجاوٹ، شاہی باڈی گارڈ یعنی اسپ سوار جو عربی میں بگڑ کر اساورہ بن گیا۔[1]

۶۲۹ء یعنی ۷ھ ہجری میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خط روانہ کیا۔ سفارت کی ذمہ داری حضرت عبداللہ بن حذافہ کے کاندھوں پر ڈالی گئی۔ اس گرامی نامہ میں خسرو پرویز کو دعوت اسلام دی گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن حذافہ کو ہدایت کی تھی کہ اولاً خط بحرین لے جائیں اور حاکم بحرین

---

[1] بلاذری نے مسعر بن کدام کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ یوم قادسیہ میں رستم کی معیت میں چار ہزار افراد پر مشتمل ایک دستہ تھا جسے جند شہنشاہ کہتے تھے۔ اسی دستے نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو پیغام بھیجا تھا۔ کہ ہم مسلمان ہونے پر راضی ہیں بشرطیکہ ہمارے یہ حقوق گورنمنٹ تسلیم کرے۔

الف:۔ جہاں چاہیں گے ہم رہیں گے۔

ب:۔ وظائف اور حکومت کی امداد میں ہمارا حصہ ہوگا۔

ج:۔ ہم جس کو چاہیں گے اپنا حلیف بنائیں گے ——— یہ اور اس قسم کی دوسری شرطیں لکھ کر روانہ کردیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے جواباً فرمایا کہ ہو جاؤ لَکُمْ مَا لَنَا وَعَلَیْکُمْ مَا عَلَیْنَا مگر وہ اس سادے سے جواب سے مطمئن نہ ہوئے حضرت ابوموسیٰ اشعری نے مرکزی گورنمنٹ سے استصواب کیا۔ مرکز کی جانب سے ہدایات پہنچیں، کہ جس قیمت پر مسلمان ہوں کر لو۔ اولاً بصرہ میں آباد ہوئے اور ان کی آبادکاری کے لئے جگہ مقرر ہوئی۔ یہاں انہوں نے ایک نہر کھودی اسی نہر کو نہر اساورہ کہتے ہیں۔ بعد ازیں یہی اساورہ کچھ عرصہ بعد کوفہ میں آباد ہوئے داتوا الکوفۃ واقاموا بھا ص۲۸۹ ان کی کہانی بڑی طویل ہے۔ اساورہ یا جند شاہنشاہ دونوں ایک ہیں اور ایران کا شاہی باڈی گارڈ ہے۔

مسلک اعتزال کا شجرہ علمی میری تحقیق میں ان ہی سے ملتا ہے۔

کے توسط سے خسرو تک پہنچائیں۔ آپ ہدایت کے مطابق بحرین پہنچے اور حاکم بحرین کے
توسط سے آپ کی پرویز کے دربار تک رسائی ہوئی خط دربار میں ترجمان کے ذریعے
پڑھوایا گیا۔ خط سنانا مقصود نہیں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ خط جناب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے اپنی جانب سے لکھوایا تھا۔ سارے خط میں نہ قرآن کا ذکر تھا نہ وحی کا۔
یہ آپؐ کا ذاتی مکتوب تھا۔ خط کے آخری فقرے سُن لیجئے۔

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ	میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ سبحانہ کے سوا
وَاِنِّیْ رَسُوْلُ اللہِ اِلَی النَّاسِ	الٰہ کوئی نہیں ہے اور میں سب انسانوں
کافۃ لینذر مَنْ کَانَ حَیًّا	کی طرف اللہ کا فرستادہ ہوں۔ زندوں کو
اسلم تسلم فان ابیت	آگاہ کرنے آیا ہوں۔ مسلمان ہو جا،
فَعَلَیْکَ اِثْمُ الْمَجُوْسِ۔	نجات پائے گا۔ نہیں مانے گا تو مجوسیوں
(طبقات)	کا بوجھ بھی تیری گردن پر ہوگا۔

خسرو پرویز نے گرامی نامہ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ تاریخ میں لکھی ہوئی بات ہے
کہ پرویز نے طیش میں آکر گرامی نامہ کو پرزے پرزے کر دیا۔ یہ قرآن نہ تھا۔ بلکہ ارشادِ
نبوت پر مشتمل گرامی نامہ تھا جس کے پرزے پرزے ہوئے۔ وہ ارشادِ نبوت یعنی حدیث تھی
اللہ اکبر! عالم وجود میں سب سے پہلے جس نے ارشادِ نبوت کو پارہ پارہ کیا۔ اور
پائے استحقار سے ٹھکرایا پرویز ہے۔ اور آج تاریخ کی مختلف کروٹوں کے بعد جو ارشادِ
نبوت کے تقدس، عظمت اور اس کی محبت کو اپنے زور قلم سے پارہ پارہ کر رہا ہے۔ اس
کا نام بھی پرویز ہے۔ کتنی شاندار مطابقت ہے اور وقت کا کیسا بہترین توارد ہے
آپ نے فتنہ پرویزی کا عنوان بول کر تاریخ کی مستور صداقت کو شاہراہ عام پر لانے
کا فرض انجام دیا۔ یہ بھی سن لیجئے کہ گرامی نامہ کے چاک کرنے کی اطلاع جب دربار نبوت
میں پہنچی تو یہاں رد عمل کیا تھا۔ امام بخاریؒ نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے

ابن عباس کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ کو خط روانہ کیا۔

کسریٰ نے پڑھ کر چاک کر دیا آپؐ نے دعا کی کہ خدا ان کو چکنا چور کر دے

اگر یہ واقعہ جوش اور مسرت سے ڈوبا ہوا دیکھنا چاہتے ہو تو مولانا نظامی کی شیریں خسرو پڑھو۔ مولانا نے دو جگہ واقعہ کو تفصیل اور جذبہ اسلامی کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہ تو آپ کے تجویز کردہ عنوان کی تقریب ہوئی۔

یہ بات کہ حجت تو صرف قرآن ہے کیونکہ وہ اللہ سبحانہ کی وحی ہے۔ ایک بنیادی غلط فہمی کی وجہ سے کہی گئی ہے۔ غلط فہمی یہ ہو گئی ہے کہ وحی صرف قرآن ہے۔ اور قرآن کے باہر جو کچھ ہے وہ اللہ کی وحی نہیں ہے حالانکہ یہ نظریہ خود قرآن کی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن حکیم نے خود انسان کے اللہ سبحانہ سے ہم کلام ہونے کی جو صورتیں بیان کی ہیں یہ ہیں:۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ۔	اور کسی آدمی کی طاقت نہیں ہے کہ اس سے اللہ بات کرے مگر اشارے سے یا پردے کے پیچھے سے یا بھیجے کوئی پیغام رساں بس وحی کرے وہ خدا سے جو خدا چاہے۔

یعنی کوئی انسان اپنی عنصری ساخت اور موجودہ قوتوں کے لحاظ سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اللہ سبحانہ اس دنیا میں اس کے سامنے ہو کر بالمشافہ کلام کرے اور وہ اسے برداشت کر سکے کسی انسان سے اس کے ہم کلام ہونے کی تین صورتیں ہیں۔

الف:۔ بلا واسطہ پردے کے پیچھے سے کلام فرمائے یعنی نبی کی قوت سامعہ کلام الٰہی کی شنید سے لذت اندوز ہو مگر آنکھ دیدار سے متمتع نہ ہو جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ الاسراء کو پیش آیا — یہ من وراء حجاب ہے۔

ب :- بواسطہ فرشتہ حق سبحانہ نبی سے کلام فرمائے مگر فرشتہ آنکھوں کے سامنے نہ ہو بلکہ براہ راست قلب پیغمبر پر نزول کرے اور ذات نبیؐ کا قلب ہی اس کا ادراک کرے حواس ظاہرہ کو اس میں کوئی دخل نہ ہو۔ میرے خیال میں یہ صورت ہے جیسے حدیث عائشہؓ میں یاتینی مثل صلصلۃ الجرس سے تعبیر فرمایا ہے اسی کو ھو اشدہ علی فرمایا ہے۔ قرآنی وحی اسی صورت میں آئی ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ	لیکر اترا ہے اس کو معتبر فرشتہ تیرے دل پر۔

اور

فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ۔	یقیناً اتارا اس کو تیرے دل پر اللہ کے حکم سے۔

میں اسی طرف اشارہ ہے۔ یہی صورت اس آیت وَيُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ میں بیان کی گئی ہے۔

ج :- تیسری صورت کو قرآن نے وحی ہی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ لغت میں وحی کے معنے اشارہ خفی کے آتے ہیں اس لئے اس میں خواب، دل میں بات کا ڈالنا، الہام وغیرہ سب داخل ہیں۔ چونکہ یہ صورت پوشیدہ طور پر اندر ہی اندر ہوتی ہے ذات نبوت سے باہر کسی چیز کی نمود نہیں ہوتی اس لئے اس قسم کو وحی کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

قرآن کا نزول دوسری صورت میں ہوا ہے قرآن سے باہر قرآن ہی کی بیان فرمودہ وحی کی دو صورتیں اور بھی موجود ہیں اس لئے یہ کہنا سر تا سر غلط اور خود قرآن ہی کے خلاف ہے کہ قرآن سے باہر وحی کا کوئی وجود نہیں ہے اور اس انداز فکر کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہے کہ نبی کی تعریف خود قرآن نے جو بیان کی ہے وہ غلط ہو کر رہ جائے یعنی

قرآن کی زبان میں نبی صاحب وحی کو کہتے ہیں اور اس نظریہ کی بنیاد پر نبی صاحب وحی کو نہیں بلکہ صاحب کتاب کو کہتے ہیں۔ کیونکہ یہاں کتاب سے باہر وحی کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ بخاری شریف میں حضرت امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری نے بدء وحی کے تذکرے میں جو یہ قرآنی آیت تمام آیات قرآنیہ میں سے منتخب کر کے درج فرمائی ہے:-

اِنَّا اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ كَمَا اَوْحَیْنَا اِلٰی نُوْحٍ ۔ بلا شبہ ہم نے وحی کی تمہارے طرف جیساکہ ہم نے وحی کی حضرت نوح کیطرف

تو اس سے امام بخاری اپنے مخاطبوں کے ذہن و دماغ میں یہ اور صرف یہ اتارنا چاہتے ہیں کہ نبی وہ شخص ہوتا ہے جس پر اللہ سبحانہ کی وحی آئے عنوان میں بدء الوحی کے ساتھ الیٰ رسول اللہ کے اضافہ سے نبوت کی تعریف کی ہے اور تعریف کو مدلل کرنے کے لئے آیات وحی میں سے سورہ مائدہ کی آیت بالا کو لائے ہیں اور صرف اتنی بات نہیں بلکہ آیت کے انتخاب سے یہ بھی جتانا مقصود ہے کہ انبیاء دو طرح کے ہوتے ہیں موسسین اور مجددین۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تعلق قسم اول سے ہے۔ نبوت کی تعریف کے بعد ضرورت نبوت بتانے کے لئے مشہور حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ لائے ہیں۔ سمجھایا ہے کہ اقدار ہوں یا اخلاق، اعمال ہوں یا اقوال ان کی قدر و قیمت کا دار و مدار دو چیزیں ہیں ایک روح اور دوسری ڈھانچہ۔

روح عمل کو مصدر اور صورت عمل کو مظہر کہتے ہیں۔[1] اقدار، اخلاق، اعمال اور

---

[1] یہ میری ذاتی رائے نہیں بلکہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب میں بھی اسی قسم کی تصریح فرمائی ہے قاسم العلوم کے نام سے جو آپ کے مکاتیب ۱۲۹۲ھ میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں رقم طراز ہیں۔-

اعمال را دو بد و سواست یکے نیت و مبادی آں کہ آں را مصدر، دوم ہیکہ و ہوبت کہ مظہر آں تواں خواند۔ (رسالہ عصمت انبیاء صفحہ ۵)

اقوال کا کوئی پیمانہ اللہ سبحانہ کے یہاں پذیرائی نہیں جب تک ان کے مصادر اللہ کی رضا اور مظاہر اللہ کی وحی سے وابستہ نہ ہوں اور یہ بات نبوت کی راہنمائی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہاں معاً یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ بات تو مان لی گئی کہ نبی وہ ہے جو صاحب وحی ہو۔ لیکن خود وحی کیا ہے؟ امام بخاری اس سوال کا جواب دینے کے لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی وہ مشہور حدیث لائے جس میں وحی آنے کی صورتیں بتائی گئی ہیں اور حدیث لاکر بتا دیا کہ ایک معلوماتی ذریعہ ہے لیکن یہ معلوماتی ذریعہ ہمارے ادراک کی دسترس سے باہر ہے۔ ہم کچھ جان سکتے ہیں تو وہ وحی نہیں بلکہ وحی کی آمدی کیفیت ہے اور وہ بھی تمثیل کے درجے ہیں۔ یہ اللہ کی دین ہے محنت و ریاضت سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے بعد نبی شناسی کا اخلاقی اور نوعی پیمانہ بتانے ویئے حضرت عائشہ رضؓ ہی کی غار حرا والی حدیث اور شخصی پیمانہ بتانے کیلئے دربار ہرقل کی لمبی داستان لاکر کتاب کے دیباچے کو ختم کیا ہے۔ درمیان میں یہ جتانے کے لئے کہ نبی بننے میں خود نبی کی ریاضت کو دخل نہیں ہوتا حضرت ابن عباس کی حدیث لے کر آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی آنا اور وحی کے ذریعے نبی بننا تو بڑی بات ہے نبوت ملنے اور وحی آنے کے بعد خود وحی کو اپنی قوت سے حافظہ میں محفوظ رکھنا بھی نبی کی دسترس سے باہر ہے

ارادۂ قلم کو روک روک کر لکھ رہا ہوں خط کا محدود دائرہ تفصیل سے مانع ہے ورنہ جی چاہتا ہے کہ سینہ بخاری سے ابلی ہوئی علمی طاقت کو ان سینہ چاک دریوزہ گروں کے سامنے رکھوں جو ادب سے محروم اپنی خلوتوں میں حضرت امام پر زبان درازیاں کرتے رہتے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ ارشادات نبوت کی نگرانی میں ان کی جلالت شان کیا ہے

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن کی زبان میں نبی صاحب وحی کو کہتے ہیں۔ اور قرآن

سے یا ہر وحی کو نہ مان کر نبی صاحب کتاب کو کہنا پڑتا ہے اور یہ قرآن کی صریح مخالفت ہے۔ آپ خود غور کرلیں قرآن ہی کے ذریعے ذرا اس معیار کو پرکھئے آپ کو پتہ لگ جائے گا کہ قرآن سے کتنی دوری ہو رہی ہے مثلاً قرآن ہی میں خود قرآن کے متعلق اللہ سبحانہ کا ارشاد گرامی ہے

اِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ۔	جب ہم پڑھیں تو ساتھ رہ تو اس کے پڑھنے کے پھر بلاشبہ ہمارے ذمہ ہے اس کا کھول دینا۔
(سورہ القیامۃ پارہ ۲۹)	

یہاں قرآن کا دعوےٰ یہ ہے کہ نزول قرآن کے بعد قرآن کا بیان اللہ سبحانہ کے ذمہ ہے اگر قرآن کا یہ بیان خود قرآن سے علیحدہ چیز ہے اور یقیناً ہے کیونکہ اگر قرآن ہی کو قرآن کا بیان بتایا جائے تو پھر اس کے لئے بھی قرآن ہونے کی وجہ سے بیان کی ضرورت ہوگی اور یہ سلسلہ لامتناہی ہو جائے۔ ماننا پڑے گا کہ قرآن کے لئے بیان قرآن سے الگ ہے۔ اگر یہ بیان قرآن سے الگ ہے تو یہ حسب وعدۂ الٰہی عَلَیْنَا بَیَانَہ اللہ سبحانہ کی جانب سے ہے اور بذریعہ وحی ہے لہٰذا اللہ سبحانہ کی جانب سے بتصریح قرآن ایسی وحی کا آنا ثابت ہے جو قرآن کے علاوہ ہے۔ یہ وحی جس کے ذریعے قرآن کا بیان عمل میں آیا ہے کونسی ہے۔ اور قرآن کی بیان کردہ کلام الٰہی کی صورتوں میں کونسی صورت ہے، اس کا حل بلا کسی تشویش کے ہر شخص معلوم کر لے سکتا ہے۔ یقیناً یہ کلام الٰہی کی وہ صورت نہیں ہے جس میں نزول قرآن ہوا ہے اور نہ وہ صورت ہے جسے قرآن نے مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ کہا ہے اگر ہے تو صرف تیسری صورت ہے جسے قرآن نے اِلَّا وَحْیًا کہہ کر پکارا ہے جس میں نفث فی الروع رویائے صادقہ اور الہام سب داخل ہیں اور اس صورت میں جو چیز قرآن کا بیان بن کر نازل ہوئی ہے وہ ذات نبوت کا اخلاقی، قولی، فعلی اور مجلسی زندگی کا

وہ پیمانہ ہے جسے قرآن الحکمۃ اور مورخین السنۃ کہتے ہیں تاریخ کی بے لاگ علالت سامنے ہے حدیث پر تاریخ کا لفظ میں نے ارادۃً بولا ہے کیونکہ حدیث کی یہ حیثیت تو سب میں مسلم ہے۔ اس کا فیصلہ ہے کہ

كَانَ الْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَحْضُرُهُ جِبْرِيْلُ بِالسُّنَّةِ الَّتِيْ تُفَسِّرُ ذَالِكَ۔	حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تھی اور حضرت جبریل وہ سنت بھی لے کر تشریف لاتے تھے جو اللہ کی وحی کی تفسیر کرتی تھی۔

حضرت امام شافعیؒ المتوفی ۲۰۴ھ نے الرسالۃ میں اب نہیں بلکہ اب سے بارہ سو سال پہلے ہی بتا دیا نہ صرف یہ کہ السنۃ قرآن کا بیان ہے اور یہ بیان بھی اللہ سبحانہ کی جانب سے بذریعہ وحی آیا ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ قرآن کی بیان کردہ تین صورتوں میں سے جس صورت میں اس بیان کا نزول ہوا ہے وہ وہی ہے۔ جسے قرآن نے وَحْيًا کہا ہے اور جس میں نفث فی الروع، الہام وغیرہ داخل ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

القی فی روعہ کل ما سن وسنۃ الحکمۃ الذی القی فی روعہ عن اللہ تعالی فکان مما القی فی روعہ سنتہ۔ ۱۰۴	تمام سنتوں کا آپؐ کو القا کیا گیا۔ سنت ہی حکمت ہے اور یہی اللہ کی جانب سے آپؐ پر القا کی گئی ہے اس لئے سنت اللہ کا القائی فرمان ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی سمجھ لیجئے کہ اس آیت اِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ۔ میں اللہ سبحانہ نے قرآن کے پڑھنے کو اپنا پڑھنا اور قرآن کے بیان کو اپنا بیان بتایا ہے قرآنہ اور بیانہ کے لفظوں پر غور کرو مگر قرآن ہی کی دوسری آیات میں جس طرح قرآن کے پڑھنے کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت

کیا ہے :-

قُرْآناً فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ ۔ اور پڑھنے کی چیز۔ جدا کیا ہم نے اس کو تاکہ تم پڑھو لوگوں کے سامنے بتدریج

ایسے ہی قرآن کے بیان کو بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام بتایا ہے ۔

أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ۔ اتارا ہم نے تمہاری طرف الذکر تاکہ تم بیان کرو لوگوں کے سامنے اس کو جو اتارا گیا ہے

آیت میں لِلنَّاسِ اور مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ لاکر بتادیا ہے کہ کتاب کے ساتھ نبوت آنے کی ضرورت ہی اس لئے درپیش آتی ہے کہ نبوت کے اقدار، افعال، اقوال اور اخلاق کے ذریعے لوگوں کے سامنے کتاب الٰہی کا منشا واضح اور صاف ہو کر آجائے اور یہی بیان ہے ۔ بات تشنہ رہ جائے گی اگر ہم یہاں امام الحرمین کے والد محترم ابو محمد عبداللہ بن یوسف الجوینی المتوفی ۴۳۸ھ کے اس بیان کو نظر انداز کر جائیں جسے علامہ جلال الدین السیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے الاتقان فی علوم القرآن میں نقل کیا ہے فرماتے ہیں :-

اللہ سبحانہ کی جانب سے نازل شدہ کلام کی دو قسمیں ہیں ایک قسم وہ ہے جس میں اللہ سبحانہ نے جبریل سے فرمایا کہ پیغمبر سے کہدو کہ اللہ سبحانہ کا یہ ارشاد ہے ارشاد ربانی کو جبریل سمجھتا ہے اور پیغمبر کو آکر بتادیتا ہے اس قسم میں الفاظ الٰہی نہیں ہوتے بلکہ مراد الٰہی ہوتی ہے ۔ عبارت کا پیمانہ جبریل کا ہوتا ہے ۔ مگر روایت باللفظ نہیں ہوتی ۔ دوسری قسم وہ ہے کہ اللہ سبحانہ جبریل سے فرمائیں کہ یہ خط نبی کو پڑھ کر سنادو جبریل آئیں اور بعینہ خط پڑھ کر سنا جائیں

یہ روایت باللفظ ہے۔ دوسری قسم کی وحی قرآن ہے اور پہلی قسم کی سنت ہے

احادیث میں روایت بالمعنے کے جواز کا سرچشمہ بھی یہی ہے کیونکہ

جبریل نے سنت کی وحی روایت بالمعنے ہی میں کی ہے لیکن قرآن میں

روایت بالمعنے ناجائز ہے کیونکہ اس کی وحی باللفظ ہوئی ہے بظاہر

دونوں وحیوں میں اس فرق کو قائم کرنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن

کی وحی میں صرف احکام کا اخبار مقصود نہیں بلکہ اس کے ساتھ الفاظ کا

تعبد اور تعبیر و اسلوب کا اعجاز بھی منشاء ربانی ہے برخلاف سنت

کے کہ اس میں صرف اخبار احکام مقصود ہے نہ لفظوں میں تعبد ہے اور

نہ اسلوب اعجازی ہے۔ ص۱۹۱ ج ۱

ابو محمد جوینی کے اس بیان سے صحیح مسلم کی اس حدیث کا بھی منشاء صاف ہو گیا۔

جس میں حدیث لکھنے کی زمانہ نزول قرآن میں ممانعت ہے۔

عَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ	ابو سعید خدری رضؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ
اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھ
عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَکْتُبُوْا	سے قرآن کے سوا نہ لکھو جس شخص
عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْاٰنِ۔ مَنْ	نے قرآن کے سوا لکھا ہے وہ اسے
کَتَبَ عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْاٰنِ	مٹا دے۔ مجھ سے حدیث بیان کیا
فَلْیَمْحُہٗ وَحَدِّثُوْا عَنِّیْ وَ	کرو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے
لَا حَرَجَ وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ	جو شخص مجھ پر بالارادہ جھوٹ
مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ	بولے گا اسے اپنا ٹھکانا جہنم بنا
مِنَ النَّارِ۔ ص۴۱۴ ج ۲	لینا چاہئے۔

حدیث کی زبانی روایت کرنے کی اجازت نامہ کے ساتھ ممانعت کا کہ قرآن کے

سوا میرے سے کچھ نہ لکھو۔ اس کا سوائے اس کے منشا کیا ہے کہ قرآن کے الفاظ میں تعبد ہے۔ قرآن سے الگ ہو کر کوئی وحی نہیں ہے جس کے لفظوں میں تعبد ہو اور تعبدی طور پر جس کی تلاوت کی جاتی ہو۔ خود انداز بیان بھی اس کی گواہی دے رہا ہے یہی تو فرمایا ہے کہ لا تکتبوا عنی غیر القرآن لفظ غیر عربی اسالیب میں اپنا موصوف چاہتا ہے اس لئے عبارت یوں ہے لَا تَكْتُبُوا عَنِّي قرآناً غير القرآن مطلب صاف ہے کہ میرے سے پڑھنے کی کوئی ایسی چیز جس کے لفظوں میں تعبد ہو قرآن کے سوا مت لکھو آخر قرآن ہی میں مَنْ يَّتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ آیا ہے اور اس کا مطلب صاف یہی ہے کہ مَنْ يَّتَّبِعْ سَبِيْلاً غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ ارشاد میں قرآن کے تعبد پر زور دیا جا رہا ہے اور ارشاد نبوت کا منشاء بالکل واضح ہو جاتا ہے جب ہم حضرت ابو سعیدؓ کے اس بیان تک پہنچتے ہیں جو حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم کے صـ۳۲ پر نقل کیا ہے۔

عن ابی نضرۃ قال قلت لابی سعید الخدری الا تکتب ما نسمع منک قال تریدون ان تجعلوھا مصاحف ان نبیکم صلعم کان یحدثنا فنحفظ فاحفظوا کما کنا نحفظ۔	ابو نضرہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو سعید سے کہا کہ اجازت ہو تو آپ سے سنی ہوئی باتیں لکھ لیا کروں فرمایا کہ تم مصاحف بنانا چاہتے ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے حدیث بیان کرتے تھے ہم یاد رکھتے تھے تم بھی یاد رکھو جیسے ہم یاد رکھتے تھے

حفظ روایت کے تقاضے کے ساتھ کتابت سے ممانعت میں جو روح کام کر رہی ہے وہ وہی ہے جس کی طرف امام جوینی نے اشارہ کیا ہے کہ یہاں لفظوں میں تعبد نہیں ہے یہ مصحف ہی ہے جس کے الفاظ میں تعبد ہونے کی وجہ سے بار بار

تلاوت کا حکم ہے ـــــ بات میں سے بات نکل رہی ہے قرآن میں عموماً وحی کے متعلق دو ہی قسم کے حکم ہیں اتباع اور تلاوت ۔ مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ خود قرآن نے ان دونوں میں ایک جوہری فرق قائم رکھا ہے ۔ قرآن میں جہاں بھی اللہ سبحانہٗ نے وحی کی تلاوت کا حکم دیا ہے اس کے ساتھ کتاب کی قید کا ضرور اضافہ کیا ہے ۔ مثلاً

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ	تلاوت کرو اس چیز کی جو وحی کی گئی ہے تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی کتاب سے

اور

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتَابِ	تلاوت کرو اس چیز کی جو وحی کی گئی ہے تمہاری طرف کتاب سے ۔

وغیرہ وغیرہ

لیکن قرآن ہی میں جہاں وحی کی اتباع کا حکم آیا ہے ان آیات میں لفظ کتاب کو ہٹا دیا گیا ہے ۔ مثلاً

اِتَّبِعْ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ۔	اتباع کرو اس چیز کی جو وحی کی گئی ہے تمہاری طرف پروردگار کی جانب سے

اور

وَاتَّبِعْ مَا یُوْحٰی اِلَیْکَ	اتباع کرو اس چیز کی جو تمہاری طرف وحی کی جاتی ہے ۔

اور

وَاتَّبِعْ مَا یُوْحٰی اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ۔	اتباع کرو اس چیز کی جو وحی کی جاتی ہے تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی جانب سے

اور

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ — نہیں اتباع کرتا مگر اس چیز کی جو وحی کی جاتی ہے میری طرف میرے پروردگار کی جانب سے۔

اور

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَکُمْ اِنِّیْ مَلَکٌ۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ۔ — کہہ دو میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور میں غیب داں نہیں ہوں اور میں تم سے کہتا کہ میں فرشتہ ہوں۔ نہیں پیروی کرتا مگر اس چیز کی جو وحی کی جاتی ہے میری طرف۔

یہ اور اس قسم کی ان گنت آیات ہیں جہاں وحی کی اتباع کا تذکرہ کیا ہے۔ وہاں لفظ کتاب نہیں لایا گیا ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں جہاں تک قرآن کا میں نے مطالعہ کیا ہے مجھے تو اس میں بہت گہری معنویت محسوس ہوئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ صاحب وحی کا منشا اس محسوس فرق کو قائم کر کے صرف یہ بتانا نہیں بلکہ جتانا ہے کہ:۔

الف:۔ وحی جو ذات نبوت پر آئی ہے وہ صرف کتاب ہی میں محدود نہیں ہے۔ بلکہ کتاب سے باہر بھی وحی ہے۔

ب:۔ کتابی وحی کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اس کے لفظوں میں تعبد اور تعبیر میں اعجاز ہے۔ غیر کتابی وحی کی تلاوت نہیں بلکہ اتباع کی جاتی ہے۔

تلاوت خاص ہے کتابی وحی کے لئے اتباع کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں کتابی اور غیر کتابی کی تخصیص نہیں ہے۔ اس لئے اتباع وحی کے موقعہ پر کلام سے کتاب کی قید کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور چونکہ اتباعِ وحی کا دائرہ وسیع ہے۔ اسی لئے

جب اتباع کے مطالبہ پر وحی کی جگہ ذاتِ نبوت کو لائے اور ذات نبوت کی اتباع کا اللہ سبحانہ نے مطالبہ کیا۔ تو وہاں بھی ذاتِ نبوت کو بلاقید ہی اتباع کے فعل کا مفعول بنا کر لائے ہیں۔ مثلاً:۔

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ	اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو
فَاتَّبِعُوْنِيْ ۔	میری اتباع کرو۔

اس آیت میں یائے متکلم سے ذاتِ نبوت یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ اللہ سبحانہ بلا قید آپؐ کی اتباع کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ قرآنی وحی کے دائرے تک تو آپؐ ایک محدود اور خاص ہی حیثیت کے مالک ہیں۔ مگر اس کے باوجود فِيْمَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مِنَ الْكِتَابِ یا فِيْمَا اُنْزِلَ اِلَيَّ مِنْ كِتَابِ رَبِّيْ کی یہاں کوئی قید نہیں ہے۔ اگر ذاتِ نبوت کسی درجے میں بھی ناقابل اتباع ہوتی تو مطلق اتباع کا حکم نہ آتا یہاں کوئی قید ضرور ہوتی۔ بلکہ میں تو ترقی کر کے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی زبان میں کہتا ہوں کہ اگر آپؐ کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی معاذ اللہ رضائے الٰہی کے پیمانے پر پورا نہ ہوتا تو اتباع کا بلاقید حکم نہ آتا۔ قرآن نے تو آپؐ کو بلاقید مرتضٰی قرار دیا ہے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ	دانائے غیب نہیں مطلع کرتا اپنے
عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ	غیب پر کسی کو مگر اس شخص کو
ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ ۔	جو مرتضٰی ہو رسول سے۔

صرف ارتضٰی فرمایا ہے فی الاعمال یا فی الاخلاق کی کوئی قید نہیں لگائی ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذات نبوت اخلاق، اعمال، احوال اور عقائد میں مرتضٰی ہے چونکہ ہر گوشہ میں مرتضٰی ہے اس لئے بلاقید اتباع کا حکم ہوا ہے اور بلاقید اتباع کا حکم دلیل ہے اس بات کی کہ وحی صرف کتاب ہی میں محدود نہیں ہے

بلکہ قرآن سے باہر بھی وحی ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

بنام :—

مسٹر محمد اشرف ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈسکہ ضلع سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۹ ستمبر ۱۹۵۳ء

سالار نبوت کی زندگی کا نام اسلام ہے، صرف ارشاد قولی بگڑی ہوئی قوموں کے لئے اکسیر نہیں ہے، نبوت کا دو ٹوک فیصلہ، دعوت کا کام اوپر سے نیچے شروع ہوتا ہے، رسالت محمدیہ اجتماعی بعثت کی حامل ہے، دعوت کے میدان میں امت محمدیہ کے فرائض۔

اخی المکرم! وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ السلام علیکم

جی چاہتا ہے کہ آپ سے ملاقات ہو۔ بہت سوچ و بچار کے بعد یہ تدابیر سوجھی ہے کہ خط کو ہی ملاقات کا بہانہ بنا یا جائے۔

اگرچہ آپ سامنے نہیں ہیں اور آپ ہی پہ کیا موقوف ہے اس وقت کمرے کی دیواروں کے سوا سامنے کوئی نہیں تصور کی دنیا میں غرق ہوں لیکن کبھی کبھی کان میں "سب اچھا" کی آواز آتی ہے تو چونک جاتا ہوں۔ اللہ اکبر جیل کے نگران جیل کی نگرانی کرتے ہیں۔ خود جاگتے ہیں اور ساری رات سب اچھا سب اچھا کہہ کر دوسروں کو بیدار رکھتے ہیں۔ مگر آہ اسلام کے نگران سو رہے ہیں۔ اسلام کے قیدی دیواریں پھاند رہے ہیں۔ دن رات قانون کی شکست و ریخت میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر روکنے والا کوئی نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ سالار نبوت نے چالیس سالہ عمر میں مکہ والوں کے سامنے جس دعوت کو پیش کیا۔ اور تیرہ سال تک لگاتار جس کی راہ میں کشمکش، جدوجہد، مصیبت تکلیف، پریشانی، رادہ تید، فاقہ اور جلاوطنی کے مرحلوں سے گذرے۔

تیرہ سال کی جانکاہ کوشش کے بعد مدینے میں ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کیا دس برس تک خود اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر سی مدت میں بیر

شعبہ حکومت میں ہی نہیں بلکہ زندگی کی ہر شاخ میں صرف تخیل نہیں۔ بلکہ پائیدار ٹھوس انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اصول بتائے۔ اور ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کرکے زندگی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں لوگ اس کے نتائج محسوس شکل میں دیکھنے لگے۔

اس زندگی کا نام اسلام ہے اگر آپ چاہیں کہ اس زندگی سے الگ ہو کر اسلام کو جانیں اور سمجھیں تو بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ صرف جان نہیں سکتے بلکہ اسلام کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور اس سے جدا ہو کر آپؐ کے بارے میں جو کچھ بھی سوچیں گے۔ وہ اسلام نہ ہوگا پتہ نہیں کہ لوگ یہ موٹی سی بات کیوں نہیں سمجھتے آخر خود قرآن ہی میں یہ جو فرمایا ہے کہ:-

اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا — ہم نے تمہاری طرف ایک واضح روشنی اتاری

اور دوسری جگہ ہے:-

قَدْ جَاءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّ کِتَابٌ مُّبِیْنٌ — تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آئی۔

تو اس سے یہی تو بتایا ہے کہ قرآن اور حامل قرآن دونوں نور ہیں۔ دعوت قرآنی کا کوئی تصور نبوت کی زندگی سے الگ ہو کر اسلام نہیں ہے آفتاب سے اگر آفتاب کی دھوپ کو آپ جدا نہیں کر سکتے تو قرآن سے نبوت کی عملی زندگی کو علیحدہ کیسے کر سکتے ہیں؟

اُف اس سلسلے میں آخر قرآن اور کیا کہتا۔ پیغمبر خدا کی محسوس اور مرئی زندگی سے الگ ہو کر اسلام سمجھنے اور جاننے کا نہ کبھی شبہ پیدا ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن کے نظریات اور مطالبات کی عمل کی دنیا میں چونکہ انتہا اس ذات

پیغمبر پر ہوئی تھی۔ جن کا منصب اَلرَّسُوْلُ اور اَلنَّبِیُّ تھا۔ اس لئے دماغوں میں ایسے شبہ کی گنجائش ہی کہاں ہوتی اور کیسے ہوتی؛ زیادہ سے زیادہ یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ پیغمبر کا کام لوگوں کو تعلیم دینا ہے اس لئے یہ معلم ہے اور معلم کے لئے ضروری نہیں ہے کہ اس کے کردار اور اعمال کو بھی اپنایا جائے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ کہتا کیا ہے اور بس۔ لیکن قرآن ہی نے یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیَاتِنَا کے ساتھ وَیُزَکِّیْکُمْ کا اضافہ کر کے ایا تک۔ اس دروازے کو بند کر دیا۔ آخر جب اَلرَّسُوْلُ کا مقام اتنا بلند ہے کہ

مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی — **وہ خواہش سے نہیں بولتا**

تو پھر سلسلۂ کائنات کی کونسی ہستی اس کی مستحق رہ جاتی ہے جس کا عمل انسانی زندگی کے لئے نشانِ راہ کا کام دے سکے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک پوچھنے والے کو مخاطب کر کے کتنی صحیح بات فرمائی تھی۔

اما قرأت القراٰن — کیا تو نے قرآن نہیں پڑھا؛

قَالَ نَعَمْ قَالَتْ فَذٰلِکَ خلقہ — اس نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ قرآن

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ — ہی آپ کے اخلاق ہیں۔

صرف ارشاد قولی بگڑی ہوئی قوموں اور امتوں کے لئے اکسیر نہیں ہے جب تک اس کی ہمرکابی میں عمل کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نہ ہو۔ الٰہی ارشادات کیلئے عمل ہی کے سمندر کا نام سنت یا اعمالِ نبوت ہے۔ اعمال نبوت کا اتباع ہی دراصل قرآن کا اتباع ہے ـــ شاید اسی تعبیر میں یہ برابری رکھی گئی ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ — پیروی کرو اس چیز کی جو نازل کی گئی

مِّنْ رَّبِّکُمْ۔ — تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی

اور — طرف سے

إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ — اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری
فَاتَّبِعُوْنِیْ — پیروی کرو۔

یعنی قرآن کی پیروی نبوت کے کردار سے الگ ہو کر پیروی نہیں ہے اسی کا نام اسلام ہے۔ اس کی پوری عمارت یگانہ خدا کی الوہیت کے نظریہ پر قائم ہے اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہَ اسی کی ترجمانی ہے۔ ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی جماعت اور اسلامی اسٹیٹ کے بننے تک اس زندگی نے جس قدر مرحلے طے کئے ہیں۔ ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری اور مستند تفصیلات ملتی ہیں شاید آپ نے کبھی نہ سوچا ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت اسلام کے داعی بن کر آئے عرب میں وہ مسائل موجود تھے۔ جن سے آج دنیا والے دست و گریباں ہیں، ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، معاشی بدحالی، طوائف الملوکی اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ یمن اور عرب کے ساحلی علاقے اور عراق کا زرخیز صوبہ ایرانی اقتدار کے زیر نگیں، شمال میں رومی تسلط حجاز تک پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گڑھ قائم تھے اور عرب ان کی سود خواری کا نشانہ تھے، مشرقی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو فتح مکہ کی خاطر چند سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی ان سب حالات کی موجودگی میں اور ان پیش پا افتادہ مسائل کے ہوتے ہوئے سرآمد رسالت نے بغیر تمہیدی کارروائی کے لوگوں کے سامنے دعوت نبوت پیش کی اور الف سے یا تک زندگی کے سارے گوشوں کے لئے وہ رنگ و روغن فراہم کیا کہ دیکھنے والے آج تک اس کے نشانات دیکھ رہے ہیں۔

یگانے تو یگانے ان حق پوش بیگانوں نے بھی مانا ہے جنہیں رسالت کی ہر بڑی بات کو چھوٹی ثابت کرنے کا معصومانہ کمال حاصل ہے یعنی جرجی زیدان

جیسا مشہور عیسائی مورخ باوجود اس خوش فہمی کے کہ

انبجت رجالاً نبغوا فی	ایسے لوگ رونما ہوگئے جن میں
السیادۃ والقیادۃ وکانوا	قیادت کی صلاحیتیں تھیں۔ بس اسلام
من اھم العوامل تاثیراً	کے تیزی سے پھیلنے کا یہی لوگ
فی سرعۃ نشر الاسلام۔	سبب بنے۔

(التمدن)

یعنی رسالت اپنے اصول کی قوت اور گفتار و کردار کی خوبیوں سے نہیں بلکہ اشخاص کے سہارے دنیا میں پھیل گئی۔ اضطراراً اس کا قلم بھی دعوت کے متعلق اس اقرار پر مجبور ہوگیا۔

انما قام بھا عن صدق	آپ کی دعوت کی بنیاد راستی اور
واخلاص۔ (التمدن صـ۲۱)	اخلاص تھا۔

نبوت کی اسی زندگی کو قرآن نے اُسوۂ حسنہ کہا ہے یہ اسوہ حسنہ زندگی کے سارے گوشوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ امن و امان کا قیام، ملک کی آبادی، سرحدوں کی نگرانی، فوجی تنظیم، بین الاقوامی مسائل یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں جن کا حکومتوں سے تعلق ہے۔ اُسوۂ حسنہ کے دائرے میں اسی طرح داخل ہیں جس طرح انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دوسرے مسائل ــــ صرف مسائل ہی نہیں بلکہ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی بات۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ اسی اُسوۂ حسنہ میں مسلمانوں کے بالوں اور ناخنوں کی صفائی تک کی ہدایات موجود ہیں۔ ترمذی میں ہے کہ سلمان فارسیؓ سے جب کسی نے طنزاً یہ کہا کہ

قد علمکم نبیکم حتی
الخراءۃ۔

تو حضرت سلمان فارسیؓ نے بڑے جوش اور پورے حکیمانہ انداز میں کہا تھا کہ اجل ہاں واقعی ہماری زندگی کے ان گوشوں کے لئے اسلامی ہدایات موجود ہیں۔ حدیث کی کتابوں میں اس قسم کا بے شمار ذخیرہ موجود ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ایک شخص نے مصافحہ کیا۔ ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ آپ نے اس ناخن دراز سے کہا کہ رسول اللہؐ کے پاس ایک شخص آیا۔ اور عالم بالا کے بارے میں کچھ دریافت کرنے لگا۔ آپؐ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ تم میں سے ایک شخص آ کر عالم بالا کے متعلق پوچھتا ہے۔

واظفارہ کا تھا اظفار — حالانکہ اس کے ناخن جنگل کے پرندوں کے
الطیر تجتمع فیھا الخباثۃ — ناخنوں کے مانند ہوتے ہیں۔ جن میں
والتفث۔ — گندگی اور میل کچیل جمع رہتا ہے۔ (احکام ص۶۷)

بہر حال شخصی زندگی ہو یا خاندانی، قومی تعلقات ہوں یا عام انسانی، بندوں سے ہوں یا ہمارے، اسوۂ حسنہ ان سب پر حادی ہے اور ہر شعبہ کے متعلق قوانین و دفعات رکھتا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسی نمونہ کی زندگی کا نام اسلام ہے جسے نبوت نے الف سے یا تک قائم کیا تھا اور اس سے ہٹ کر کبھی کسی سے کسی قیمت پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ مکہ کے ارباب بست و کشاد نے ایک کانفرنس میں فیصلہ کیا کہ ایک ڈیپوٹیشن کی وساطت سے کسی طرح آپ کو راضی کر لیا جائے ڈیپوٹیشن گیا اور نبوت کے سامنے جن باتوں کو پیش کش کی یہ تھیں۔

الف:- ان کنت انما جئت بھذا الحدیث تطلب بہ مالاً جمعنا لک من اموالنا حتی اکثرنا مالاً۔

ب:- وان کنت انما تطلب بہ الشرف فینا فنحن نسودک علینا۔

ج :۔ وان کنت تريد به ملكاً ملكناك علينا ۔

ان تینوں پیشکشوں پر ذرا منصفانہ نظر ڈالئے اور سوچئے کہ وقت کی پکار کیا کہہ رہی ہے کہ

الف :۔ اگر آپ مالیاتی مسائل کی پریشانی اور معاشی بدحالی سے بے چین ہیں تو لیجئے سرمایہ حاضر ہے۔

ب :۔ اگر آپ لیڈرشپ کے خواہش مند ہیں تو لیجئے قیادت حاضر ہے۔

ج :۔ اگر آپ بادشاہ بننا چاہتے ہیں تو لیجئے بادشاہت موجود ہے۔

اگر آپ ایک سیاسی لیڈر کی نظر سے حالات و واقعات کو دیکھتے تو بلاشبہ آپ تیسری پیش کش کو اپنا لیتے کیونکہ اقتدار ہاتھ میں آجانے کے بعد کوئی کام نہیں رک سکتا۔ مگر جانتے ہو نبی، تھے لیڈر نہ تھے ان پیشکشوں کا پیغمبرانہ جواب دیا۔ تاریخ میں یہ جواب محفوظ ہے۔

مابی ما تقولون وما جئت	ان باتوں میں سے مجھ میں کچھ نہیں جو تم
بما جئتکم به اطلب	کہتے ہو میری آمد کا مقصد سرمائے کی
اموالکم ولا الشرف فیکم	فراہمی۔ لیڈری اور حکمرانی نہیں ہے
ولا الملک علیکم لکن	مجھے تو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے
الله بعثنی الیکم رسولاً	مجھ پر کتاب اتاری ہے اور حکم دیا ہے
وانزل علی کتاباً وامرنی	کہ میں لوگوں کو اعمال نیک کے نتائج کی
ان اکون بشیراً ونذیراً۔	خوشخبری سناؤں اور اعمال بد کے نتائج سے خبردار کروں۔

یہ ہے نبوت کا دو ٹوک فیصلہ اور اسے کہتے ہیں دعوت۔

اس مثالی زندگی کو برقیت پر دنیا میں قائم رکھنے ہی کے لئے نہیں۔ بلکہ اسی زندگی کے قیام پر اصرار کرنے کے لئے دنیا سے سالار رسالت کے روانہ ہو جانے

کے بعد خود قرآن ہی نے ارشاد کی حد تک نگرانی کے وعدے کے ساتھ اسی مثالی زندگی کے لئے جو کچھ اور جتنا کچھ انتظام فرمایا ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے قرآن کا مطالعہ اس فکر کے ساتھ کیا ہے کہ یہ خدا کا آخری پیغام ہے اور ساری انسانیت کے نام ہے۔ سب کے نام اور سب سے آخر ہونا ہی اس پیغام اور پیغامبر کی وہ خصوصیت ہے جو اسے دوسرے پیغاموں اور پیغامبروں سے ممتاز کرتی ہے۔ سب کے نام یعنی بعثت عامہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ہر چپے اور ہر گوشے میں اسی مثالی زندگی کو قائم کیا جائے۔ قرآن اور سنت نے اس حقیقت کو جس صراحت کے ساتھ سمجھایا ہے وہ سب ہی جانتے ہیں۔

میں دکھانا یہ چاہتا ہوں کہ اپنے تو اپنے غیروں کو بھی اس اقرار سے گریز نہیں شکیب ارسلان نے کسی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ

كَانَ مُعْتَقِدًا بِرِسَالَتِهٖ
إِلَى الْعَالَمِيْنَ كَافَّةً

اسی بنا پر خاص دعوت ہی کے سلسلے میں وقت کی بڑی بڑی حکومتوں کے نام خطوط روانہ کئے۔ غالباً ۶ھ میں آپؐ نے ایک ہی روز چھ حکمرانوں کے نام دعوت نامے بھیجے۔ ان حکمرانوں میں اصحم نجاشی والی حبشہ، ہرقل قیصر روم، خسرو پرویز ایران، مقوقس عزیز مصر، حارث غسانی، ہوذہ ابن علی جیسے مشاہیر تھے۔

دعوت کی بنیاد یہ اور صرف یہ تھی کہ آپؐ کی بعثت عام ہے یعنی نبوت کا یہ پیغام سب کے نام ہے۔ اس لئے اسے سب تک پہنچنا چاہیئے۔ سب تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ نبوت کے مشن کو لے کر چلنے والی ایک جماعت ہو۔ جو نبی نہ ہو مگر ذمہ داریوں کے لحاظ سے نبوت ہی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اس کے کاندھوں پر ہو۔ اس جماعت میں وہ خصوصیات ہوں جو انبیاء میں ہوتی ہیں ــــ سالار نبوت

اور قرآن نے اس مقصد کے پیشِ نظر جو جماعت تیار کی تھی۔ وہ انہیں خصوصیات کی حامل تھی۔ علامہ شاطبی غرناطی نے الموافقات میں ان خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ افسوس کہ خط کا محدود پیمانہ تفصیل کی اجازت نہیں دیتا۔ جاننے والے جانتے ہیں اور لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ یہ امت کی بعثت ہے اور بتایا ہے کہ امت کی یہ بعثت خود نبوی بعثت سے پیدا ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے

وان یکون قومہ خیر امۃ	آپ کی امت بہترین امت ہے اسے
اخرجت الناس فیکون بعثۃ	لوگوں کے لئے برپا کیا گیا ہے اس لئے
یتناول بعثا آخر۔	آپ کی بعثت سے ایک اور بعثت ہوئی ہے

آگے اس کی تائید میں قرآنی آیات اور حدیث بھی پیش کی ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پیغام نبوت محمدیہ چونکہ زمان و مکان سے بے قید ہو کر آیا تھا۔ اس لئے خود یہ بعثت ہی اپنے دائرہ کار کی رو سے چاہتی تھی کہ ایک دوسری بعثت ہو۔ لیکن یہ بعثت ذاتی نہ ہو اور انفرادی نہ ہو بلکہ یہ دوسری بعثت پہلی بعثت کے زیر سایہ ہو۔ اور اس لئے ہو کہ اس مثالی زندگی کو دنیا کے چپہ چپہ پر پھیلا دے۔ جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہو اور نہ صرف پھیلا دے بلکہ اس کے پھیلاؤ پر اصرار بھی کرے۔ اسی موضوع پر یہ جو لکھا جاتا ہے کہ

فلا یظن ظان انہ حصل	کوئی گمان نہ کرے کہ کبھی کوئی خیر نبوت
علی خیر بدون وساطۃ	محمدیہ سے الگ ہو کر ملی ہے کیونکہ آپ کی
نبوتہ کیف وھو السراج	ذات ہی وہ چراغ ہے جس سے سب کو
الذی یستضیع بہ الجمیع	روشنی ملتی ہے۔ اور آپ ہی وہ علم اعلے
والعلم الاعلی الذی بہ	ہیں جس کے ذریعے راہ نوردی ہو
یھتدی فی سلوک الطریق	سکتی ہے۔

تو اس سے یہی بتانا چاہتے ہیں کہ یہ اجتماعی بعثت دراصل اس انفرادی بعثت کے کمالات کا پرتو ہے جسے محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے اور چونکہ نبوت کا لایا ہوا پیغام عرب سے باہر ساری دنیا میں پہنچانا اس اجتماعی بعثت کا کام ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ یہ اجتماع ان فرائض، مواعید اور خوبیوں سے مالا مال ہو جو نبوت انفرادی کے لوازم ہوتے ہیں۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ قرآن نے جو ان فرائض نبوت کو جو نبی ہی کے فرائض ہیں امت کے فرائض بھی بتایا ہے۔ تو اس کی وجہ یہی اور صرف یہی ہے کہ قرآن کے نزدیک بعثت عامہ کا تکمیلی مقام یہی ہے۔ ذرا نبی، رسول کے فرائض کو قرآن کے ورقوں میں جہاں جہاں آپ تلاش کر سکتے ہیں تلاش کیجئے۔ اور پھر انہی فرائض کا انتساب قرآن میں امت کی طرف دیکھ لیجئے۔ قرآن میں سب سے بڑا فرض جو نبی کا بتایا ہے وہ اللہ کی طرف دعوت ہے اسی وجہ سے آپ داعی ہیں۔ قرآن کے لفظوں میں

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ ۔ اپنے مالک کے راستے کی طرف بلاؤ

سے اسی فرض کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ امت کے متعلق بھی دعوت کے کام کو نہ صرف اسکی طرف منسوب کیا ہے بلکہ اس کام کے کرنے کا امت سے مطالبہ بھی کیا ہے اور کہا ہے۔

وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ۔ چاہیئے کہ ہو یعنی تم ایک ایسی جماعت جو خیر کی دعوت دیتی ہے۔

دعوت ہی کے ساتھ نبوت کے مشن کی حد تک نبی کا دوسرا فرض جو تبلیغ بتایا ہے۔ اور پیغمبر سے اس کا مطالبہ کیا ہے:-

یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ اے رسول پہنچا دو۔

اس کو قرآن ہی میں امت کا کام بتا کر سراہا ہے

يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ　　پہنچاتے ہیں اللہ کے پیغاموں کو

دعوت نبوت پیش کرنے کے لئے قرآن نے انذار کے عنوان سے جو فرض پیغمبر کا بتایا تھا اور جسے انجام دینے پر قرآن کو حد درجہ اصرار تھا۔ اتنا اصرار کہ شاید اس سے زیادہ کسی چیز پر اصرار نہ ہو۔ نذیر اور منذر سے پیغمبر کا تعارف کرایا کبھی اَنْذِرِ النَّاسَ اور کبھی اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ کے اوامر آئے اسی فرض کو سرانجام دینے کا قرآن ہی نے جن لفظوں میں امت سے مطالبہ کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے

لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ　　چاہیئے کہ دین میں فقاہت پیدا کریں

لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ　　اور چاہیے کہ اپنی قوم کو بیدار کریں۔

اسی سلسلے میں نبی کا جو مقام قرآن نے نبوت کے فرائض کو فروغ دینے کے لئے شہادت تجویز کیا تھا جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو مشن خدا کی جانب سے نبوت کے نام پر نبی کو دیا گیا ہے۔ نبی کا فرض ہے کہ وہ اپنے مخاطبین تک پہنچائے ۔۔

يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ　　ہو جائے رسول تم پر شہادت

شَهِيْدًا ۔　　دینے والا

اور جس طرح اور جس انداز سے نبی نے اپنے مخاطبوں تک پہنچایا ہے ان مخاطبوں یعنی امت کا فرض ہے کہ اسی طرح اور اسی انداز سے زمان و مکان کی قید سے بے نیاز ہو کر اَلنَّاسَ یعنی دنیا میں بسنے والی انسانیت تک پہنچائے اور اسی شہادت کے صدقے میں اس اعزازی لقب کا اپنے کو سچا مصداق بنا دے جو اسی فرض کی ادائیگی کے نتیجہ میں الٰہی جانب سے اسے ملا ہوا ہے یعنی اُمَّةً وَّسَطًا والا لقب

كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً	اور ایسے ہی بنایا ہم نے تمکو بہترین
وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ	امت تاکہ ہو جاؤ تم شہادت دینے والے
عَلَى النَّاسِ ۔	لوگوں کے سامنے ۔

اور بتانے والوں نے تو یہاں تک بتا دیا ہے کہ کم کے خطاب کی زد صرف ان مخاطبوں تک نہیں ہے جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے بلکہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں سے یہ آیت چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے اور اسی طرح جیسے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ میں ۔۔۔ الجصاص نے لکھا ہے :-

هُوَ خِطَابٌ لِجَمِيعِ الْاُمَّةِ	یہ ساری امت سے خطاب ہے
اولها وآخرها من كان	اگلے پچھلے سب آیت کے نزول
منهم فى وقت نزول	کے وقت موجود تھے اور جو
الآية ومن جاء بعدهم	قیامت تک ہوں گے ۔
الى قيام الساعة	

کون نہیں جانتا کہ نبی کے فرائض میں سب سے اونچا مقام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت زندگی کا جو نمونہ پیش کر رہی ہے لوگوں کو اس کی طرف بلائے اور اس زندگی کے خلاف جہاں جو بھی کوتاہی نظر آئے اس کو روکے اور ٹوکے ۔۔۔ قرآن میں ہے

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ	وہ نیکی کا حکم دیتا ہے . برائی سے
يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔	روکتا ہے ۔

اور معلوم ہے کہ اس امت کے خیر الامم ہونے کو قرآن عزیز نے اسی فرض کی انجام دہی پر موقوف کیا ہے ۔۔۔ فرمایا :-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ	تم بہترین امت ہو جو بپا کئے گئے ہو

لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ لوگوں کے لئے نیکی کا حکم کرتے اور
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ برائی سے روکتے ہو۔

مَیں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا اور نہ ہی موضوع کی معین حدود کے پیش نظر میں ایسا کر سکتا ہوں۔ بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ عموم بعثت یعنی سب کے نام پیغام لے کر آنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انفرادی نبوت زندگی کا ایسا تکمیلی نمونہ ہو جس سے جماعتی بعثت کا انسانیت کے اہتمام ہو سکے؛

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

بنام مولانا حکیم محمد عمر صاحب کاندھلوی ٹرنک بازار سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۳؍اکتوبر ۱۹۵۳ء

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا دوسرا نام اسلام ہے، اور اس کی قرآنی توجیہ، مسلمان زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کا قیدی ہے، آزادی کا اسلامی مفہوم، تحت حکومت سے اسلامی زندگی کا مطالبہ، شہری زندگی کا بگاڑ، خلافت راشدہ کو حضور انور کی تکمیلی زندگی کے قیام پر اصرار تھا، فتح مکہ کے موقعہ پر اسلامی حکومت کا منشور، خلافت راشدہ میں اسلام کا دستور اساسی، سیاسی زندگی میں اسلام کی پابندی، عرب کی اندرونی و بیرونی حالت اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا بقائے اسلام کیلئے اقدام، امر بالمعروف کے مدارج، حضرت حذیفہ رضی کی پرویز سربراہ ایران کے دربار میں تقریر، ہرقل کے دربار میں حضور انور کا سفیر، حضرت عمرؓ کا تابناک دعوتی دور اور حکومت کا منشور ——

حبی فی اللہ ! وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ

آپ یاد آئے اور آپ کے نقطہ نظر نے دماغ میں چٹکیاں لیں بس اسی تقریب میں کچھ عرض کرتا ہوں۔

چند بنیادی مسائل میں ایک اہم مسئلہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہے اس کے مباحث کی گہرائیوں کو یہاں سمیٹنا مقصود نہیں یہ چند ضروری اشارات ہیں۔ اس مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ دوسرے فرائض کے ساتھ مسلمانوں پر ایک فرض یہ بھی ہے کہ المعروف کا دنیا کو حکم دیں اور المنکر سے لوگوں کو روکیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی زندگی پہ لوگوں کو قائم رکھنا اور اس کی طرف دعوت دینا مسلمانوں کے ان فرائض میں سے ہے جن کا بار بار قرآن نے مطالبہ کیا ہے بلکہ اسلامی سوسائٹی کے بہترین سوسائٹی ہونے کا اسے ہی معیار قرار دیا ہے۔ الجصاص نے بتایا

ہے کہ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا قانون سمجھنے اور اس قانون کے استعمال کرنے کی راہیں معلوم کرنی ہوں تو نبوت اور صحابہ و تابعین کا طرز عمل دیکھئے کہ یہ قانون کیسے اور کہاں استعمال ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن کا بے قید رہنے کا حکم یہی ہے کہ اسلامی زندگی کے ہر شعبے میں اسے استعمال ہونا چاہیئے۔ اسلامی زندگی دراصل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا دوسرا نام ہے اور دین کا علم نہیں میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ قرآن میں قرآن والے نے جو زور کہ لفظ کبھی قرآن کے لئے اور کبھی حامل قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بولا ہے تو اس سے یہی سمجھانا چاہتا ہے کہ اسلامی زندگی دراصل محمد رسول اللہ کی زندگی ہے۔ محمد رسول اللہ سے الگ ہو کر اسلامی زندگی کا وجود نہیں۔ شاید حضرت عائشہ رضی نے پوچھنے والے کو یہی سمجھایا تھا جب ان سے پوچھا گیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا ہیں: بولیں کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ کہنے والے نے کہا جی ہاں۔ ام المؤمنین نے فرمایا۔۔۔۔ خلقہ القرآن۔ قرآن ہی ان کا اخلاق تھا۔ یعنی اگر تم ان کے اخلاق معلوم کرنا چاہتے ہو تو قرآن دیکھ لو۔

کون نہیں جانتا کہ اسلام مسلمانوں کی زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے۔ کہنے والوں نے جب حضرت سلمان فارسی رضی سے طنزاً کہا کہ،

قد علمکم نبیکم حتیٰ الخراءة۔ — تمہارے نبی نے تم کو قضائے حاجت تک کی باتیں سکھلا دی ہیں۔

تو حضرت سلمان فارسی رضی نے بڑے جوش اور پورے حکیمانہ انداز سے کہا تھا کہ اجل ہاں واقعی ہماری زندگی میں اس گوشے کے لئے بھی ہدایات موجود ہیں۔ کہنا یہ چاہتے تھے کہ زندگی کا کوئی شعبہ بھی اسلام کی قید سے آزاد نہیں ہے اور مسلمان ہونے کے بعد بے قیدی اور اباحت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے کہ:۔

اَلدُّنیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ ‏‏‏‏ دُنیا کی زندگی مومن کا جیل خانہ ہے

اور صحیح نہ ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے تو پھر اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ مومن کی زندگی چونکہ اپنی ساری شاخوں میں قانون کی پابند ہے اس لئے یہ قیدی کی زندگی ہے۔ آزاد کی زندگی نہیں۔ مسلمان کی آزادی کا مطلب یہی ہے۔ کہ حُنَفَاءُ سب سے کٹ جائے اور مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ اور صرف ایک کا ہو کر رہ جائے اور یہ حنفیت اور اخلاص زندگی کی ایک شاخ میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں ہو۔ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ اس سے کون ناواقف ہے کہ جس ذات پیغمبر کی زندگی کا نام اسلامی زندگی ہے جو مسلمانوں کے بالوں اور ناخنوں تک کی نگرانی کرتی ہے۔ انہوں نے ہی مدینہ میں اسلام کی ایک چھوٹی سی اسٹیٹ قائم کی تھی۔ اور دس برس تک اپنی اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور مختصر سی مدت میں ہر شعبہ حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کی پوری پوری مشق کرا دی۔ جس میں اسلام کی انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی و جنگی اور بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح کیا۔ ہر شعبۂ زندگی کے لئے اصول بنے ان اصولوں کو عمل کی زندگی پر منطبق کیا۔ اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم و تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کئے گئے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اسلام زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے۔ زندگی کے ان سب شعبوں میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا اور اسلام پر قائم رکھنا امر بالمعروف اور اسلام سے الگ زندگی کے کسی شعبہ میں راہ بنانے پر روکنا اور ٹوکنا نہی عن المنکر ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دائرہ استعمال کی قرآن نے کوئی تحدید نہیں کی ہے۔ اس لئے اس کے پیروں میں کوئی ایسی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ جو اس کی غیر محدود آزادی کو پامال کر دے۔ فرد ہو یا جماعت ایک ہو یا بہت سے امیر ہو یا غریب، حاکم ہو یا محکوم۔ اس کا استعمالی دائرہ سب کے لئے یکساں

ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ

اَفْضَلُ الْجِھَادِ کَلِمَۃ عدل عند سلطان الجائر۔	سب سے بہتر جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات ہے۔

یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے میں سب سے اونچی سرگرمی یہ ہے۔ کہ تخت حکومت سے اسلامی زندگی کا مطالبہ کیا جائے۔ عوامی زندگی سے اسلام کا مطالبہ بھی امر بالمعروف ہے مگر اقتدار سے اس کا مطالبہ کرنا اسلام کی نظر میں سب سے اونچا مقام ہے بظاہر اس کی وجہ یہی ہے کہ ایسا کرنے سے اس پر مصائب کا ہجوم ہوگا۔ مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ صرف یہی وجہ نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ عوامی زندگیاں اقتدار کے تابع ہوتی ہیں اقتدار میں وابستگی عوامی وابستگی ہوتی ہے۔ اور شہرت بھی اسی کو ہے کہ

اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ	لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں

اس لئے تخت حکومت سے اسلامی زندگی کا مطالبہ سب سے بڑا جہاد ہے اور جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے۔ اور سب ہی جانتے ہیں کہ زندگی میں حکومت کو کتنی اہمیت ہے، تہذیب عمران، عوام کی معاشی اور مدنی زندگی کی بنیادی اصلاحیں تخت حکومت سے وابستہ ہوتی ہیں اور ایسی بنیادی وابستگی کہ سمجھانے والوں نے یہاں تک سمجھا دیا ہے کہ

من مفاسد المدن ان ترغب عظمائھم فی دقائق الحلی واللباس والبناء والمطاعم وغید النساء	شہری زندگی کا ایک بگاڑ یہ ہے کہ بالا دست قوت عمدہ عمدہ زیور اچھے پوشاک بہترین مکان۔ لذیذ خوراک اور عورت کی نازک اندامیوں میں لگ جاتی ہے۔

اور بتانے والوں نے ہی اس کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ :۔

جب بالادست قوت یہ مشغلہ اختیار کرے گی ۔ تو لوگوں میں معاشی بحران پیدا ہو جائے گا ۔ اور اصلاح ناپید ہو جائے گی ۔

اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ

و ذالك منہ دبھذہ	بالا دستی کا یہ میلان سوسائٹی
المدینۃ یتعدی من عضو	میں پھیل جائے گا اور اس طرح
الی عضو حتی یعم الکل فیھا و	پھیلے گا ۔ جیسے ہڑک پھیلا کرتی
یتجاری فیھا کما یتجاری الکلب	ہے ۔

فی بدن المکلوب ۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

جب یہ واقعہ ہے کہ عظماء اور اقتدار کی عیش پرستیاں متعدی ہو کر ساری سوسائٹی کو خراب کر دیتی ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تخت پر بیٹھنے والے کی بدعنوانی خود تخت کے تختوں کو باعیب بنا دیتی ہے تو پھر اس میں تعجب اور حیرت کی کونسی بات ہے کہ اگر تخت ہی سے اسلامی زندگی کا مطالبہ کر دیا جائے اگر جانتے ہو کہ مذہبیت، معشیت اور معاشرت کی اصلاح کے لئے تختہ نہیں ۔ بلکہ تخت ہی ریڑھ کی ہڈی اور بس کی گانٹھ ہے ۔ تو یہ کیوں نہیں مانتے کہ تخت سے اسلامی زندگی کا مطالبہ اسلام کے عائد کردہ فرض امر بالمعروف کا سب سے اونچا مقام ہے تم مانو یا نہ مانو میں ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی زندگی کا جو تکمیلی نمونہ پیش کیا تھا ۔ اور قرآن نے ان لفظوں سے جس زندگی کے کمال کا اعلان کیا تھا کہ

الیوم اکملت لکم دینکم	آج میں نے تمہارے لئے تمہارا
	دین مکمل کر دیا ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ خلفائے راشدین میں سے ہر ایک نے اپنے عملی نمونوں سے اس نظام پر عمل کر کے دکھایا ہے اور صرف عمل ہی نہیں بلکہ یہ کہ اسلام کو زندگی کے اسی تکمیلی نمونہ کے قائم کرنے پر اصرار ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے مسلمانوں کو ہر قیمت پر اس نظام کو قائم کرنے کی تگ و دو میں آخر وقت تک منہمک رہنا چاہیئے اسلام کے نظام سیاست میں خلفائے راشدین نے عمل کے جو نمونے چھوڑے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتے تو سمجھنے والے سمجھ جاتے اور نتیجہ نکالنے والے نتیجہ نکال لیتے کہ حکومت کا جو معیار مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کر کے دکھایا تھا۔ اور جسے بعد کو خلفاء نے قائم رکھا تھا۔ ہے تو وہ بہترین اسٹیٹ کا نمونہ لیکن اسٹیٹ کے اسی نمونہ پر اصرار کرنا اسلام کا مقصود نہیں ہے جیسے کہ کچھ منچلے کہتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہوئے خیال نہیں کرتے کہ اگر اسلام کو سیاسی زندگی میں اسٹیٹ کا وہ نمونہ مقصود نہ ہوتا۔ تو بلاشبہ عمل کی وہ سرگرمیاں نہ ہوتیں جو خلفائے راشدین نے قائم کی تھیں۔ آپ خود سوچیں کہ اسٹیٹ کے اس نمونہ کو جن جن راہوں سے ختم کرنا مقصود تھا۔ خلفاء ان سب راہوں سے دست و گریباں ہوئے اور اس سینہ چاکی سے آتے والے مسلمانوں کے لئے یہ سبق چھوڑ گئے کہ اس راستہ کے ہر پتھر سے ٹکرا جاؤ۔ مسلمان واقعی بن کر رہو ورنہ زندگی کو خیر باد کہہ دو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوئے حق سبحانہٗ نے حضرت ابو بکرؓ کو امت کا امام بنایا اس دور میں حکومت کے قالبوں کے ساتھ ساتھ حکومت کی پالیسی کو واضح کرنے کے اطوار بھی بدلے ہیں۔ اب کچھ ہو پہلے یہی قاعدہ تھا کہ جو بھی امام ہوتا۔ جس کے ہاتھوں میں سیاسی قیادت آتی۔ قیادت چاہے انتخابی ہو یا استبدادی جیسی بھی ہو رواج یہی تھا کہ منتخب ہونے یا قابض ہونے کے بعد امام تقریر کرتا اس تقریر میں وہ اپنی حکومت کی پالیسی کو ظاہر کرتا یہی تقریر اس حکومت

کا منشور سمجھی جاتی۔ منشور کے کاغذی شکل میں مرتب کرنے کا ڈھنگ اس وقت نہ تھا مکہ فتح ہُوا فتح کے بعد اسلامی حکومت قائم ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک تقریر کے ذریعے جدید حکومت کی پالیسی بیان کی بلاذری نے لکھا ہے کہ آپ نے اس تقریر میں چار بنیادی باتیں فرمائیں یہ تھیں۔

الف:۔ قتل کے پچھلے سب دعوے ختم۔

ب:۔ جاہلیت کے سب نشان ختم۔

ج:۔ بیت اللہ کی نگرانی کا فرض وُہ ہی انجام دیں گے جو پہلے دیتے تھے۔

د:۔ حاجیوں کی دیکھ بھال کا کام وُہ ہی لوگ کریں گے جو پہلے کرتے تھے۔

اسی رواج کے مطابق منتخب ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے تقریر کی اسی میں اپنی حکومت کی پالیسی بالفاظ دیگر دستور اساسی کا اعلان کیا تھا۔ ابن عبدربہ نے العقد الفرید میں پوری تقریر نقل کی ہے۔

خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔

لوگو! امامت کے لئے قرعہ فال میرے نام نکلا ہے۔ میں تم سے بہتر اور اچھا نہیں ہوں سن لو اگر میں راستی پر ہوں تو میرا ہاتھ بٹاؤ راستی سے ہٹ جاؤں تو مجھے ٹھیک کردو سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے تمہارے نزدیک سوسائٹی میں جو کمزور ہے میرے نزدیک حق لینے کی خاطر وہ قوی ہے۔ اور تمہارے نزدیک جو توانا ہے میرے نزدیک حق کے معاملے میں وہ کمزور ہے۔ (یعنی سوسائٹی میں جو قوت کے گھمنڈ پر حق دبائے گا وہ میرے نزدیک کمزور ہے۔ میں اس سے حق ضرور لوں گا۔ اور جو سوسائٹی میں جرم ضعیفی کا شکار ہے۔ وہ میرے نزدیک حق لینے کے لئے قوی ہے قوی کو قوت کے زور سے کچھ نہیں دیا جائے گا اور ضعیف کو ضعف کی وجہ سے پامال نہ کیا جائے گا۔ تمہیں دین کی خاطر سرفروشی کو کسی حال میں نہ

چھوڑنا چاہیئے۔ یاد رکھو جو قوم سرفروشی کے میدان سے ہٹ جاتی ہے ذلتوں کا شکار ہوتی ہے۔

لوگو خوب سمجھ لو جب تک میں خدا اور اس کے رسول کا دامانِ اطاعت ہاتھ میں تھامے رہوں تو تم بھی میری اطاعت کرو۔ اور جہاں جس مرحلے پر میں خدا کی نافرمانی کروں تو نہ میری اطاعت ہے اور نہ کوئی ڈسپلن"۔

یہ اسلام کا پہلا امام ہے اور پہلے امام کا یہ پہلا خطبہ ہے۔ یہ گویا حکومت اسلامی کا دستور اساسی ہے اس میں کھول کر حکومت کے خط و خال بتا دیئے گئے ہیں۔ بنیادی باتیں یہ ہیں۔

الف:۔ صدر حکومت کی حیثیت عام شہری کی ہو گی اور صدر حکومت کو اپنے اعمال میں کوئی برتری نہ ہو گی۔

ب:۔ ہر شہری کا فرض ہوگا۔ کہ نیکی کی حد تک صدر حکومت کی مدد کرے۔ غلطی دیکھے تو روک دے اور ٹوک دے۔

ج:۔ زبردستوں کو زیر دستوں پر ظلم کی اجازت نہ ہو گی۔

د:۔ ڈسپلن اس حد تک قائم رکھا جائے گا۔ جب تک صدر حکومت خدا اور رسول کا فرماں بردار رہے۔

ہ:۔ کسی ایسے قانون اور حکم کو ہرگز نہ مانا جائے گا۔ جس سے خدا کی نافرمانی کی بو آتی ہو۔

یہ پانچ دفعات پر مشتمل منشور ہے۔ اور شاید زندگی کی زلفوں کی کوئی بھی پیچیدگی نہیں جو نہ کھل گئی ہو۔ اس دستور میں قانون سازی کی بنیاد، عدالت کا دائرہ عمل، صدر ریاست کی حیثیت شہری زندگی کی آزادی اور حکومت کی داخلی اور خارجی پالیسی کو صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ امریکہ کا وہ مشہور آئین جو ۱۷۸۷ء میں بنایا گیا تھا۔ سات دفعات پر مشتمل تھا۔ ابھی ابوبکر صدیق رضی کی حکومت قائم ہوئی تھی۔ کہ اسلامی زندگی کے تکمیلی نمونے کو ختم کرنے کے لئے عرب میں نبوت کا فتنہ کھڑا ہو گیا۔ قبیلہ غطفان میں طلیحہ بنو حنیفہ میں مسیلمہ، یمن میں اسود اور بنی تمیم میں مشہور عورت سجاح نے نبوت کا دعویٰ کر دیا گویا منظم سازش یہ تھی۔ کہ سرکار مدینہ کے نقوش نبوت کو نبوت ہی کے ذریعے پامال کر دیا جائے۔ اور اس طرح زندگی کے اس تکمیلی نمونے کو تار تار کر دیا جائے۔ جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے نام سے پیش کیا تھا۔ یہ مقام کی بڑی ہی نزاکت ہے کہ ایک طبقہ نہ توحید اسلامی سے اختلاف رکھتا ہے نہ رسالت محمدیہ کا منکر ہے۔ بلکہ ان دونوں باتوں کے اقرار میں وہ دوسرے مسلمانوں کا شریک ہے۔ اس کا صرف یہ مطالبہ ہے کہ نبوت محمدیہ کے زیر اثر ایک نئی نبوت کو بھی تسلیم کر لیا جائے۔ حتیٰ کہ بعض اصحاب سیر نے لکھا ہے۔ کہ مسیلمہ کی مسجد کا مؤذن اذان میں توحید و رسالت کی شہادت اسی طرح دیتا تھا۔ جس طرح مسلمانوں کی مسجد کا مؤذن دیتا ہے۔

حالات یہ ہیں کہ دشمن باہر چاروں طرف سے تاک لگائے بیٹھا ہے۔ سیاسی شعور والے ایسے وقت میں مصلحت اور پالیسی کے پابند ہوتے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت صدیق اکبر رضی نے باہر کے عظیم الشان فتنوں کو دیکھتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ لوگ کلمہ گو اور پابند صوم و صلوٰۃ ہیں۔ مسلمانوں کا ذبیحہ کھاتے ہیں۔ ان کو دائرہ اسلام سے نکال کر مرتد قرار دے کر پورے جوش سے جو بات فرمائی تھی وہ سننے کے قابل ہے۔

تم الدین وانقطع الوحی — دین پورا ہو چکا ہے وحی بند ہو
اینقص وانا حی — گئی کیا میری موجودگی میں دین کے اندر کمی ہوگی؟

کیا اس کا اس کے سوا اور کوئی مطلب ہو سکتا ہے کہ اسلامی زندگی کا تکمیلی نمونہ جو سرکار مدینہ نے پیش کر دیا ہے۔ اس کے لئے متبادل نمونہ تو بڑی چیز ہے بلکہ اس میں کوئی جزوی ترمیم بھی منظور نہیں کی جا سکتی۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت صدیق اکبرؓ کو زندگی کے ہر پہلو میں اس نمونے کے قائم کرنے پر کتنا اصرار ہے۔ کیا اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے کوئی عبرت نہیں ہے جو آئے دن مسلمانوں میں نبوت کے نام پہ نئے نئے چراغ روشن کرتے رہتے ہیں۔ کیا صدیق اکبرؓ نے اپنے عمل سے یہ نہیں بنایا کہ ملک کے سیاسی تقاضے خواہ کچھ ہوں حالات کیسے ہی ناموافق ہوں مسلمانوں کا شمارہ کم ہونے کا کیسا ہی اندیشہ ہو۔ دشمن خواہ کیسا ہی تاک رہا ہو۔ لیکن زندگی کے اس نمونے کا ایک تار بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے گا۔ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا ہے گویا مسلمان گھٹتے ہیں تو گھٹ جائیں مگر اسلام کو نہ گھٹنے دیا جائے گا اور بھی سنئے۔ یہ سارے مسلمان جدید نبوت کے ماننے والے نہ تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو نبوت تو سرکار مدینہ کی مانتے تھے۔ مگر اپنے مالیاتی مسائل کی حد تک اسلام میں جزوی ترمیم چاہتے تھے کہنا یہ چاہتے تھے کہ پرائیویٹ لائف کی حد تک ہم اسلام کے پابند ہیں۔ مگر سیاسی زندگی میں ہم پر اسلامی زندگی کی پابندی ضروری نہیں اور اس سارے مضمون کا عنوان زکوٰۃ کی عدم ادائیگی تھی۔

غور فرمایئے کہ اگر آپ کے یہاں کوئی بستی مالیہ اور ٹیکس کی ادائیگی بند کر دے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے کہ ہم تمہاری سیاسی بالادستی تسلیم نہیں کرتے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے عمل سے مسلمانوں کو بتا دیا کہ جو لوگ اپنی سیاسی زندگی میں اسلام سے آزادی کے خواہاں ہیں اور اپنی سیاسی خواہشات کو اسلام کے تابع کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے مقابلہ میں ہر قسم کی مصلحت اندیشوں سے بے پرواہ ہو کر ان کی نماز اور ان کے روزوں سے بے نیاز ہو کر

آستینیں چڑھا کر سر بکف میدان میں کود جانا چاہیئے۔ بلاذریؒ نے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ

لقد قمنا بعد رسول اللہ	ہم حضور انورؐ کے بعد ایسے مقام پر
مقاما کدنا نھلک فیہ	پہنچ گئے کہ قریب تھا کہ ہمارا کام
لولا ان اللہ من علینا	تمام ہو جائے اگر اللہ نے ہم پر ابوبکر کے
بابی بکر۔	ذریعے احسان نہ کیا ہوتا۔

تو یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ کہنے والوں نے کہا تھا کہ سیاسی زندگی میں اسلامی زندگی پر اصرار ضروری نہیں ہے بہر حال مسلمان تو ہیں ـــــ سیاسیات میں اسلام کو مانیں یا نہ مانیں۔ مناسب نہیں کہ صرف زکوٰۃ کی عدم ادائیگی پر قتال کیا جائے ہمیں خدا کو یاد کرنا چاہیئے ان شورشوں میں حصہ نہ لینا چاہیئے۔ فتوح میں حضرت عبداللہؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

اجتمع رأینا جمیعا علی ان	ہم سب کی رائے یہی ہوئی کہ اونٹ کے
لا نقاتل علی بنت مخاض	بچے اور عربی دیہات کے پیچھے ہم نہ پڑیں
وان تأکل قری عربیۃ و	ہمیں تو موت تک اللہ کی عبادت
نعبد اللہ حتی یاتینا	کرنی چاہیے۔
الیقین	

لیکن اللہ نے صدیق اکبرؓ کو امامت ہی اس لیے دی تھی کہ سیاسی زندگی میں بہر حال اسلامی زندگی کو رکھا جائے اور اس پر اصرار کی حد یہ تھی کہ کوئی بات کوئی حادثہ اور کوئی مصلحت ان کو بال برابر بھی اس سے نہ ہٹا سکی۔

سن رہے ہو کہ اجتمع رأینا علی ان لا نقاتل یعنی رائے یہی تھی کہ خدا کی بندگی کی جائے اور یہ لوگ اسلام کو جس حد تک مانتے ہیں اسی پر قناعت

کر لی جائے۔ حضرت عمرؓ نے صاف صاف لفظوں میں کہا تھا کہ کیا آپ اس آبادی سے جنگ کریں گے جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ پڑھتی ہے۔۔ فتنہ کی ہمہ گیری کا یہ حال تھا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ

ارتدات العرب کافۃ	سارا کا سارا عرب ارتداد کی گود میں جا بیٹھا

اور دور اندیش نگاہیں اس بحران سے پریشان تھیں حتی کہ حضرت عمرؓ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھ لیا کہ:۔

یا ابا بکر تقاتل العرب کافۃ	اے ابوبکر کیا تم سارے عرب سے لڑو گے؟

حضرت ایک نہیں سارے عرب میں آگ لگی ہوئی ہے۔ لیکن صدیق اکبرؓ عزیمت الٰہی

عزم اللہ لابی بکر علیٰ	اللہ نے ابوبکر میں ان سے ٹکر لینے پر
قتالھم	عزیمت پیدا کر دی۔

کی روح سے سرشار تھے فرمایا

وَاللہ لو منعونی عقالا مما	بخدا اگر معمول کے خلاف ایک رسی میں
کانوا یعطون فی زمن رسول	بھی رکاوٹ ہوگی تو اس کے لئے بھی میں
اللہ لقاتلتھم علیہ۔	ان سے لڑوں گا۔

کہنا یہی چاہتے ہیں کہ متبادل تجویز تو بڑی بات ہے میں تو سیاسی زندگی میں اسلام قائم کرنے میں ادنیٰ سے ادنیٰ کمی بھی برداشت نہ کروں گا اور بتانے والوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت عمرؓ ہی کو مخاطب کر کے صدیق اکبرؓ نے وہ بات بھی کہی تھی جو پہلے سن آئے ہو کہ

تم الدین وانقطع الوحی	دین پورا ہو چکا ہے اور وحی بند ہو
اینقص وانا حیؓ۔	چکی۔ کیا میری موجودگی میں دین میں
	کمی کی جائے گی۔

اسلامی زندگی کا تکمیلی نمونہ موجود ہے وحی کا دروازہ بند ہے یہ ناممکن ہے کہ ابوبکر بقید حیات ہو اور اس تکمیلی نمونہ کی کسی شاخ میں کوئی کمی کر دی جائے ـــ عبرت کا مقام ہے کیا کسی نصب العین کے قائم کرنے پر اتنا بڑا اصرار اور اس کے حصول کی اتنی بڑی کوشش کوئی کر سکتا ہے جتنی حضرت ابوبکر نے کی ہے کیا اس میں یہ نہیں بتا دیا گیا ہے کہ جسم اسلام پر جدید نبوت کا داغ اور ترمیم و تخفیف اور تحریف کا نشان جب بھی اور جہاں بھی نظر آئے اسے دور کر دینا اور مٹا دینا اسلامی زندگی کا اولین فریضہ ہے۔

قانونی اور فقہی نقطہ نظر سے اسی کو الامر بالمعروف اور النہی عن المنکر کہتے ہیں۔ یعنی لوگوں کو زندگی کی ہر شاخ میں اسلام پر قائم رکھنا قرآن کے نزدیک اسلامی حکومت کے واجبات میں سے ہے

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ	یعنی وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین میں
اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ	فرمانروائی دیں گے تو نماز قائم کریں گے
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ	زکوٰۃ دیں گے معروف کا حکم دیں گے
نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔	منکر سے روکیں گے۔

میں اسی پر زور دیا گیا ہے کہ کسی حکومت کے دراصل اسلامی ہونے کا معیار یہی ہے کہ وہ اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے رہی ہو ـــ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس فرض کو قرآن نے بے قید رکھا ہے اور اس فرض کی ادائیگی میں حاکم و محکوم یکساں۔ اسی بناء پر مسلم کی ابوسعید خدریؓ والی روایت نے اس فرض کے مدارج مقرر کئے ہیں۔ ارشاد ہے۔

من رأی منکم منکراً فلیغیرہ	جو شخص تم میں سے کسی برائی کو دیکھے
بیدہ فان لم یستطع	اسے چاہئے کہ ہاتھ سے ہٹا دے

فبلسانہ فان لم یستطع — اگر ہاتھ میں ہٹانا بس میں نہ ہو تو زبان

فبقلبہ و ذالك اضعف — سے اگر یہ بھی بس میں نہ ہو تو دل سے

الایمان۔ — برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے

حضرت صدیق اکبر رضؓ نے پہلی صورت پر عمل کیا اور ثابت کر دیا کہ صدیق رضؓ کی حکومت آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہے۔ شاید کچھ لوگوں کو انہی مدارج کی وجہ سے خیال پیدا ہو کہ جب برائی دور کرنے اور لوگوں کو اسلامی زندگی پر قائم رکھنے کے درجات ہیں تو کیوں یہ کام زبان سے نہ کر لیا جائے یا صرف دل سے برا سمجھ لے۔ ایسا سوچنے والوں کے لئے قرآن کی یہ مشہور آیت بھی شاید سہارا بن جاتی ہو یا بن گئی ہو

یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا عَلَیۡکُمۡ — اے ایمان والو چمٹ جاؤ اپنے سے

اَنۡفُسَکُمۡ لَا یَضُرُّکُمۡ مَّنۡ ضَلَّ — نہ ضرر دے گا وہ شخص جو گمراہ ہے اگر

اِذَا اھۡتَدَیۡتُمۡ۔ — تم ہدایت پر ہو گے۔

جس کا حاصل یہی ہے کہ لوگوں کو اپنی اپنی ذمہ داریوں ہی کا خیال کرنا چاہئے۔ یوں بھی کہتے سنا گیا ہے کہ ظالم ظلم کر رہا ہو خاموش رہنا چاہئے استدلال کرنے والوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے

شاید ابن ماجہ اور ترمذی کی وہ روایت اسی عقدہ کا حل ہے جس میں اسی آیت کے متعلق حضرت ابوبکر رضؓ کا ایک بیان نقل کیا گیا ہے۔

لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا عَلَیۡکُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ الخ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ سوسائٹی میں جب منکر رونما ہو اور اس کے سر کچلنے کا کوئی سامان نہ ہو تو اندیشہ ہے کہ اس کے نتیجے میں جو الٰہی گرفت آئے وہ سب کو لپیٹ لے

(ابن ماجہ، ترمذی)

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس بیان نے ایک بڑی مشکل کو حل کر دیا ورنہ شاید سمجھنے والے آیت سے یہی سمجھتے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فرضیت منسوخ ہے۔ ابوبکر الجصاص نے حضرت صدیق اکبرؓ کا بیان نقل کرنے کے بعد جو قانونی اور فقہی نتیجہ اس سے نکالا ہے کہ

فاخبر ابو بکر ان ھذہ	حضرت ابوبکرؓ نے بتایا کہ اس آیت میں
الآیۃ لا رخصۃ فیھا فی	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑنے
ترک الامر بالمعروف والنھی	کی رخصت نہیں ہے اور اس آیت میں یہ
عن المنکر وانہ لا یضرہ	بھی ہے کہ گمراہ کی گمراہی ایمان والے
ضلال من ضل اذا اھتدی	کو اس وقت نقصان نہیں دیتی جب
ھو بالقیام بفرض اللہ	کہ وہ فرض الٰہی امر بالمعروف اور
من الامر بالمعروف و	نہی عن المنکر ادا کر رہا ہو۔
النھی عن المنکر۔	

اس کا اس کے سوا اور کیا مطلب ہے کہ یہی آیت جسے اس فرض کی ادائیگی میں رخصت کا ہتھیار سمجھا جاتا ہے صدیق اکبرؓ کی دور رس بصیرت نے اسی آیت سے اس فرض کی ذمہ داری کو اور بوجھل بنا دیا۔ صدیق اکبرؓ نے اذا اھتدیتم کے زور سے یہ سمجھایا ہے کہ اگر ایک مسلمان غیر اسلامی ماحول میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کو ادا کر رہا ہے تو اسے دنیا کی کوئی گمراہی نقصان نہیں پہنچا سکتی اور ایمان کی اصلی حفاظت یہی ہے اور اسی وقت یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ

یٰایھا الذین اٰمنوا علیکم	اے ایمان والو لازم پکڑ لو اپنے آپ کو
انفسکم	

ایمان والوں سے خطاب ہے اور علیکم کا مورد الذین اٰمنوا ہے مطلب یہ ہے

کہ ایمان والو اپنی ایمانی زندگی کی خود نگرانی کرو۔ اگر تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض سرانجام دیتے رہو گے تو کوئی ضلالت تمہاری ایمانی زندگی کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔

یوں کہہ رہا تھا کہ کسی حکومت کے اسلامی ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے رہی ہو۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی حکومت اس اعتبار سے پوری پوری قرآن کی کسوٹی پر اتری تھی۔ دراصل قرآن عزیز نے جو کام نبوت کے سپرد کیا تھا یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ جسے انجام دینے کے لئے اللہ کا پیغمبر آیا تھا اور قرآن نے یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ کہہ کر پیغمبر کا یہی کام بتایا بھی ہے تو اب اصولاً جو اقتدار دنیا میں اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کے ساتھ اس فرض کو انجام دے گا وہی اسلامی زندگی کے نمونہ والا اقتدار ہوگا۔ یعنی اس کے اقتدار کو خلافت کہیں گے اور جس سوسائٹی میں اس فرض کو انجام دینے والے عناصر موجود ہوں گے وہ خیر امت کہلائے گی

عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ کی آیت سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے سبکدوشی کی راہ سوچنا دراصل کار نبوت سے فرار کی راہ سوچنے کے مترادف ہے اور درحقیقت اس تصور سے خود اپنی امت کے خیر امت ہونے کی نفی کرنا ہے شاید خدا نے ابوبکر کو اسی راہ کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے منتخب کیا تھا رسالت مآب کا ارتحالی حادثہ صحابہ کے لئے کیسا ہوش ربا حادثہ تھا۔ بڑوں بڑوں کے چھکے چھوٹ گئے مگر اللہ اکبر! آنسو ڈبڈبا رہے ہیں آواز بھرائی ہوئی ہے حضرت ابو بکرؓ منبر پر تشریف لے جاتے ہیں۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ	جو شخص تم میں سے آنحضرتؐ کی پوجا
مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ	کرتا تھا تو آنحضرتؐ کا وصال ہو گیا اور
يَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ	جو شخص تم میں سے اللہ سبحانہٗ کی پوجا کرتا ہے

لَا یَمُوْتُ ۔ تو اللہ کی ذات زندہ جاوید ہے ۔

یہ کہا اور قرآن کی یہ اعلانِ عزیمت سنا دی ۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ	اور نہیں ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم مگر رسول ۔
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ	آپ سے پہلے بھی رسول گذر چکے ہیں
اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ	کیا پس اگر مر جائیں یا شہید ہو جائیں تو
عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ ۔	تم پلٹ جاؤ گے ۔

یہ پہلا موقعہ تھا جب صدیق اکبرؓ نے امت کو بتایا کہ شخص رسالت بے شک ہم میں موجود نہیں ہے مگر کارِ رسالت کو ہمیں انجام دینا ہے ۔ جو کام پیغمبر کرتے تھے وہ ہی کام اب امت کو کرنا ہے اسی لئے یہ امت خیرِ امت ہے ۔ میں کہہ رہا تھا کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے سب خدشوں سے بے پرواہ ہو کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا خطرناک بازی لگا دی

شاید آپ سوچیں کہ فتنہ ارتداد ختم ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ آرام سے بیٹھ گئے اور اب اسلامی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں رہا ۔ واقعی اسلامی زندگی کے لئے اب وہ خدشہ نہیں رہا جو عبداللہ بن مسعودؓ کے لفظوں میں کلا نا نعلم ذیبہا کا خدشہ ہو ۔ مگر جنہوں نے طے کر لیا ہے یا جنہیں بتا دیا گیا ہے کہ تم خیرِ امت ہو ، لوگوں کی نفع رسانی کے لئے تم منصۂ وجود میں آئے ہو ، تمہارا کام یہ ہے کہ اسلامی زندگی کے جہاں خلاف کانٹا ہو رہنے گی اور تو تو ...... بھلا ان کو چین کہاں ہوتا ہے ۔

عرب جہاں اسلام کی نمونے کی زندگی کا تماشا دکھایا جا رہا ہے ۔ پوجا پاٹ اسلامی ، انتظام اسلامی ، تعلیم اسلامی ، عدالت اسلامی ، معیشت اسلامی ، معاشی اسلامی ، معاشرت اسلامی ، مالیات اسلامی ، فوج اور نظم و نسق اسلامی ، اور بازار اسلامی ، قائم ہیں ۔ مشرق میں فارس کی حکمرانی اور شمال میں رومن امپائر موجود ہے دونوں طاقتیں دنیا کی سب سے بڑی طاقتیں تھیں ۔ دونوں کے نام پیغمبر اسلام کے

خط جا چکے ہیں۔ فارسی حکومت درفش کاویانی کے سایہ میں نہ صرف ایران پر قابض تھی۔ بلکہ ایک طرف ہندوستان تک اور دوسری طرف عراق و عجم کے آگے پاؤں پھیلائے بیٹھی تھی۔ فارس کی حکومت کا دبدبہ ایشیا اور یورپ دونوں پہ قائم تھا۔ عرب کے اکثر اہم حصے بحرین، عمان، یمن اس کے زیر نگیں تھے۔ جس طرح حکومت کا اقتدار تھا اسی طرح کجکلاہ ایران خسرو پرویز کے زمانے میں دربار کی شان بھی بڑھی ہوئی تھی۔ آداب شاہی، درباری لباس اور شاہی باڈی گارڈ کی ہیبت و سجاوٹ دیکھ کر اچھے اچھے انسانوں کے چھکے چھوٹتے تھے۔

سنہ ۶ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن حذیفہ رضؓ کو خط دے کر بحرین روانہ کیا اور ہدایت کی کہ حاکم بحرین کی وساطت سے خسرو پرویز حاکم فارس تک خط پہنچائیں۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَی النَّاسِ	میں اللہ کا سب انسانوں کی طرف رسول
کَافَّۃً لِیُنْذِرَ مَنْ کَانَ	ہوں۔ رسول اس لئے آتا ہے کہ آگاہ
حَیًّا اسلم تسلم فان	کرے زندوں کو۔ مسلمان ہو جا بچ
ابیت فعلیک اثم المجوس	جائے گا۔ اگر تو نے انکار کیا تو مجوسیوں
(طبقات)	کا بوجھ بھی تجھ پر ہوگا۔

خط پہنچا اور پڑھا گیا۔ امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے بتایا ہے کہ خسرو پرویز نے نامہ مبارک کو پرزے پرزے کر دیا۔

فلما قرء کسریٰ مزّقہٗ	کسریٰ نے خط پڑھا اور پرزے پرزے کر دیا

حضرت عبداللہ بن حذیفہ رضؓ نے دربار نبوت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا۔

ابن عباس رضؓ کہتے ہیں :-

فدعا علیھم رسول اللّٰہ	حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے بار بد

ان ہمزقوا کل ممزق ہونے کی بد دعا فرمائی۔

علامہ سہیلی نے الروض الانف میں واقعہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خسرو پرویز نامہ مبارک پرچین بچیں ہوا ۔۔۔ تو حضرت حذیفہؓ نے دربار میں کھڑے ہو کر درباریوں کے اور بادشاہ کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض اس طرح انجام دیا ۔۔۔ بولے

اے اہل فارس عرصہ دراز سے تمہاری زندگی نادانی میں بسر ہو رہی ہے - تمہاری زندگیاں الف سے یا تک کتاب اور ہدایات نبوت سے ناآشنا ہیں جس اقتدار پر تم کو ناز ہے وہ بہت ہی تھوڑی سی زمین کا اقتدار ہے زمین پر اس سے بڑی بڑی حکومتیں رہ چکی ہیں۔ اے فارس کے فرمانروا تجھ سے پہلے بہت سے بادشاہ گذر چکے ہیں ان میں سے جس نے معاد کو منزل مقصود سمجھا وہ اس دنیا سے کامیاب گیا اور جس کی تگ و دو اور پیش نہاد صرف یہ دنیا رہی اس نے آخرت کو ضائع کر دیا۔ اس دنیا کی دوڑ دھوپ میں ہر شخص مختلف الخیال ہے لیکن آخرت کا انصاف سب کے لئے یکساں ہے۔ افسوس میں جس پیغام کو لے کر تیرے پاس آیا۔ تو نے اسے حقارت سے دیکھا حالانکہ تجھے معلوم ہے کہ یہ پیغام ایسی جگہ سے آیا ہے جس سے خود تیرا دل کانپ رہا ہے۔ یاد رکھ حق کا یہ آوازہ تیری تحقیر سے دب نہیں سکتا اور تیری تکذیب تجھے حق کی زد سے بچا نہیں سکتی۔ واقعہ ذی قار اس کا گواہ ہے۔"

کہتے ہیں کہ خسرو پرویز کا پارۂ حرارت چڑھ گیا اور اس نے حضرت عبداللہؓ سے کہا کہ ایران ہے شام نہیں ہے۔

صدیق اکبرؓ نے اپنے زمانہ میں یکم محرم الحرام ۱۲ھ میں اس مہم کو پھر شروع کیا اور اس مقصد کے لئے حضرت خالد بن ولید فوج لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے

دوسری طرف شام میں رومی حکومت تھی جس کے زیر اثر نہ صرف یورپ تھا۔ بلکہ تمام شام اور عرب و عجم کے بعض حصے تھی۔ قوانین، وضوابط اور نظام حکومت کے لحاظ سے روم کو وہ مقام حاصل تھا کہ یورپ کی موجودہ حکومتیں آج تک رومن لا کا راگ الاپتی ہیں۔ اس زمانے میں روم کی حدود یہ تھیں۔۔۔ شمال مشرق میں ترکستان اور روس، جنوب میں شام و مصر۔ مغرب میں بحیرہ روم اور اندلس، تخت حکومت پر ہرقل براجمان تھا۔ اور قیصر کے لفظ سے پکارا جاتا تھا۔ عملی طور پر ہرقل کی شخصیت عہد جدید و قدیم میں خاص امتیاز رکھتی تھی ادھر ہرقل کا کوکبۂ شاہی روم سے ایک منت پوری کرنے کی خاطر فلسطین جا رہا ہے ادھر دربار رسالت سے حضرت دحیہؓ کو امر بالمعروف کا فرض انجام دینے کے لئے خط دے کر ہرقل کی طرف روانہ کیا جا رہا ہے۔ دحیہ کو ہدایت تھی کہ بصریٰ کے حاکم کی وساطت سے خط کو ہرقل تک پہنچانا۔ حضرت دحیہؓ کو راستہ ہی میں معلوم ہوا کہ حاکم بصریٰ۔۔۔ بصریٰ میں نہیں بلکہ حمص میں ہے دحیہؓ نے ادھر کا رخ کر لیا حافظ عسقلانیؒ نے مشہور محدث ابن السکن کے حوالہ سے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ دربار رسالت سے دحیہؓ کے بعد فوراً ہی حضرت عدی بن حاتم کو بھی حضرت دحیہؓ کی اعانت کے لئے روانہ کیا گیا حضرت دحیہ نے حمص میں یہ مکتوب والا نامہ حارث غسانی کو دیا۔ حارث نے خط اور قاصد دونوں کو شاہی دربار میں بھیج دیا پہنچے خط دیا ہرقل کو جب خط ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص یہاں مقیم ہو تو لے آؤ۔ قریش کا ایک تجارتی قافلہ قریب ہی غزہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ امیر قافلہ ابو سفیان تھے جو ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے۔ اس دعوتی وفد کے ساتھ کیا ہوا اس کی تفصیلات مشہور ہیں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۹ھ میں اس دعوت کی تکمیل کے لئے تیاری کی۔ وفات والے سال اسامہ کی قیادت میں ایک دستہ روانہ کرنے والے تھے۔

وفات ہوگئی۔ صدیق اکبرؓ نے حضرت اسامہ کو روانہ کیا۔ اسامہ کو روانہ کرتے وقت ایک عجیب خلفشار ہوگیا۔ اسامہ عمر میں چھوٹے تھے صحابہ کا کہنا تھا کہ کسی عمر رسیدہ کو قیادت دیجئے۔ بولے:۔

یولیہا رسُولُ اللہ ویعزلہ	اللہ کا پیغمبر اسے حاکم بنائے اور
ابو بکر	ابوبکر معزول کرے۔

دیکھا آپ نے زندگی کا جو نمونہ رسالت مآب چھوڑ کر جا چکے تھے۔ ابوبکر اس میں اتنی ترمیم بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ بلکہ لکھنے والوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ اس روز اسی میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان اس درجہ ترش کلامی ہوگئی حضرت عمرؓ ان انصار کے ساتھ رائے دے رہے تھے جن کا خیال تھا کہ اسامہ عمر میں چھوٹے ہیں کسی بڑے کو روانہ کیا جائے۔ کیسی معمولی سی بات ہے۔ لیکن صدیق اکبرؓ کھڑے ہو گئے حضرت عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی۔ اور بولے :۔

عدمتك امك یا ابن	تو بے ماں رہ جائے اے خطاب کے فرزند
الخطاب اِستعملہٗ رسُولُ	حضور انورؐ نے اسے مقرر کیا اور تو مجھے
اللہِ وَتامُرنِی ان انزعہ۔	اس کے ہٹا دینے کا حکم دیتا ہے۔

دیکھا آپ نے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کو اس نمونہ کے قائم کرنے اور رکھنے پر کتنا اصرار ہے۔ کہ معمولی سی تبدیلی بھی گوارا نہیں کرتے۔ اسی دستہ میں جانے والوں میں رسالت آبؐ نے حضرت عمرؓ کا نام بھی رکھا تھا۔ صدیق اکبرؓ عمرؓ کو روکنا چاہتے تھے مگر اختیار ناطق کو استعمال نہیں کیا۔ نہایت لجاجت سے اسامہؓ کو لکھتے ہیں۔

انی رَأیت ان تعیننی بعمر	میرا خیال ہے کہ عمرؓ کو چھوڑ کر اگر تم میری
فافعل۔	مدد کر سکتے ہو تو کرو۔

حضرت اسامہؓ نے حضرت عمرؓ کو مدینہ ٹھہرنے کی اجازت دیدی۔ اللہ اکبر!

اس نمونہ سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کتنا پیار ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا تھا۔ کہ کسی درجہ میں کوئی ترمیم بھی منظور نہیں۔ نہ جانے لوگ کس کس طرح سوچتے ہیں مگر میں تو سمجھتا ہوں کہ حضرت ابو بکر رضؓ کو رسالت کی اسلامی نمونے کی زندگی کو قائم رکھنے پر اتنا اصرار تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے مگر زندگی کا صرف عبادات ہی میں نہیں بلکہ سیاسیات میں جو نمونہ چھوڑ گئے اسے ہی قائم رکھا جائے اس راہ میں ادنیٰ سی چشم پوشی اور مصالحت بھی گوارا نہ تھی۔ اسامہؓ کی سر گرمی ایک جزوی سرگرمی ہے اس کے بعد صدیق اکبرؓ نے اس فرض کی تکمیل کے لئے ایک بہت بڑی مہم چھیڑ دی۔ ابو عبیدہ، عمرو بن العاص، شرجیل، یزید بن ابی سفیانؓ رضی اللہ عنہم کی کمان میں فوجوں کو روانہ کیا۔ یرموک کا مشہور معرکہ یادگار ہے۔ صدیق اکبرؓ ۸ رجمادی الآخر ۱۳ھ کو دنیا سے رخصت ہو گئے۔

زمام قیادت حضرت عمر فاروقؓ کے ہاتھ میں آئی — حضرت عمرؓ کا دور بھی وہ تابناک دعوتی دور ہے جس میں نظم امر قرآن کے مطابق الآمر بالمعروف اور النہی عن المنکر کو اسلام کے مزاج کے مطابق سرانجام دیا جا رہا ہے۔ سرآمد رسالت نے فاروقؓ سے فرمایا تھا اور جو کچھ فرمایا تھا۔ حرف بحرف مستقبل نے تصدیق کر دی۔ فرمایا:۔

ما لقیلک الشیطان سالکا فجا قط الا سلک فجا غیر فجک۔	نہیں ملے گا چلتے ہوئے کسی بھی راستہ میں تجھ سے شیطان مگر وہ راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ شیطان چلے گا یعنی تو اور شیطان کسی ایک راستہ پر نہ ہوں گے

دنیا والوں نے دیکھ لیا کہ ایسا ہی ہوا۔ عمرؓ نے نہ صرف یہ کہ بار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیا بلکہ خود سوسائٹی کو ہی اسی معیار پر بنا دیا۔

دستور یہی تھا کہ امام امامت کی کرسی پر بیٹھتے ہی لوگوں کے سامنے تقریر کرے۔ جیساکہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ کہ یہ تقریر درحقیقت مستقبل میں حکومت کی پالیسی کا منشور ہوتی تھی۔ عمر فاروق رضؓ نے زمام قیادت ہاتھ میں لیتے ہی جو تقریر کی وہ الفاظ کی سطح کی حد تک اگرچہ بہت ہی مختصر ہے۔ لیکن معانی کا سمندر اس میں پنہاں ہے۔ الفاظ نہ پڑھئے معانی پر غور کیجیئے:-

انما مثل العرب مثل الجمل	عرب اس سدھائے ہوئے اونٹ کی طرح
الا نف اتبع قائدہ فلینظر	ہیں جس کا ہانکنے والا پیچھے آرہا ہو۔
قائدہ این یقودہ اما انا	یہ ہانکنے والے کو دیکھنا چاہیئے کہ ہانک
فورب الکعبۃ لاحملنکم	کر کہاں لے جارہا ہے۔ میں بخدا اس
علی الطریق۔	مقرر اور صحیح راہ پر ڈالوں گا اور لیجاؤں گا

اس تقریر پر چلتی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے

الف:- اصلاح کی حدود میں ذمہ داری عوام پر نہیں قیادت پر ہے۔

ب:- امیر ریاست، ریاست میں عوامی اصلاح کا ذمہ دار ہے۔

ج:- الطریق یعنی وہ راستہ جو اسلامی زندگی میں جانا اور پہچانا ہوا ہے لوگوں کو اس پر چلانا امیر ریاست کا کام ہے۔

د:- شہری زندگی میں امیر یہ ضرور دیکھے گا کہ عوامی زندگی کہاں جارہی ہے۔

اس منشور کا لب ولہجہ آنے والی زندگی میں خط وخال کی نشان دہی کر رہا ہے ——چونکہ خلافت کے واجبات میں سے اسلامی زندگی کے اس نمونے کو تمام دور اندیشیوں اور مصلحت کیشیوں سے بالا ہوکر بہر حال قائم رکھنا تھا جسے سرآمد رسالت دنیا میں چھوڑ گئے تھے۔ اسی لئے منشور میں صاف طور پر عمر فاروقؓ نے کہا کہ لاحملنکم علی الطریق —— یہ الطریق وہی زندگی ہے ——

دنیا نے دیکھ لیا کہ حضرت عمر فاروق رضؓ نے یہ کام کس خوبی سے سرانجام دیا۔ اپنوں کو جانے دیجئے غیر بھی اقرار کر گئے۔

انما هی خلافة دینیة	یہی دینی خلافت ہے۔ کچھ نادرۃ الوجود
توقفت الی رجال یندر	لوگوں کے اجتماع کے سہارے قائم
اجتماعهم فی عصر۔	ہوئی تھی۔

(التمدن الاسلامی)

اور یہاں تک کہہ گئے

هٰذا هو العصر الاسلامی	یہی اسلام کا سنہرا زمانہ ہے۔ عدل
الذهبی عصر العدل والتقوی	اور تقوی کا زمانہ۔

(التمدن الاسلامی)

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ‘

بنام: جناب حکیم حبیب احمد صاحب۔ پرنسپل طبیہ کالج لاہور۔

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۰ اکتوبر ۱۹۵۵ء

مصائب میں نبوت کی جانب سے روحانی دست گیری، عقل خود پرستی

اور ایمان خدا پرستی کا نام ہے۔ مقام رسالت کے بارے میں ایمان کی تین شرطیں

ایمان میں اصل چیز محبت ہے اور محبت کی نشانی اتباع ہے۔ اتباع اور اطاعت

میں بنیادی فرق۔ قانون سازی میں خلافت راشدہ کا مقام نبوت سے نیچے

اور اجتہاد سے اوپر ہے۔ ماں کی گود سے لے کر قبر تک زندگی کا خاکہ،

اتباع کی حدود میں ہماری سرد مہری۔

حبی فی اللہ وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ السلام علیکم!

سنائیے جو کچھ آنکھوں نے دیکھا۔ اور کانوں نے سنا ٹھیک ہوا کہ نہیں۔ خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ کا میرا ہاتھ پکڑنا پیش پا افتادہ مصائب کی نشاندہی تھی اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی دستگیری ہے کہ ان مصائب کو راحتوں اور دل کی لذتوں میں تبدیل کر دیا۔ میرا ہاتھ پکڑنے سے میری کمزوریوں کی طرف اشارہ تھا اور ساتھ ہی ان کمزوریوں کا مداوا بھی۔ الحمد للہ

میں نے اسی روز اہلیہ سے کہہ دیا تھا کہ اگرچہ مصائب آ رہے ہیں مگر مطمئن ہوں کہ جناب رسالت مآب ؐ نے ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحؒ جب تاریخ کے اس حادثہ سے دوچار ہونے والے تھے جسے مسئلہ خلق قرآن کہتے ہیں، تو امام شافعی رحؒ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں "احمد بن حنبل رحؒ کو ہمارا سلام کہہ دو۔" صبح ہوئی امام شافعی رحؒ نے مجلس میں خواب بیان کیا اور پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام امام احمد بن حنبل رحؒ تک کون پہنچائے گا۔ تو امام ابو حنیفہ رضؓ کے مشہور شاگرد ابن سماعہ نے آگے بڑھ کر کہا کہ بندہ حاضر ہے۔ ابن سماعہ

پیغام لے کر پہنچے اور امام احمدؒ کو سنایا۔ کہتے ہیں کہ امام احمدؒ رو پڑے اور فرمایا کہ

قَدْ رَأى رَسُوْلُ اللهِ فِيَّ ضُعْفًا۔ — حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ میں کوئی کمزوری دیکھی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دور رس نگاہ نے مجھ میں کوئی کمزوری دیکھی ہے اور سلام سے اس کا علاج کیا ہے۔ اللہ اکبر کیا کہنے ہیں اس تعلق کے کہ غلاموں کی کس کس انداز سے مدد فرماتے ہیں۔

اَلَا یَا رَسُوْلَ اللهِ کُنْتَ رَجَاءَنَا — وَکُنْتَ بِنَا بَرًّا وَلَمْ تَکُ جَافِیًا

اے اللہ کے پیغمبر! آپ ہی ہمارا آسرا ہیں — آپ ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے والے تھے نہ کہ برا

فِدًی لِرَسُوْلِ اللهِ اُمِّیْ وَخَالَتِیْ — وَعَمِّیْ وَخَالِیْ ثُمَّ نَفْسِیْ وَمَالِیَا

اللہ کے رسول پر میری ماں، خالہ — چچا، ماموں، میری ذات اور میرا مال قربان ہو

یہ نتیجہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا اور ان کے دین کی خاطر تکلیفیں برداشت کرنے کا۔ لیکن آہ میں

چو بید بر سر ایماں خویش مے لرزم

ہر وقت، ہر آن، ہر لمحہ، ہر لحظہ، ہر پل، اور ہر گھڑی گناہوں کے انبار لگا رہا ہوں۔ اور زندگی کی کوئی کل بھی نا فرمانی سے خالی نہیں۔ محبت کا حق تو یہ ہے کہ اتباع کامل ہو اور زندگی کے کسی گوشے میں بھی سر مو انحراف نہ ہو کیونکہ

المحب لمن یحب مطیع — عاشق اپنے محبوب کا فرمانبردار ہوتا ہے

اقبال نے کیا خوب کہا ہے :-

عشق مے گوید کہ اے محکوم غیر — سینہ تو از بتاں مانند دیر

تا نداری از محمد رنگ و بو — از درود خود میالا نام او

عقل کہتی ہے کہ اسلام وہ ہے جو اسے بھلا معلوم ہو۔ ایمان کہتا ہے کہ یہ خدا پرستی

نہیں بلکہ خود پرستی ہے۔ اسلام اتباع واطاعت ہے۔ اطاعت میں اپنی عقل چلانا سرکشی اور تمرّد ہے۔ یہ درست ہے کہ دانا حاکم کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ مگر محکوم اور غلام کا کام یہ ہے کہ عقل پر نہیں بلکہ حکمِ حاکم پر اعتماد کرے یہی بات قرآن میں مقامِ رسالت کے بارے میں فرمائی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

قسم ہے تیرے پروردگار کی ایمان والے نہ ہوں گے تا آنکہ حاکم نہ بنا لیں تم کو اپنے باہم جھگڑوں میں اور پھر اپنے اندر آپ کے فیصلہ کے خلاف کوئی تنگی نہ محسوس کریں اور اپنے کو پورا پورا سپرد کر دیں۔

دیکھئے اس آیت میں مقامِ رسالت پر ایمان کو تین شرطوں سے مقید کیا ہے۔

الف :۔ زندگی کی تمام آویزشوں میں نبوت کی حکمرانی ہو۔

ب :۔ نبوت جو بھی فیصلہ کرے اس کے خلاف دل گرفتگی نہ ہو۔

ج :۔ نبوت کے سامنے زندگی ساری کی ساری تسلیم و رضا کی ہو نہ کہ جبر و قہر کی۔

یاد پڑتا ہے کہ بخاری میں بحوالہ ہشام روایت آئی ہے کہ ایک روز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ مسجد میں ٹہل رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھا کہ زبانِ نبوت سے یہ ارشاد ہوا

وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ نَفْسِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ

قسم ہے تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن کامل نہ ہوگا۔ جب تک میری ذات اس کے لئے خود اسکی ذات، اولاد اور ساری

اَجْمَعِیْنَ۔ (او کما قال) انسانیت سے زیادہ محبوب نہ ہو جائے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ٹھہر گئے اور بولے یا رسول اللہ ذرا مجھے اپنا محاسبہ کرنے دیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ حضرت عمر بولے

اِلَّا نَفْسِیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ مگر میری ذات اے اللہ کے پیغمبر

آپ نے پھر وہی بات ارشاد فرمائی۔ حضرت عمر نے کہا۔

اَلْآنَ اَنْتَ احب اِلَیَّ من نفسی یا رسول اللّٰہ اب آپ مجھے اپنی ذات سے زیادہ محبوب ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اَلْآنَ تَمَّ اِیْمَانُکَ یَا عُمَر اب تیرا ایمان پورا ہو گیا۔

اصل چیز آپ کی محبت ہے اور محبت کی محسوس نشانی آپ کی پوری پوری ایسی سرفروشانہ اور والہانہ اطاعت کہ دنیا دیکھ کر مجنوں کہے۔ یہ آپ ہی کی اطاعت ہے جس سے ایک مسلمان کو درجہ محبوبیت ملتا ہے قرآن میں ہے۔

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ اگر تم اللہ سے پیار کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے پیار کرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن نے بیک وقت دو باتیں کہی ہیں اطاعت اور اتباع۔ اطاعت کے معنے ہیں کہا ماننا۔ مگر اتباع اس سے آگے ہے اس کا تعلق سر تا سر محبت ذات سے ہے۔ اس کے معنے ہیں کسی کے پیچھے لگے بانٹنا، ہو بہو وہ کچھ کرنا جو کہا اور کیا جا رہا ہے۔ وظیفہ بندگی کی پابجائی اور اللہ جل شانہ کی طرف ہمہ وقت متوجہ رہنے کا حق صرف اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ظاہراً و باطناً ہر طرح سے پوری پوری اتباع کی جائے۔ اخروی نجات اور ابدی فلاح صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی اتباع سے وابستہ ہے

رشتہ در گردنم افگندہ دوست   ہر جا کہ مے برد خاطر خواہ اوست

لوگ سمجھتے ہیں کہ نواہی سے بچنا اور اوامر پر چلنا ہی اتباع ہے حالانکہ یہ صرف اطاعت ہے۔ اتباع جس سے مقام محبوبیت حاصل ہوتا ہے۔ اس سے کہیں آگے ہے۔ اوامر پر عمل پیرا ہونے والا اور نواہی سے بچکر چلنے والا مطیع تو ضرور ہے مگر متبع نہیں ہے۔ اتباع یہ ہے کہ زندگی کے ہر پہلو کو اس سانچے میں ڈھال دے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے سامنے چھوڑا ہے عمل کا یہی سانچہ قرآن کی اصطلاحی زبان میں اسوۂ حسنہ کہلاتا ہے قرآن میں ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ   رسول اللہ تمہارے لئے بہترین نمونہ ہیں۔

اسی معنے کے لحاظ سے خداوند ذو الجلال نے قرآن اور آپ کی ذات گرامی دونوں کے لئے نور استعمال کیا ہے

وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا۔   ہم نے ہی تمہاری طرف واضح روشنی اتاری ہے۔

اور

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ   تمہارے پاس اللہ کی جانب سے روشنی اور واضح کتاب آئی ہے

پہلی آیت میں نور سے قرآن حکیم اور دوسری میں نور سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے، اور کیوں نہ ہو جب کہ دونوں میں فعل و انفعال کا تعلق ہے اسی لئے حضرت عائشہ نے اس شخص کے جواب میں جس نے آپ سے رسالتمآب کے اخلاق کریمانہ کے بارے میں پوچھا تھا فرمایا

اَمَا قَرأْتَ الْقُرآنَ — کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؛

جواب دیا کہ ہاں! آپ نے فرمایا

فَذٰلِكَ خُلُقُ رَسُوْلِ اللّٰهِ — یہی تو رسول اللہ کا خلق ہے۔

شاید لوگ تو روائتی نقطہ نظر سے اس واقعہ کی صحت کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے اس مطالبے پر کہ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ کِتَابُ اللّٰهِ یہ دعویٰ کردیا تھا کہ

انا القرآن الناطق — میں ہی بولتا قرآن ہوں۔

مگر میں کہتا ہوں کہ اگر حضرت علی کی زندگی کے سارے گوشے براہ راست رسالت کے اسوۂ حسنہ سے منور تھے اور یقیناً منور تھے تو یہ دعویٰ کوئی بڑا دعویٰ نہیں تھا۔ اور بالکل صحیح تھا چاہے اس کی روائتی حیثیت کچھ ہو یہی وجہ ہے کہ حکومت اور فرماں روائی کے بارے میں ہر حاکم کی اطاعت کا جب تک وہ معصیت کا آمر نہ ہو حکم دیا ہے۔ برخلاف خلافت راشدہ کے کہ اس کی اطاعت کے ساتھ اتباع کا بھی حکم ہے اور اسی وجہ سے ان کے کردار کو سنت قرار دیا ہے۔

عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ — میری سنت اور باہدایت

الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ — خلفائے راشدین کی سنت

الْمَهْدِیِّیْنَ مِنْ بَعْدِیْ — سے چمٹ جاؤ۔

اوروں کا پتہ نہیں لیکن اسلام کے مشہور مفکر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی زندہ بیان سے متاثر ہو کر ازالۃ الخفاء میں قانون سازی کے مخارج بیان کرتے ہوئے خلفائے راشدین کا منصب ما دون التشریع اور ما فوق الاجتہاد قرار دیا ہے اور اس کو بے شمار

مثالوں سے ثابت کیا ہے۔ بہر حال اتباع کا مقام اطاعت سے بہت اونچا ہے اور اتباع کا دائرہ صرف انفرادی زندگی یعنی تزکیۂ نفس، اصلاحِ اخلاق اور درستی اعمال تک نہیں بلکہ اجتماعی اور سیاسی زندگی میں بھی اس کا مطالبہ ہے ـــــ آپ نے کبھی غور کیا کہ حضرت علی نے خود مسلمانوں کے خلاف تلوار کیوں اٹھائی تھی؟ اوروں کا پتہ نہیں میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اجتماعی اور سیاسی زندگی کا جو نمونہ سرکارِ مدینہ نے چھوڑا تھا۔ وہ اس میں بال برابر تبدیلی کے بھی مخالف تھے نہیں چاہتے تھے کہ اذا هلك كسرىٰ فلا كسرىٰ بعده کے ماننے والے نبوت کی روحانی سادگی سے ہٹ کر کسروی مادیت کو اپنالیں اور حکیم سنائی کی زبان سے وقت کو پکارنا پڑے۔

مسلماناں مسلماناں مسلماناں مسلمانی آئین بیدیناں پشیمانی پشیمانی

یہی جذبہ امام حسین کو کربلا میں لایا

سر داد و نہ داد دست در دستِ یزید

حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

اتباع زندگی کے سارے گوشوں میں ہونی چاہیئے ـــــ اور جب تک نہیں ہوتی اس کے لئے جانے، دامے، قدمے، اور قلمے جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے لیکن انفرادی زندگی کے وہ حدود جن پر خود ہماری حکومت ہے۔ پہلے ہمیں اسے اسوۂ حسنہ کے سانچوں میں ڈھالنا چاہیئے۔ اجتماعیات میں ہماری اس وقت تک کامیابی نہ ہو گی جب تک ہماری انفرادی زندگی اتباع کی آئینہ دار نہ ہو گی۔ آئے دن اسلام کے نام پر اٹھی ہوئی تحریکوں کی ناکامی کا اصل باعث یہی ہے کہ اجتماعی اور سیاسی زندگی کے لئے جس چیز کے ہم مدعی بن کر کھڑے ہوتے ہیں خود اس کا نام و نشان تک ہماری انفرادی زندگی میں موجود

نہیں ہوتا۔ ماں کی گود سے لیکر قبر کی آغوش تک ساری زندگی خلاف سنت چل رہی ہے گھر کا کوئی کام، غمی کی کوئی رسم، شادی کا کوئی معاملہ بھی منہاج نبوت پر نہیں ہے۔ کسی بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہیں ہے، سونے، سو کر اٹھنے، کھانا کھانے، گھر میں جانے اور آنے، کپڑے پہننے، بیت الخلاء جانے مسجد میں جانے اور آنے میں اتباع سنت کا خیال تک نہیں آتا۔

عادات کو چھوڑ کر عبادات ہی پر ذرا ایک چلتی نظر ڈال لو۔ اول تو مساجد ہی اپنی بربادی اور مشاہد کی آبادکاری کو دیکھ کر سینہ چاک ہیں۔ اور اگر ان میں کچھ آبادکاری ہے تو ان اعمال پر سینہ کوب ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مساجد میں رسول اللہ کا نام لیکر کر رہی ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے لئے ورثہ میں نہیں چھوڑا ہے۔ من گھڑت اوراد وظائف، احزاب اور اشغال کے وہ سارے ہنگامے جو ہم اپنی پسند کے دباؤ سے کرتے ہیں میزان اتباع میں پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے اور اس باب میں آج ہماری سردمہری کا یہ حال ہے کہ ہم اپنے مولوی سے یہ بھی پوچھنا گوارا نہیں کرتے کہ آیا اس کا بتایا ہوا یہ عمل رسول اللہ نے کیا یا نہیں — بازار سے وظیفوں کی جو کتاب ہاتھ لگ جائے اس پر عمل شروع کر دیتے ہیں۔ وظیفوں کی کتنی کتابیں آج بازاروں میں تاجروں نے خدا سے بے خوف ہو کر صرف تجارتی نقطۂ نظر سے پھیلا رکھی ہیں۔ فانا للّٰہ والی اللّٰہ المشتکیٰ!

بہرحال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ضرورت ایسے انقلابی عمل کی ہے جس سے اتباع کی شادابیاں منظرِ عام پر آجائیں۔ انفرادی سے لیکر اجتماعی اور سیاسی زندگی تک۔

اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

بنام جناب ڈاکٹر فیروز الدین صاحب۔ سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۲ اکتوبر ۵۳ء

موضوع تراویح پر روایت ابن عباس کی تحقیق، روایت کے مخارج، محدثین کے ضعیف ہونے کی وجہ ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان کا چہرہ، تہذیب کے راویوں کی ثقاہت، امام شعبہ کی تکذیب کی کہانی، صرف راوی کا ضعیف ہونا روایت کے ضعیف ہونے کا معیار نہیں ہے، حدیث کا صحیح ہونا اور ہے مقبول ہونا اور ہے، حدیث مقبول کی حقیقت، تلقی بالقبول کی وضاحت اور اسکی قسمیں صحیح نہ ہونے کے باوجود مقبول ہیں۔ سائب بن یزید کی ۲۰ تراویح کی روایت روائتی نقطہ نظر سے بخاری کی روایت کے لگ بھگ ہے، حدیث مقبول تواتر کا مقام حاصل کر لیتی ہے۔

حبّی فی اللہ ‏ ‏ ‏ ‏ وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ نے موضوع تراویح پر حدیث ابن عباس کے متعلق جو بات پوچھی ہے اس سے ذہنی افتاد کا پتہ چلتا ہے، مسرت ہے کہ آپ میں حق کے لئے طلب وجستجو ہے۔ دراصل کچھ غلط فہمیاں ہیں اگر وہ درمیان سے ہٹ جائیں تو پھر کوئی سخلش نہیں ہے۔

پہلے پوری روایت سن لیجئے۔

۱۔ بیہقی نے السنن الکبریٰ میں یہ روایت اس طرح درج کی ہے۔

حدثنا ابو احمد ابن عدی الحافظ ثنا عبد اللہ بن محمد

ابن عبد العزیز ثنا منصور بن ابی مزاحم ثنا ابو شیبۃ
عن الحکم عن مقسم عن ابن عباسؓ کان النبی صلی اللہ
علیہ وسلم یصلی فی شھر رمضان فی غیر جماعۃ بعشرین
رکعۃ والوتر۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان
میں بغیر جماعت کے ۲۰ رکعت اور وتر پڑھتے تھے۔

۲۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ روایت اس طرح ہے۔

حدثنا یزید انبأنا ابراھیم بن عثمان عن الحکم عن مقسم
عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان
یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ والوتر

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں ۲۰ رکعت اور
وتر پڑھتے تھے۔

۳۔ مسند عبد بن حمید میں یہ روایت یوں ہے۔

حدثنا ابو نعیم حدثنا ابو شیبۃ عن الحکم عن مقسم
عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کان یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ والوتر۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں ۲۰ رکعت
اور وتر پڑھتے تھے۔

۴۔ طبرانی میں اس طرح ہے۔

حدثنا البغوی حدثنا منصور بن ابی مزاحم حدثنا
ابو شیبۃ عن الحکم عن مقسم عن ابن ان رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ والوتر

حضور انورؐ رمضان میں ۲۰ رکعت اور

وتر پڑھتے تھے۔

۵۔ حافظ ذہبی نے معجم بغوی کے حوالہ سے اس طرح درج کی ہے

انبأنا منصور بن ابی مزاحم انبأنا ابو شیبۃ عن الحکم

عن مقسم عن ابن عباس کان رسول اللہ صلی اللہ وسلم

یصلی فی رمضان فی غیر جماعۃ بعشرین رکعۃ والوتر۔

حضور انورؐ رمضان میں بغیر جماعت کے ۲۰ رکعت اور وتر پڑھتے تھے۔

آپ نے دیکھا کہ اس روایت کی تخریج کرنے والے یہ آئمہ حدیث ہیں۔

امام ابوبکر احمد بن الحسین المتوفی ۴۵۸ھ۔ ابو بکر عبداللہ بن محمد ابن ابی شیبہ المتوفی ۲۳۵ھ۔ عبد بن حمید المتوفی ۲۴۹ھ۔ ابوالقاسم سلیمان بن احمد بن ایوب الطبرانی المتوفی ۳۶۰ھ اور ابو محمد الحسین بن مسعود البغوی ۵۱۰ھ۔

حفاظ حدیث کا فیصلہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں یہ حدیث ضعیف ہے اس میں دلیل بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ص۱۴۱ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں اس کی سند ضعیف ہے۔ ج۸ ص۳۱۰ فتح الباری

علامہ زیلعی فرماتے ہیں حدیث معلول ہے۔ نصب الرایہ ج۲ ص۱۵۳

علماء نے اس حدیث کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ان میں ایک راوی نامی ابراہیم بن عثمان کوفی ہے۔ امام احمد، ابن معین، بخاری نسائی، ابوحاتم الرازی، ابن عدی، ابو داؤد، اور احوص نے اس کو ضعیف بتایا ہے۔ امام ترمذی نے منکر الحدیث اور جوزجانی نے ساقط کہا ہے۔ ابو علی نیشاپوری کا فتویٰ ہے کہ قوی نہیں ہے۔ نسائی اور دولابی نے متروک الحدیث

بتایا ہے۔ یحییٰ بن معین نے یزید بن ہارون کی طرف نسبت کر کے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ابراہیم سے زیادہ اپنے زمانہ میں عادل کوئی نہ تھا۔ یزید کو خود پاس سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ یزید ابراہیم کے اس وقت منشی رہے ہیں۔ جبکہ واسط کے محکمہ قضا میں مقرر تھے ابن عدی کہتے ہیں کہ ان کی حدیثیں اچھی ہیں۔ تہذیب ص۱۴۴۔ اور یہ ابراہیم بن ابی حبہ سے بہتر ہیں ص۱۴۵ ج۱ —— یہ شاگرد ہیں اپنے ماموں حکم بن عتیبہ ابو اسحاق السبیعی ولید بن مسلم، زید بن الحباب، یزید بن ہارون اور علی بن الجعد کے ۲۷۵ھ ان کی تاریخ وفات ہے۔

ائمہ نقد و رجال نے ان کو خواہ کچھ کہا ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ ہیں یہ ابن ماجہ اور ترمذی کے راویوں میں سے شاید اسی بنا پر حافظ عسقلانی نے ان کا تذکرہ لسان المیزان میں نہیں کیا خود فرماتے ہیں۔

فرأیت ان احذف منه اسماء من اخرج له الائمة الستة

میری رائے ہوئی کہ کتاب سے ان لوگوں کے نام ہٹا دوں جن سے ائمہ ستہ نے روایات لی ہیں۔

بلکہ ان کا ذکر تہذیب التہذیب ۲۵۷ نمبر پر کیا ہے اور خود حافظ عسقلانی کا دعویٰ ہے کہ تہذیب میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے وہ

اما ائمة موثوقون واما ثقات مقبولون واما قوم ساء حفظهم ولم يطرحوا واما قوم تركوا وجرحوا

قابل اعتماد امام ہیں، یا اچھے مقبول ہیں یا پھر وہ ہیں جن کے حافظہ پر حرف گیری ہوئی ہے۔ مگر ان کو نظر انداز نہیں کیا گیا یا وہ ہیں جو متروک اور مجروح ہیں۔ ص۳ لسان المیزان

حافظ صاحب نے ان کو تقریب میں متروک الحدیث کہہ کر طبقہ سابعہ میں شمار کیا ہے اور معلوم ہے کہ متروک حافظ صاحب اسے کہتے ہیں

من لم یوثق البتۃ وضعف مع ذالک بقادح ص۳

اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم بن عثمان حافظ عسقلانی کے نزدیک اسس ئے ضعیف نہیں ہیں کہ ان پر جھوٹ کی تہمت ہے اور یا ان کو جھوٹا قرار دیا گیا ہے اسی بنا پر شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں

ابو شیبہ جد ابو بکر بن ابی شیبہ	ابو شیبہ اتنا ضعیف نہیں
آں قدر ضعف ندارد روائت	ہے کہ اسکی روایت کو پھینک
اورا مطروح مطلق ساختہ شود	دیا جائے

ص ۱۲۶

شاید آپ کو شبہ ہوا کہ المصابیح میں حافظ جلال الدین سیوطی کا دعوی ہے

ومن یکذبہ مثل شعبۃ فلا یلتفت الی حدیثہ ص۲۲

جس کو شعبہ جھوٹا کہے اسکی حدیث قابل التفات نہیں ہے

ٹھیک ہے مگر امام شعبہ کی تکذیب کی کہانی بڑی عجیب ہے اور شاید نقد و رجال کے سارے دفتر میں کسی کو جھوٹا کہنے کی اس سے زیادہ مزیدار کہانی کوئی نہ ہو۔ یہ دعوے کہ ابراہیم کو شعبہ نے جھوٹا قرار دیا۔ آئیے ذرا اس کا پوسٹ مارٹم کر لیجئے۔ تہذیب میں حافظ عسقلانی نے لکھا ہے۔

کذبہ شعبۃ فی قصۃ ص۱۴۵

ایک واقعہ میں شعبہ نے ان کی تکذیب کی ہے۔

یعنی مطلق روایت حدیث میں دروغ گو نہیں ہیں۔

بلکہ امام شعبہ نے ان کو ایک واقعہ میں جھوٹا کہا ہے ۔ وہ واقعہ کیا ہے۔ کیا

کوئی ایسا واقعہ ہے جس میں خود ابراہیم موجود تھے اور انہوں نے اسے جانتے پہچانتے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ نہیں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے۔ اسکی کہانی حافظ ذہبی کی زبانی سنیئے۔

حافظ صاحب میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں کہ ابراہیم بن عثمان نے بحوالہ حکم عن ابن ابی لیلیٰ یہ تاریخی انکشاف کیا ہے کہ صفین کی جنگ جو حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان ہوئی اس میں شرکت کرنے والوں میں ستر اہل بدر تھے۔

شهد صفين من اهل بدر سبعون ص۲۳

امام شعبہ فرماتے ہیں کہ ابراہیم کا یہ کہنا غلط ہے اور جھوٹ ہے کیونکہ میں خود ابراہیم کے استاد حکم سے ملا ہوں میں نے اس موضوع پر مذاکرہ کیا ہے میرے سے انہوں نے خود بتایا کہ صفین میں بدر والوں میں سے سوائے حضرت خزیمہ کے کوئی نہ تھا۔ سن لیا آپ نے کہ امام شعبہ نے ابراہیم کو کس واقعہ میں جھوٹا کہا ہے صرف اس میں کہ صفین میں ستر بدری شریک تھے یہ جھوٹ ہے۔ سچ کیا ہے کہ حضرت خزیمہ کے سوا کوئی نہ تھا۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں سبحان اللہ! یعنی دوسرے کو جھوٹا کہہ کر خود کیا عجیب انکشاف فرمایا کیا یہ سچ ہے کہ حضرت خزیمہ کے سوا جنگ صفین میں کوئی بدری نہ تھا۔ کیا حضرت علی بدری نہیں ہیں؟ عمار بن یاسر بدری نہیں ہیں؟ ذہبی لکھتے ہیں:

اما شهد علی اما شهد ها — کیا حضرت علی موجود نہ تھے

عمار؟ — کیا حضرت عمار نہ تھے؟

انصاف فرمایئے اگر جھوٹا ہونے کا معیار یہی ہے تو یہ دھبہ تو بقول امام ذہبی خود شعبہ کے دامن پر بھی لگا ہوا ہے۔ اس بنیاد پر اگر ابراہیم کو جھوٹا قرار دیتے ہو تو شعبہ خود بھی نہیں بچتے۔ اس لئے ابراہیم کے جھوٹا ہونے کی کہانی صرف ایک افسانہ ہے جس کی تاریخ کے بازار میں کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ بات اپنی جگہ با

درست ہے کہ ابراہیم کے متعلق علماء رجال کا فیصلہ ہے ھو متفق علی ضعفہ اس کے ضعف پر سب ہی متفق ہیں۔ نصب الرایہ صہ ۱۰۱ امام بیہقی فرماتے ہیں تفرد بہ ابو شیبۃ وھو ضعیف جہ ۲ صہ ۴۹۶ اس حدیث کا بیان کرنے والا صرف ابو شیبہ ہے اور وہ ضعیف ہے نووی فرماتے ہیں متفق علی ضعفہ جہ ۱ صہ ۸۷

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حدیث کی صحت کی رواۃ سے الگ ہو کر کوئی بیرونی ضمانت نہیں ہے کیا یہ واقعہ ہے کہ ہر ایسی حدیث جس کے راوی پر نقد و رجال کے ائمہ نے بالاتفاق ضعیف ہونیکی مہر لگادی ہو ضعیف ہے؟ اگر یہ واقعہ ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ حسن بن عمارہ کے حوالہ سے خود بخاری کی کتاب المناقب میں حدیث موجود ہے۔ حالانکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ اطبقوا علیٰ ترکہ ان کے متروک ہونے پر علماء کا اتفاق ہے یعنی صرف متروک الحدیث نہیں ہیں بلکہ اس پر آئمہ کا اتفاق ہے ایک اور راوی اسید بن الجمال ہیں ان سے امام بخاری نے کتاب الرقاق میں ایک حدیث روایت کی ہے مگر ان کا حال یہ ہے نسائی متروک کہتے ہیں۔ ابن معین نے جھوٹی حدیثیں گھڑنے کا ان پر الزام لگایا ہے ابن حبان کا دعویٰ ہے کہ یہ نہ صرف مناکیر لاتا ہے بلکہ احادیث کی چوری بھی کرتا ہے۔ حتی کہ مقدمہ میں حافظ عسقلانی نے صاف لکھ دیا کہ لم ارلاحد فیہ توثیقاً میرے علم میں اسے کسی نے نہیں سراہا۔ معلوم ہوا کہ ارباب فن کے یہاں صرف راوی کا ضعیف ہونا ہی روایت کے ضعیف ہونے کا معیار نہیں ہے۔ روایت کا سند کے لحاظ سے صحیح ہونا اور بات ہے اور مقبول ہونا اور چیز ہے۔ بخاری کی روائتیں اپنے راویوں پر جرح کی وجہ سے خواہ کیسی ضعیف ہوں مگر مقبول ہیں کیونکہ ان کی پشت پر تلقی امت بالقبول کی مہر ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے نظم الدرر میں ہیں مقبول کی تعریف

یہ بتائی ہے

المقبول ما تلقاہ العلماء بالقبول وان لم یکن لہ اسناد صحیح او اشتہر عند ائمۃ الحدیث بغیر نکیر منہم او وافق آیۃ من القرآن او بعض اصول الشریعۃ حیث لم یکن فی سندہ کذاب۔ (التحفۃ المرضیہ ص۲۹۴)

مقبول وہ ہے جسے علماء نے اپنا لیا ہو چاہے اس کی سند صحیح نہ ہو یا بلا نکیر ائمہ حدیث کے یہاں مشہور ہوگئی۔ کسی قرآنی آیت یا اصول شریعت کے موافق ہو بشرطیکہ سند میں کذاب نہ ہو۔

علامہ سخاوی شرح الالیفہ میں فرماتے ہیں۔

اذا تلقت الائمۃ الضعیف بالقبول یعمل لہ علی الصحیح (التحفہ ص۲۹۴)

جب امام ضعیف کو اپنا لیں تو اس پر عمل کیا جائے گا۔

علامہ الشبرخیتی مالکی نے الاربعین النوویۃ کی شرح میں لکھا ہے۔

ومحل کونہ لا یعمل بالضعیف فی الاحکام ما لم یکن تلقتہ الناس بالقبول (شرح الاربعین)

ضعیف پر احکام میں عمل نہ کرنے کا محل اس وقت ہے جب کہ اسے تلقی بالقبول کا مقام حاصل نہ ہو۔

الافصاح علی نکت ابن الصلاح میں لکھا ہے۔

ومن جملۃ صفات القبول التی لم یتعرض شیخنا الحافظ العراقی ان یتفق العلماء علی العمل بمدلول حدیث فانہ یقبل حتی یجب العمل بہ وقد صرح بہ جماعۃ من ائمۃ الاصول (ص۲۹۴)

مقبول کی ان تمام صفتوں میں سے جن کا حافظ عراقی نے ذکر نہیں کیا ہے ایک یہ ہے کہ کسی حدیث کے عمل پر علماء متفق ہو جائیں یہ ہی مقبول ہے اس پر عمل واجب ہے۔ اس کی ائمہ اصول نے تصریح کی ہے۔

جو اصول کسی بھی حدیث کے مقبول ہونے کا محدثین نے بتایا ہے اس کی بنیاد پر بے شمار حدیثوں کو خود محدثین نے با وجود سند ضعیف ہونے کے مقبول بتایا ہے۔ میں چند مثالیں عرض کرتا ہوں۔

ابو داؤد، بیہقی اور مسند احمد میں ہے

لا زکوٰۃ فی مال حتی یحول علیہ الحول

: حولان حول کے بغیر زکوٰۃ نہیں ہے

تلخیص میں حافظ صاحب فرماتے ہیں اس میں حسان بن حسان راوی ضعیف ہے یمانی التحفۃ المرضیہ میں لکھتے ہیں۔

من ھٰذا الباب ای من الضعیف المتلقی بالقبول حدیث لا زکوٰۃ فی مال الخ (ص ۲۶۵)

ان ضعیف حدیثوں میں سے جن کو درجہ قبول حاصل ہے یہ حدیث لا زکوٰۃ الخ ہے۔

مشہور حدیث ہے۔

لا وصیۃ لوارث وارث کیلئے کوئی وصیت نہیں ہے

فتح الباری میں حافظ عسقلانی کہتے ہیں لا یخلوا سناد کل منھا من مقال اس کی ہر سند میں کلام ہے علامہ یمانی فرماتے ہیں لیس لہ اسناد ثابت ص ۲۶۵ اس کی کوئی سند ثابت ہی نہیں ہے مگر امام شافعی فرماتے ہیں۔

حدیث لا وصیۃ لوارث لا یثبتہ اھل العلم بالحدیث ولکن العامۃ تلقتہ بالقبول و عملوا بہ۔

یہ حدیث اہل علم کے یہاں ثابت نہیں لیکن عوام میں اسے درجہ قبول حاصل ہے۔

دار قطنی میں حدیث ہے۔

الماء لا ینجسہ شیئ الا ما غلب علی ریحہ اوطعمہ اولونہ

اس کی سند میں رشدین سعد متروک ہے نووی کہتے ہیں اتفق المحدثون علی تضعیفہ محدثین کا اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے۔ لیکن قاضی شوکانی مضیۃ میں فرماتے ہیں

قد صارت مما اجمع علی معناھا وتلقی بالقبول ص۲۶۷

یہ وہ حدیث ہے جس کے معنے صحیح ہیں اور اسے شرف قبول حاصل ہے۔

فتح میں حافظ صاحب نے بخاری کی تاریخ کبیر کے حوالہ سے ابو ہریرہ کی یہ حدیث لکھی ہے

من زرعہ القیئ وھو صائم فلیس علیہ القضاء وان استقاء فلیقض

روزے کی حالت میں اگر قے آجائے قضا نہیں ہے اور اگر قے کرے تو قضا ہے۔

امام بخاری فرماتے ہیں حدیث صحیح نہیں ہے عبداللہ قطعاً ضعیف ہے ابوداؤد و امام احمد کے حوالہ سے کہتے ہیں قطعاً کچھ نہیں ہے ترمذی کہتے ہیں ہمیں پتہ نہیں ہے لیکن حافظ عسقلانی اس کے باوجود فرماتے ہیں لکن العمل علیہ عند

اهل العلم۔ اس پر اہلِ علم کا اتفاق ہے۔ وعلیہ العمل عند اھل العلم

ترمذی میں حدیث ہے سراقہ کہتے ہیں۔

رسول اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم یقید الاب من ابنہ ولا یقید الابن من ابیہ۔	حضور انور بیٹے سے باپ کا قصاص لیتے تھے مگر باپ سے بیٹے کا نہیں لیتے تھے۔

امام ترمذی لکھتے ہیں۔ لیس اسنادہٗ بصحیح مگر اس کے باوجود العمل علیٰ ھٰذا عند اکثر اھل العلم

یہ اور اس قسم کی اور بھی مثالیں ہیں جہاں خود محدثین اور ائمہ نقد و رجال نے باوجود سند ضعیف ہونے کے حدیث کے مقبول ہونے کا فتوےٰ دیا ہے۔ اب ذرا انصاف سے کام لیجئے۔ وہ حدیث ضعیف جسے علماء اپنالیں ائمہ قبول کرلیں وہ تو حدیث مقبول ہو جائے۔ مگر جسے وہ قبول کرلیں جن کا عمل بھی دین میں حجت ہے اور جن کی خاطر پوری آبادی کے عمل کو قابل دلیل قرار دیا گیا ہے۔ یعنی خلفاء راشدین زادالمعاد میں حافظ ابن القیم فرماتے ہیں۔

وعمل اھل المدینۃ الذی یحتج بہ ماکان فی زمن الخلفاء الراشدین ج۱ صـ۶۸	اہلِ مدینہ کا عمل زمانہ خلافت راشدہ والا حجت ہے۔

وہ مقبول نہ ہو — فانا للہ والی اللہ المشتکی۔ کیونکہ زمانۂ حضرت عمر میں بیس تراویح کا ہونا تو سب ہی مانتے ہیں دوسری روایات کے علاوہ حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں جو بحوالہ امام مالک یہ روایت لکھی ہے۔

روی مالک من طریق یزید بن خصیفۃ عن السائب بن

يزيد عشرين ركعة

امام مالک نے بحوالہ یزید بن خصیفہ بیس رکعت روایت
کی ہیں۔

اس کی تاریخی حیثیت تو بالکل بخاری کی روایات کی ہے۔ خود امام بخاری اپنے استاد عبداللہ بن یوسف کے حوالہ سے اپنی صحیح میں باب اقتناء الکلب میں اسی سند پر مشتمل حدیث لائے ہیں۔ حدیث یہ ہے۔

اخبرنا مالك عن يزيد بن خصيفة ان السائب بن يزيد
حدثه انه سمع سفيان بن ابی زهير رجلا من ازدشنوءة
وكان من اصحاب النبی صلے الله عليه وسلم الخ ص۴۵ ج۲

امام بیہقی نے السنن الکبریٰ میں جو روایت درج فرمائی ہے وہ بھی اسی کے لگ بھگ ہے جسے حافظ سیوطی نے بھی المصابیح میں باسناد صحیح کہا ہے۔ حافظ محمد بن نصر مروزی نے قیام رمضان میں بحوالہ امام اعمش سلیمان بن مہران عن زید بن وہب کوفہ کے گورنر عبداللہ بن مسعود کے متعلق بھی یہ انکشاف کیا ہے۔

كان يصلى عشرين ركعة ويوتر بثلاث ص۹۱

تراویح بیس رکعت اور وتر تین رکعت پڑھتے تھے۔

تہذیب صفحہ ۴۲۱ میں حافظ عسقلانی نے محمد بن کعب القرظی کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ حضرت علی کے زمانہ خلافت میں پیدا ہوئے تھے اور تھے بھی اپنے وقت میں قرآن کی تفسیر کے بڑے عالم۔ حافظ محمد بن نصر مروزی نے ان کا بیان لکھا ہے کہ :۔

كان الناس يصلون فی زمانِ عمر بن الخطاب فی رمضان

عشرین رکعۃ ص۹۱

لوگ زمانہ عمر میں رمضان میں بیس تراویح پڑھتے تھے۔

روایت اگرچہ مرسل ہے اور مرسلات کے بارے میں اگرچہ امام ابوحنیفہ مالک اور احمد کا مسلک قبول کر لینا ہے مگر امام شافعی کے متعلق الآمدی نے نقل کیا ہے کہ ایسے مرسلات ۔ ان یکون المرسل قد عرف من حالہ انہ لا یرسل عمن فیہ علۃ من جہالۃ او غیرھا کمراسیل ابن المسیب فھو مقبول ۔ احکام ص۱۷۸ ج۲

جن بزرگوں کی عدالت مسلّم ہو یقیناً ان سے غلط انتساب کی توقع نہیں ہو سکتی یہ کھلا ہوا ایک عقلی قانون ہے ۔ الآمدی لکھتے ہیں۔ والمختار قبول مراسیل العدل مطلقاً ص۶۱

یہ تاریخی شواہد کہہ رہے ہیں کہ ابن عباس کی روایت کو سب سے پہلے تلقی الخلفاء بالقبول کی قوت حاصل ہے ۔ اسی تلقی کو امام ترمذی نے اپنی سنن میں اس طرح بیان کیا ہے۔

واکثر اھل العلم علی ما روی عن علی وعمر وغیرھما من اصحاب النبی صلے اللہ علیہ وسلم عشرین رکعۃ ص۹۹ ج۱

اہل علم کی اکثریت بیس ہی پر ہے جو حضرت علی، حضرت عمر اور دیگر اصحاب نبی صلعم سے ثابت ہے۔

یہ تو تلقی الخلفاء بالقبول ہے ۔ اصول میں بتایا گیا ہے کہ ایسی حدیث ضعیف جس کے مدلول کو

ائمہ نے اپنا لیا ہو	تلقتہ الائمۃ بالقبول
علماء نے اپنا لیا ہو	تلقتہ العلماء بالقبول

امت نے اپنا لیا ہو　　　تلقته الامة بالقبول

حدیث مقبول کا درجہ حاصل کر لیتی ہے بلکہ حافظ سخاوی تو یہاں تک فرما گئے

انه بمنزل منزلة المتواتر

اور امام شافعی اسے نقل عامہ عن عامہ کے نام سے پکارتے ہیں اور اس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے۔

کان اقوی فی بعض الامر من نقل واحد عن واحد وکذالک

وجدنا اهل العلم علیه مجتمعین (صـ۲۳ رسالہ)

جسے امام شافعی نقل عامہ عن عامہ فرماتے ہیں اسی کا نام تواتر عملی اور توارث ہے۔ بلکہ حافظ ابن حزم ظاہری کے حوالہ سے علامہ طاہر جزائری نے یہاں تک لکھ دیا کہ کبھی خبر مرسل کی پشت پر نقل کی اجماعی طاقت ہونے کی وجہ سے سند کی حاجت ہی نہیں رہتی۔ اور اس بنا پر حدیث مرسل پر عمل کرنا متواتر کی طرح واجب ہو جاتا ہے۔ آخر مصنفین صحاح سے ہم جو ان کی کتابیں روایت کرتے ہیں۔ یہ بھی تو مراسیل ہی ہیں۔ جیسا کہ حافظ ابراہیم الوزیر نے الروض الباسم کے اندر لکھا ہے۔ کیونکہ جس معیار کی سندیں خود ان کتابوں میں موجود ہیں۔ بلا ریب ہماری سندیں جن کے ذریعے ہم ان کتابوں کے مصنفین تک پہنچتے ہیں۔ اس قسم کی نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود محدثین نے ان مرسلات کو اقوال مراسیل قرار دے کر قابل پذیرائی بتایا ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مولانا عبدالرحمن صاحب فاضل دیوبند مولوی فاضل استاذ العربیہ گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ کیمپ نام۔

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۴ اکتوبر ۱۹۵۳ء

اللہ کی صفت اور اس کی قسمیں، مسلک تاویل یا تفویض، کلام کی اور علم کلام کی بیچارگی، صاحب روح المعانی کی کلام نفسی پر تقریر، شاہ ولی اللہ کا استعجاب اور الجوینی کی حیرت، معتقدات میں اطمینان کی راہ کلام نہیں بلکہ قرآن ہے علم کلام اپنوں کے لئے نہیں بلکہ غیروں سے مقابلہ کے لئے ہے۔ امام غزالی کا اعتراف قرآن میں غیبی حقائق کے ماننے کا مطالبہ نہ کہ جاننے کا، قرآن میں حقائق کی طرح مطالب وحی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ وحی عقل کی درماندگیوں کو دور کرنے کیلئے ہے۔ عقل سے آگے نبوت ہے، مجدد الف ثانی، علامہ ابن خلدون کے تاثرات انسان کی فکری گمراہی کی داستان، فلاسفہ کے انکار کا حافظ ابن تیمیہ نے تجزیہ کیا ہے، شیخ اکبر کا امام رازی کے نام خط۔ الجام العوام میں امام غزالی کا اقرار۔

مکرم! السلام علیکم

دوسرے مسائل کی طرح کلام بھی متکلمین کی دیرینہ دلچسپیوں کا سامان ہے۔ جو لوگ تنزیہہ کے بہانے تاویل کرنے کے خوگر ہیں ان کا کہنا ہے کہ کلام خدا کی صفت فعلی ہے صفت ذاتی نہیں۔ اشاعرہ نے ذرا فراخ حوصلگی سے کام لیا ہے اور گویا بخیال خویش عقل و نقل میں تطبیق کی مفید اور کارآمد تدبیر بھی یہی ہے کہتے ہیں کلام کی دو قسمیں ہیں۔ نفسی اور لفظی۔ نفسی صرف مدلول لفظ اور لفظی حروف و صورت کے مرکب کو کہتے ہیں۔ نفسی خدا کی صفت ذاتی ہے لفظی صفت نہیں ہے۔ نفسی مخلوق نہیں لفظی مخلوق ہے۔ قرآن کی صورت میں جو کچھ موجود ہے کلام نفسی نہیں بلکہ کلام لفظی ہے مگر قرآن مخلوق نہیں کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے بایں معنے کہ یہ خدا کی صفت کلام کے لئے نشانِ راہ ہے نشانِ راہ کو مخلوق

کہنے سے گریز ناگزیر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی مخلوق کہتے کہتے خدا کے اس کلام کو جو اس کے لئے صفت قدیم ہے مخلوق کہہ دے۔ بالفاظ دیگر ہے تو مخلوق مگر سداً للذریعہ نہ کہنا چاہئیے کیسا غلط اور کس قدر لوچ خیال ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ قرآن میں خود قرآن کے لئے جہاں کلام اللہ بولا گیا ہے اس سے قطعاً اور یقیناً کلام لفظی مراد ہے نہ کہ نفسی۔

قد کان فریق منھم یسمعون	ایک فریق ان میں سے اللہ کا کلام
کلام اللہ	سنتا ہے

میں خدا کی صفت قدیم کو سننے کا ذکر ہو رہا ہے اور کہا۔

یریدون ان یبدلوا کلام اللہ	یہ لوگ اللہ کے کلام کو بدلنا چاہتے ہیں

میں یہودی خدا کی صفت قدیم کو بدلنا چاہتے تھے۔ بات چونکہ بڑے لوگوں کے منہ سے نکل رہی ہے اس لئے مانتے ہیں ورنہ جہاں تک عقل کا تقاضا ہے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن اشخاص سے شخصیتوں کی گرفت ڈھیلی ہوئی ہے اور قدرت نے جن کو آزاد ماحول میں سوچنے کی نعمت ارزاں فرمائی ہے انہوں نے تنزیہہ کی بنیادوں پر بنائے ہوئے تاویل کے اس گھروندے کو ڈھا کر تفویض کے محل میں پناہ لی۔

تین مسئلے صفاتِ الٰہی، فوقیت اور کلام ان کو کلامی نقطہ نگاہ سے سمجھنے کی میں نے جس قدر بھی کد و کاوش کی اسی قدر سکون کی جگہ اضطراب اور اطمینان کی جگہ بے قراری کا نشانہ بنا۔ صفات میں تاویل ہو یا توقف ان کو بلا تاویل مانا جائے یا تشبیہہ اور تمثیل کے تیشے سے ان کی مرمت کی جائے۔ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی تشریحات تو کھلم کھلا صفات کو حقائق کے درجے میں پیش کرتی ہیں۔ لیکن متکلمین کو اصرار ہے کہ کلام کو واقعہ اور حقیقت کے

طور پر نہیں بلکہ صرف ایک نظریہ کے درجے میں مانا جائے اور نظریاتی طور پر ماننا بھی تاویل و توجیہ کا ماننا ہو۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ کلام اللہ کا مفہوم معنیٰ قائم بالذات بلا حرف وصوت کے سوا کچھ نہیں ــــ آخری دور میں علامہ محمود آلوسی ان لوگوں میں سے ہیں جن کی علمیت کی شہرت ہے اور نہ صرف یہ کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں ان مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی ہے بلکہ خود ان کو اپنے بارے میں دعویٰ ہے۔

اوردھا فی ھذا الکتاب — میں ان مسائل کو ایسے انوکھے طریق پر

باسلوب عجیب وتحقیق غریب — بیان کروں گا کہ اس انداز پر تم نے کبھی نہ سنا ہوگا۔

لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بات سُلجھنے کی جگہ اور اُلجھ گئی۔ پہلے کلام کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے دو گرہوں کو کھولنا پڑتا تھا اور اب دو کی جگہ چھ کو کھولنا پڑتا ہے۔

بیچارے متکلمین نے بڑی رد و کد، تگ و دو اور کوشش کے بعد یہ راہ نکالی تھی کہ کلام کو دو قسموں نفسی اور لفظی میں تقسیم کیا۔ مؤخر الذکر کو اوّل کے لئے نشان بتایا۔ نفسی کو صفتِ قدیم اور لفظی کو حادث اور اس کا وجود خدا کے ساتھ ممتنع بتایا۔ شرح عقائد میں ہے۔

ویمتنع قیام اللفظی — کلام نفسی حادث کا اللہ کی ذات کے

بذاتہ تعالیٰ فیتعین النفسی — ساتھ قیام ناممکن ہے صرف کلام نفسی

القدیم — قدیم ہے اور یہی اللہ سبحانہٗ کی صفت ہے۔

لیکن بے چارے نہ بتا سکے اور انگلی رکھ کر یہ متعین نہ کر سکے کہ نفسی کیا ہے۔ اس کا کوئی وجود بھی ہے یا نہیں۔ علامہ محمود آلوسی نے یہ کہہ کر اسے اور

چیستان بنادیا کہ ۔

کلام نفسی حق تعالیٰ شانہٗ کی صفت قدیم ہے اور لفظی کے خدا کے لئے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کلمات غیبیہ جن میں کسی طرح کا مادہ نہ ہو نہ حسی نہ خیالی اور نہ روحانی اور یہ کلمات ازلیہ ہوں قرآن اسی معنے کے لحاظ سے کلام اللہ ہے کہ وہ کلماتِ غیبیہ ہیں جو مجرد عن المواد ہیں قرآن کے نزول کا مطلب یہ ہے کہ کلماتِ غیبیہ نے روحانی، خیالی اور حسی مواد میں صوتوں کا لباس پہن لیا ہے۔

یہ ہے تحقیق ۔ فرمایئے آپ کیا سمجھے ۔کسی کا پتہ نہیں میں تو اپنی کہتا ہوں کہ میں کچھ نہیں سمجھا ۔شائد میری کوتاہ علمی اس میں حائل ہو مگر جو اپنے تئیں سمجھا ہوا سمجھتے ہیں وہ بھی حیران ہیں اور ہیں بھی فن کے امام شاہ ولی اللہ حکیم الامت ہیں اور اس قسم کے مسائل میں ان کی ژرف نگاہی بھی مشہور ہے ۔فرماتے ہیں۔

لا ادری ما الذی یسمونہ کلا مًا نفسیًّا	مجھے پتہ نہیں کہ وہ کس چیز کو کلام نفسی کہتے ہیں۔

امام ابو محمد عبداللہ الجوینی امام الحرمین کے والد کہتے ہیں :۔

انی کنت برھۃ من الدھر متحیرا فی ثلاث مسائل مسئلۃ الصفات مسئلۃ الفوقیۃ ومسئلۃ الحرف و الصوت	میں ایک زمانے تک تین مسئلوں میں حیران رہا ۔مسئلہ صفات ،مسئلہ فوقیت اور مسئلہ حرف و صوت ۔

آگے سنئے :۔

وکنت متحیرا فی الاقوال المختلفۃ الموجودۃ	اور میں کتابوں میں موجود مختلف باتوں پر حیران تھا

فی کتب اہل العصر

یہ واقعہ ہے کہ اس چیستان کے سہارے کم ازکم کلام اللہ کی حقیقت کو سمجھنا ناممکن ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر دین اور دینی حقائق کے بارے میں خود مطمئن ہونے اور دوسروں کو مطمئن کرنے کے لئے طبعی راہ وہی ہے جو قرآن نے پیش کی ہے تو پھر علم کلام کا کیا فائدہ ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میں تو وہی کچھ کہوں گا جو الجام میں امام غزالی، اور نصیحتہ المسلمین میں امام ابومحمد جوینی نے کہدیا ہے۔

قرآن کے دلائل غذا کے درجے میں ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کلامی موشگافیاں دوا کی حیثیت میں ہیں کچھ کے لئے سود مند ہیں مگر بہتوں کو اس کے استعمال سے نقصان ہو رہا ہے۔ قرآنی تصریحات پانی کی طرح ہیں دودھ پیتا بچہ بھی پی سکتا ہے لیکن کلامی رکچن کے روغنی کھانے صرف طاقت ور ہی کھا سکتے ہیں اور وہ بھی زیادہ استعمال سے گاہ گاہ بیمار ہو جاتے ہیں۔

کلامی بازاروں میں شور مچا ہوا ہے کہ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں بدعتوں کا ہجوم نہ تھا۔ عقلیت کا ذریب نہ تھا۔ آنے والے دور نے کروٹ لی اس لئے متاخرین کو بدعت اور عقلیت کے مریضوں کا علاج علم کلام کی راہ سے کرنا پڑا۔

علم الکلام راجع الی علم معالجۃ المرضی بالبدع	علم کلام کا مقصد مریضان بدعت کا علاج کرنا ہے۔

الجام ہی میں امام غزالی نے اس کا جواب دیا ہے اور خوب دیا ہے۔

صحابہ اور تابعین کو اپنی دینی زندگی کے لئے یہود و نصاریٰ سے مقابلہ کرنا پڑا۔ رسالت کے اثبات اور قیامت کے وجود پر ان سے بحث و مباحثے ہوتے

لیکن اس کے باوجود عہد رسالت، صحابہ اور تابعین میں ان دلائل سے ہٹ کر جو قرآن نے پیش کر دیئے تھے کبھی بھی کسی دوسرے میگزین سے امداد کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ان کو یقین کامل تھا۔

من لم يقنعه ادلة القرآن	جسے قرآنی دلائل سے اطمینان نہیں ہوتا
لا يقنعه الا السيف والسنان	اسکا منہ بند کرنیوالی چیز تلوار کے سوا اور کیا
فما بعد بيان الله بيان	ہے اللہ کے بیان کے بعد کوئی بیان نہیں ہے

واقعہ یہ ہے کہ کلامی بازاروں میں ادلتہ القرآن والسنتہ سے ہٹ کر جو دلائل بھی پیش کئے گئے اس سے صحت کی جگہ بیماری پیدا ہوئی۔ سکون کی جگہ اضطراب اور پریشانی نے لے لی۔

میں سمجھتا ہوں کہ علم الکلام کا اساسی مقصد اسلامی سوسائٹی کے لئے عقائد کی فراہمی کا کوئی خاص عقلی نہج پر سلیبس تیار کرنا نہ تھا بلکہ اس کی اصلی غایت یہ اور صرف یہ تھی کہ جن لوگوں کی طبیعتوں نے کفر کی گود میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اپنے اس فیصلے پر رہتے ہوئے اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے اور اسلام پر حملہ کے لئے یونانی فلسفہ کے میگزین سے ہتھیار لے کر آئے تھے اور چاہتے تھے کہ اس طرح اسلام کی عمارت گرا دیں۔ اصول جنگ کے مطابق یہ تو سب ہی کرتے ہیں کہ اپنے ہتھیاروں سے دوسروں کا مقابلہ کریں۔ اپنی قوت دوسروں کے مقابلہ پر صرف کریں صحیح ہے کہ مدمقابل کی طاقت کم ہو تو شکست کھا جاتا ہے مگر خود اپنا بھی کچومر نکل جاتا ہے۔ اسے وقت کی سیاسی مہارت سمجھئے کہ گھر سے نکلے ہیں مقابلہ کے لئے مگر خالی ہاتھ ہیں ارادہ ہے کہ اپنی دولت اور اپنے سرمائے کو آنچ نہ آئے دوسروں کے سرمائے سے کھیلیں۔ ایسا ہی ہوا۔ قرآنی دلائل اپنی جگہ رہے، سنت کی پکار اپنے مقام پر رہی۔ انہیں کے میگزین سے دلائل کا اسلحہ لے کر ان سے مقابلہ کیا مسعودی

نے المہدی کے بارے میں جو یہ لکھا ہے۔

کان المہدی اول من امر الجدل	مہدی نے ملاحدہ کے خلاف متکلمین
لبین من اھل البحث من	میں سے اہل جدل کو کتاب لکھنے کا
المتکلمین بتصنیف الکتاب علی الملحدین	حکم دیا۔

تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ خود ملاحدہ ہی کی مرمت ملاحدہ ہی کے اسلحہ خانے سے کی جائے۔ کہتے ہیں کہ سندھ کے راجہ نے ہارون الرشید سے ایک خط میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ اگر اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ دلائل و براہین کی قوت سے پھیلا ہے تو میرے پاس ایک عالم کو بھیجئے۔ اگر وہ دلائل سے مجھے سمجھا دے گا تو میں اسلام قبول کر لوں گا۔ ہارون نے ایک عالم کو بھیجا۔ درباریوں میں سے ایک شخص مناظرہ کیلئے سامنے آیا اور بولا آپ کا خدا قادر ہے یا نہیں۔ عالم بولے کہ ہاں قادر ہے۔ اس نے کہا اپنے جیسا پیدا کر سکتا ہے یا نہیں عالم نے کہا کہ اس قسم کی لایعنی باتیں کلام سے تعلق رکھتی ہیں جس میں اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ راجہ نے ہارون کو لکھ دیا کہ پہلے میرا صرف خیال ہی خیال تھا۔ اب یقین ہو گیا کہ اسلام دلائل سے نہیں بلکہ تلوار سے پھیلا ہے۔ ہارون نے متکلمین کو بلایا۔ متکلمین دربار میں آئے تو ان میں سے ایک لڑکے نے اس شبہ کو حل کر دیا کہ یہ ایسا سوال ہے جیسے کوئی کہے کہ خدا جاہل بننے پر قادر ہے یا نہیں۔ خدا ایسی شئے پیدا کر سکتا ہے جو حادث اور ممکن نہ ہو۔ ہارون نے اس واقعہ کے بعد معمر بن عباد کو راجہ کے پاس بھیجا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم کلام کا مقصد یہ اور صرف یہ تھا کہ جن راہوں سے اسلام پر حملہ کیا جائے۔ انہیں راہوں سے مخاطبوں کو جواب دیکر چپ کرا دیا جائے۔ امام غزالیؒ نے **المنقذ من الضلال** میں بڑی صفائی سے یہ بتایا کہ۔

ثم القی الشیطن فی وساوس	پھر شیطان نے متبدعہ کے وسوسوں میں
المبتدعۃ اموراً مخالفۃ	مخالف سنت باتوں کا اور اضافہ کر دیا
للسنۃ فلجوا بھا وکادوا	متبدعہ اسی کے ہو رہے اور اسی کو
یشوشون عقیدۃ الحق علی	عقیدہ بنا کر اہل حق کے خلاف نبرد آزما
اھلھا فانشا اللہ طائفۃ	ہو گئے۔ اللہ نے ان کے لئے متکلمین
المتکلمین فمنہ نشأ علم الکلام	پیدا فرمائے۔ بس یہی علم کلام اور متکلمین
واھلہ	کی نشأۃ اولی ہے۔

متکلمین کی مدافعت کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ طریق مدافعت

ولکنھم اعتمدوا فی ذٰلک	مگر انہوں نے ان ہی کے مسلمات
علیٰ ما تسلموھا من خصومھم	پر اعتماد کر لیا۔

اور

وکان اکثر خوضھم فی استخراج	ان کے غور و فکر کی جولانگاہ مخالفین
مناقضات الخصوم ومواخذتھم	کی تردید اور ان کے مسلمات پر گرفت
للوازم مسلماتھم	بنی۔

کا تذکرہ کیا ہے تو اس سے مقصود یہی جتانا ہے کہ علم الکلام کا مقصد اصلی اپنوں کو مطمئن کرنا نہیں بلکہ دوسروں کو چپ کرنا ہے کیسی نے کیسی اچھی بات کہی ہے۔

مذہب کی مخالفت میں جو کچھ کہا جاتا ہے علم کلام کا طالب علم اپنے اندریشہ دور محسوس کرتا ہے کہ مذہب کی تائید میں اس سے زیادہ بڑھ چڑھ کر کیا کہا جا سکتا ہے۔

میرا مقصد علم کلام کی وقعت کو گرانا نہیں ہے بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ

فن بڑا اچھا ہے اور بہت ہی لطیف۔ مگر اس لئے نہیں کہ اس راہ سے ایمان ہاتھ آتا ہے اور انسانی فطرت اس کے آگے جھکتی ہے بلکہ اس لئے کہ بوالہوسوں کا ایسا غوغا کہ مذہبی ہونا، دیندار ہونا احمق و بیوقوف ہونے کے ہم معنی ہے۔ ہارون کی طرح اس علم کے ذریعے تردید کی جائے اور ایمان تو صرف پیغمبر کی شخصیت پر اعتماد کر لینا اور اعتماد کے ساتھ جو کچھ کہا جاتا ہے اسے بغیر دلیل کے ماننے کا نام ہے جیسا کہ پہلے کہہ آیا ہوں کہ علم الکلام مسافر کو عقل کی روشنی اور مشعل دکھا کر ایمان کا راستہ دکھانا چاہتا ہے حالانکہ ایمان کی بستی عقل سے آگے ہے کیونکہ ایمان نام ہے ماننے کا اور حق کوائف، احوال، اشیاء کے ماننے کا ہم سے مطالبہ ہے قرآن وسنت نے بتایا ہے کہ ہم ان کی حقیقت کا اس دنیا میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔

فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین

ایک حدیث میں خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔

لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر (مسلم)

قرآن میں علم کی نفی تھی حدیث میں علمی ذرائع کی نفی ہے۔ انسان کے پاس علم کے تین ہی ذریعے ہیں آنکھ، کان اور عقل۔

ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔

یعنی وہاں کی باتیں ہمارے محسوسات اور ادراک کی گرفت میں نہیں آسکتیں اس بارے میں ہماری عقل وکاوش کچھ معلوم نہیں کر سکتی کیونکہ ہم مادی زندگی کے احساسات کی زنجیروں میں کچھ اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ان سے آزاد ہو کر حقیقت عالی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لہذا اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ اس عالم کو مانیں

اور یقین کرلیں اور جو کچھ نہیں پا سکتے اس کی کاوش میں سرگرداں نہ ہوں ۔ اگر سرگرداں ہونگے تو حقیقت کا سراغ تو نہیں ملے گا ۔ البتہ نئے نئے وہموں اور گمانوں میں مبتلا ہو جائیں گے ۔ اسی بنا پر قرآن نے جس طرح حقائق کی دو قسمیں کر دی ہیں ٹھیک اسی طرح اس نے مطلب وحی کی دو قسمیں بتائی ہیں ۔ محکمات اور متشابہات ۔ وہ حقائق جو عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں وہ متشابہات ہیں ان کی نسبت فرمایا ہے ۔

لا یعلم تاویلہ الا اللہ

یہ بات کہ جب ان مسائل پر عقل کچھ سوچ نہیں سکتی تو پھر اس راہ کی معلومات بہم پہنچانے کا ذریعہ کیا ہے ۔ اس راہ کی معلومات اور اس عالم کے حقائق معلوم کرنے کا ہمارے پاس صرف ایک ذریعہ ہے اور یہی عالم غیب کے کوائف معلوم کرنے کی ایک واقعی اور فطری راہ ہے ۔ علم کے اس ذریعہ کا نام " وحی و نبوت " ہے ۔

ہم اس ذریعہ پر کیوں یقین کریں ۔ اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ پیدا ہوتے ہی غذا کے لئے رونے لگتا ہے ۔ اور پھر بغیر اس کے کہ اسے باہر سے کوئی رہنمائی ملے ماں کی چھاتی منہ میں لیتے ہی اسے چوستا اور اپنی غذا حاصل کرتا ہے ۔ یہ وجدان کی پکار ہے جو طلب و سعی کا جوش پیدا کرتی ہے ۔ لیکن ہمارے وجود سے باہر جو کچھ ہے اس کا ادراک نہیں کر سکتی ہے ۔ اس مرحلہ پر وجدان کے لئے حواس کی دستگیری نمایاں ہوتی ہے ۔ آنکھ دیکھتی ہے ۔ کان سنتا ہے زبان چکھتی ہے ہاتھ چھوتا ہے ناک سونگھتی ہے اور اس طرح اپنے وجود سے باہر کی تمام محسوس اشیاء کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں ۔ لیکن حواس کی دستگیری خاص خاص حدود میں کام دے سکتی ہے ۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی حواس صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ اشیاء کا احساس پیدا کر دیں لیکن صرف احساس ناکافی ہے ۔ زندگی کو یہاں

استنباط کی ضرورت ہے۔ احکام کی ضرورت سے کلیات کی ضرورت ہے یہ کام عقل کرتی ہے۔ وہ ان تمام مدرکات کو جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں ترتیب دیتی ہے اور ان سے احکام و کلیات کا استخراج کرتی ہے۔

جس طرح وجدان کی نگرانی کے لئے حواس کی ضرورت تھی۔ اسی طرح حواس کی تصحیح کے لئے عقل کی ضرورت ہوئی وہ حواس کی درماندگیوں میں رہنمائی کرتی ہے وہ بتلاتی ہے کہ سورج ایک عظیم الشان کرہ ہے۔ اگرچہ آنکھ اسے ایک سنہری تھال سے زیادہ محسوس نہیں کرتی لیکن جس طرح وجدان کی حواس نے دستگیری کی۔ کیونکہ وجدان ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور جس طرح حواس کی راہنمائی کے لئے عقل نمودار ہوئی کیونکہ حواس کی ھدایت بھی ایک خاص دائرے سے آگے نہ بڑھتی تھی ٹھیک اسی طرح عقل کی درماندگیوں میں بھی ایک دستگیر کی ضرورت ہے کیوں کہ عقل بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی عقل کی فرمانروائی جو کچھ اور جتنی کچھ اور جیسی کچھ بھی ہے وہ محسوسات کے دائرے میں محدود ہے یعنی وہ صرف اسی حد تک کام دیتی ہے جس حد تک ھمارے حواس خمسہ معلومات بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ لیکن محسوسات کی سرحد سے آگے کیا ہے اس پردے کے پیچھے کیا ہے۔ یہاں پہنچکر عقل درماندہ ہو جاتی ہے۔ عقل کی انہی درماندگیوں کو دور کرنے کے لئے جو ہدایت اور دستگیری نمایاں ہوئی اسی کا نام وحی و نبوت ہے۔

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے اس علمی ذریعہ یا اسی ہدایت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

چنانچہ طور عقل ورائے طور حس است کہ آنچہ بحس مدرک نمی شود عقل ادراک آں مے نماید۔ ہم چنیں طور نبوت ورائے طور عقل است آنچہ

بعقل مدرک نشود بتوسل نبوت درک مے آید وہر کہ ورائے طور عقل طریقے از برائے معرفت اثبات نمی نماید فی الحقیقت منکر نبوت است ص ۴۰/۳۷

علامہ ابن خلدون مجدد صاحب کے پورے پورے ہم زبان ہیں۔ مجدد صاحب سے ذرا زیادہ تشریح کے ساتھ اپنے مقدمہ تاریخ میں لکھتے ہیں۔

فاتهم ادراكك ومدركاتك	اپنی دانش و بینش کو بالائے طاق رکھ
في الحصر واتبع ما امرك الشارع	اور شارع کے حکم پر چل چاہے عقیدہ
من اعتقادك وعملك فهو	ہو یا عمل۔ یاد رکھ ذات نبوت نہ صرف
احرص على سعادتك واعلم	تیرے سعید ہونے کی حریص ہے بلکہ تیرے
بما ينفعك لانه من طور فوق	منافع سے بھی باخبر ہے کیونکہ اس کا
ادراكك۔	علمی مقام تیرے علم سے بالا ہے۔

انسان کی ساری فکری گمراہیوں کی داستان یہ ہے کہ وہ یا تو عالم شہادت میں بھی عقل و دانش سے اس قدر کورا ہو جاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے بوجھے مانتا جاتا ہے اور ہر راہ میں آنکھیں بند کئے چلتا ہے یا پھر عقل و بینش کا اتنا غلط استعمال کرتا ہے کہ عالم غیب کی باتوں کو عقل کی ترازو میں تولتا ہے اور عقل سے اوپر کسی علمی ذریعہ کو تسلیم ہی نہیں کرتا اور جہاں کوئی حقیقت اس کی سمجھ سے بالا تر ہوئی اس نے فوراً رد کر دیا۔ بلاشبہ علم و انکشافات کے ہر عہد میں ایسی جلد باز طبیعتیں بھی ہوئیں جنہوں نے صرف عدم ادراک کی بنا پر عالم غیب کے مسائل کا انکار کر دیا۔ لیکن ان کے انکار سے حقیقت نہیں بدلی۔ النبوات میں حافظ ابن تیمیہ نے ان فلاسفہ کے بارے میں جو عالم غیب کی گرہوں کو عقل کے ناخنوں سے کھولتا چاہتے ہیں اور جب گرہیں کھلنے میں نہیں آتیں تو انکار کر دیتے ہیں کیسا

اچھا فقرہ لکھا ہے:۔

بینکم هم لعدم العلم لا العلم بالعدم ؂۲۳

معلومات کی بنیاد عقل و حواس کی جگہ جہاں اس ذریعے یعنی وحی و نبوت پر ہو ئی اس کا اصطلاحی نام دین اور مذہب ہے اور جن شخصیتوں میں قدرت کی جانب سے اس خاص ذریعے سے معلومات حاصل کرنے کی صلاحیت و قوت فراہم کی جاتی ہے ان کو مذہبی زبان میں نبی اور رسول کہا جاتا ہے پیغمبر کے سامنے یہ عالم عالم شہادت ہوتا ہے اور وہ براہ راست سب کچھ ہوتا ہوا آنکھوں سے دیکھتا ہے اور جانتا ہے۔

أفتمارونه على ما يرى

ہم آنکھوں سے نہیں دیکھتے مگر پیغمبر کی زبان سے سن کر مانتے ہیں۔ اسی کا نام قرآن کی زبان میں ایمان بالغیب ہے۔ ہم اس موضوع پر جو کچھ، جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی باتیں پیش کریں گے ان کا براہِ راست ماخذ یہی ہوگا یعنی وحی و نبوت۔ معلومات ہی کی بنیاد جہاں عقل اور صرف عقل پر ہے یعنی محسوسات کی چار دیواری کو پھاند کر محسوس قوانین کے دائرے سے باہر نکل کر عقل سے ان امور کا بھی پتہ لگایا جاتا ہے جو احساسات کی گرفت سے باہر ہیں۔ وہ فلسفہ کا شعبہ الٰہیات اور مابعد الطبیعیات ہے۔ دین ہی کی باتوں کو جہاں عقل کی ترازو پر تولا جاتا ہے اور منہ زوری کے ساتھ اپنے مخاطب کو مطمئن نہیں بلکہ ساکت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس کا نام علم الکلام ہے۔ بتانے والوں نے یہی بتایا ہے کہ یہ راہ یعنی غیبی امور کو عقل کی ترازو سے تول کر جاننے کی راہ ماننے کی راہ سے زیادہ خطرناک ہے۔ تجربہ کاروں کا کہنا ہے کہ ماننا آسان ہے اور جاننا مشکل ہے۔ جاننے والے حیرانی کا شکار ہوتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ نے اپنی تصنیفات میں جگہ جگہ امام رازی کی متکلمین کے نام پر لکھی ہوئی جو کھلی چھٹی نقل کی ہے اسے دیکھ کر عبرت ہوتی ہے۔

لقد تاملت الطرق الکلامیة والمناھج الفلسفیة فما رأیتھا
تشفی علیلاً وتروی غلیلاً ووجدت اقرب الطرق طریقة القرآن۔

حالانکہ امام رازی کا علم الکلام کے متعلق سب سے بڑا کارنامہ ہی فلسفہ کا ردّ ہے سب سے پہلے امام صاحب ہی نے علم کلام فلسفہ کے انداز پر لکھا ہے۔ جس شخص نے امام موصوف کی بلند پایہ تصنیفات نہایتہ العقول، اربعین، محصل البیان اور تفسیر کبیر میں کلامی مباحث کا مطالعہ کیا ہے اسے امام رازی کے اس اقرار کو ماننے میں تامل ہوگا شاید شیخ اکبر کی نصیحت کا اثر ہو۔ کشکول میں شیخ اکبر کا ایک خط نقل کیا ہے۔ خط امام رازی کی جانب ہے۔ خط میں سب سے زیادہ نمایاں نصیحت یہ ہے۔

فاذن ینبغی للعاقل ان یتعرض	عقل مند کا کام یہ ہے کہ فیضان الٰہی
لنفحات الجود ولا یبقی ماسورا	حاصل کرنے کے لئے تیار ہو اور فکرو
فی قید نظرہ اوکسبہ	نظر کا قیدی بن کر نہ رہے۔

اسی نصیحت کا اثر ہے جو امام رازی کی زبان پر یہ بات ہے۔

من جرب مثل تجربتی عرف مثل	جو بھی میری طرح تجربہ کرے گا اسے
معرفتی	میری طرح پتہ لگ جائے گا۔

امام غزالی نے ابتداء میں علم کلام میں اشاعرہ کی حمایت کی لیکن بالآخران کی رائے بدل گئی اور الجام العوام میں کلامی دلائل کو وہمی اور ظنی کہنا ہی پڑا۔

کتنی کھلی بات ہے کہ کلامی دلائل وہمی ہیں۔ انہیں لوگ مان رہے ہیں کہ علماء میں مشہور ہیں اور آج اس سے انکار معیوب سمجھا جاتا ہے۔ الجام میں اس عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے۔

الباب الاول فی شرح اعتقادات السلف

اور پھر آغاز ہی میں یہ بات کہی ہے۔

اعلم ان الحق الصریح الذی لامراء فیہ عند اھل البصائر ھو مذھب السلف اعنی مذھب الصحابۃ والتابعین	کھرا اور صاف حق جس میں اہل بصیرت کو کوئی شبہ نہیں وہ صرف مذہب سلف یعنی صحابہ اور تابعین کا مذہب ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ امام صاحب نے بتایا ہے کہ عوامی رائے غیب کے معاملات کے سامنے کس کس طرح جھک سکتی ہے اور اس راہ میں نبوت کی بتائی ہوئی باتوں کو کیسے مان سکتی ہے

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہتـــ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میر مرحوم سیالکوٹی

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۲ ر اکتوبر ۱۹۵۲ء

حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے نزدیک معاش کی حقیقت، اس کے عناصر، غربت میں انسان کا مقام، سوسائٹی میں درمیانہ درجہ، بہت بڑی سرمایہ داری اللہ کو ناپسند ہے، نمونہ کی معتدل زندگی، زمین کی اکتساب میں حیثیت، مخداعت میں رفاہِ عام کی خاطر اصلاحی اقدام، رفاہیت بالغہ، تجارتی فتنے، کنٹرول اور اسلام میں اس کا مقام ـــــ

تلمیذی العزیز ! السلام علیکم

تم نے مجھ سے بار بار پوچھا ہے کہ میں شاہ صاحب کو کیسے پڑھتا ہوں۔ جی میں آیا کہ لاؤ تمہیں بتا دوں۔ مگر بتانے سے پہلے یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں جس موضوع پر شاہ صاحب کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ میرا ذہن اس کے متعلق بیرونی معلومات سے خالی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ سوشلزم اور کمیونزم کا واضح نقطہ نظر کیا ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ جمہوری نظام کے مکتبِ فکر کے آدمی اس پر کیسے غور کرتے ہیں۔ اور نہ مجھے یہ پتہ ہے کہ ایک خاص شاہی مزاج انسان خواہ دستوری ہو یا غیر دستوری، اس موضوع پر اپنے مقام پر کیا دلائل رکھتا ہے۔ اس سے میں ضرور واقف ہوں کہ اس نقطہ پر ان میں باہم اختلاف ہے۔ لیکن اس اختلاف کے تفصیلی کوائف سے میں ناآشنا ہوں۔ اس لئے شاہ صاحب کے متعلق اس موضوع پر جو کچھ بھی پیش کروں گا وہ کسی اثر کا نتیجہ نہیں بلکہ بغیر کسی بیرونی تاثر کے شاہ صاحب کے متعلق یہ میری ذاتی معلومات ہیں اور بس۔

سب سے پہلے شاہ صاحب کی زبان سے یہ بتانا ضروری ہے کہ معاشیات کیا ہیں ـــ البدور البازغہ میں ہے۔ معاشیات یہ ہیں کہ اخلاق فاضلہ، تجربی

علوم، اور رائے کلی کے موافق تمہاری ضروریات کی تکمیل ہو۔ ضروریات کئی طرح کی ہیں مثلاً کھانا، پینا، صفائی، آرائش، لباس، مکان، رفتار، گفتار، خواب، ازدواجی زندگی بیماری اور تکلیف۔ یہ معاشیات کے موٹے موٹے اصول ہیں —

گویا بالفاظ دیگر شاہ صاحب کی اصطلاح میں حیوانی اور انسانی ضروریات کی بجاآوری کا نام حکمت معاشی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں معظم مسائل معاش بتاتے ہوئے جو تفصیل دی ہے اسے دیکھ کر تو اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی میں پھیلی ہوئی وہ ساری ضروریات جن کا ہر شخص زندگی کے ہر موڑ پر ضرورت مند ہے معاشیات ہیں — معاشیات کی گاڑی چلنے کے لئے جس سڑک اور جس پٹرول کی قوت کی ضرورت ہے۔ شاہ صاحب کی اصطلاح میں اس کا نام اکتساب، تعاون تعامل ہے۔ شاہ صاحب کی زبان میں اکتساب کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی صلاحیت کے موافق عادی اسباب کی ہم نوائی میں کوئی کام کرے۔ (بدور)

تعامل یہ ہے کہ ان میں آزادانہ لین دین اور تجارت ہو۔

تعاون یہ کہ ان میں باہم کفالت، مضاربت، شرکت و وکالت اور استئجار کی سپرٹ ہو (بدور بازغہ)

اکتساب کا دوسرا نام مکاسب ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں اصول مکاسب کی تشریح کی ہے۔ فرماتے ہیں

زراعت، شبانی، معادن، نباتات اور حیوانات کی فراہمی، صناعت، نجاری، حدادی، حیاکت، تجارت اور ملازمت اصول مکاسب ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ

چونکہ انسان مدنی الطبع ہے۔ اس کی معاشی زندگی کی گاڑی باہمی تعاون کے بغیر چل نہیں سکتی۔ اس لئے باہمی تعاون واجب ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی ان

ضروریات سے محروم نہ رہے جنکی مدنیت کیلئے ضرورت ہے (ص۱۰۳)

مکاسب کے موضوع پر اگرچہ تفصیلات بہت کچھ فراہم ہو سکتی ہیں مگر درحقیقت اصولی طور پر سارے مکاسب زراعت، تجارت، صناعت اور ملازمت میں سمٹے ہوئے ہیں۔

جب بھی اور جہاں بھی تمدن رونما ہوتا ہے۔ خواہ اس تمدن کو اپنانے والی برادری صرف ہزار ہو۔ شاہ صاحب کے خیال میں سیاست مدنیہ کا اولین کام یہ ہے کہ ان لوگوں کے مکاسب کو دیکھے۔ اس کے بعد تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مکاسب خواہ کچھ ہوں مگر واقعہ یہ ہے کہ انہیں کی قوت سے انسانی معیشت میں طبقاتی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ امیر اور غریب کی آویزش اس کا ناگزیر نتیجہ ہے البدور البازغہ میں صاف لکھا ہے کہ

آدمی چند حصوں میں تقسیم ہیں۔ بہت زیادہ سرمایہ دار۔ درمیانے درجے والے اور بہت زیادہ غریب۔ غریبوں کے متعلق ان کا تاثر خود ان کی زبان ہی سے سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:۔

لا یستوفی حوائجہ الا قریبًا	ان کی ضروریات زندگی صرف چوپایوں
من استیفاء البھائم	کی طرح پوری ہوتی ہیں۔

اللہ اکبر! انسانوں میں ایسے انسان بھی ہیں جن کی زندگی کی ضروریات کی تکمیل کا مقام انسانی نہیں بلکہ حیوانی ہے انا للہ و الی اللہ المشتکیٰ۔ بدور بازغہ میں سرمایہ دار اور غریب کا ذکر کرکے اپنا بیش بہا دیہ بتایا ہے۔ ضروری اور واجب یہ ہے۔ کہ معاشی طور پر سوسائٹی میں صرف ماڈریٹ یعنی درمیانہ طبقہ ہو نہ بہت غریب اور نہ بڑے بڑے سرمایہ دار (ص۵۵)

حجۃ اللہ البالغہ میں جہاں سود کی حرمت کا ذکر ہے اس کی حکمت بیان کرتے

ہوئے لکھا ہے کہ بہت بڑی سرمایہ داری اللہ جل شانہ کو ناگوار ہے اور بتایا کہ مزاجوں اور عادات کے اختلاف کی وجہ سے زندگی میں تفاوتِ مراتب تو ناگزیر ہے اور یہ تفاوت قدرتی ہے۔ اس آیت میں اسی تفاوت کا ذکر ہے۔

نحن قسمنا بینھم معیشتھم	ہم نے بانٹ دی ہے ان میں روزی
فی الحیوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم	ان کی دنیا کی زندگی میں اور بلند کر دیئے
فوق بعض درجات لیتخذ بعضھم	درجے بعض کے بعض پر کہ ٹھہراتا ہے
بعضا سخریا	ایک دوسرے کو خدمتگار

لیکن اس تفاوت کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک چاول اور گیہوں کھا رہا ہے تو دوسرا جو اور مکی سے مزہ لے رہا ہے اور کچھ ان میں چاندی پہنتے ہیں اور بس۔ ایک دوسرا تفاوت اور زندگی میں وہ امتیاز کہ جو گیہوں اور چاول کی قسموں سے بنتا ہے اور سونے کی باریک صنعتوں کے ذریعے ترتیب پاتا ہے یہ مسرفین اور مترفین کی عادات سے متعلق ہے۔ اس میں غور و فکر دنیوی تعمقات ہیں اسے نشوونما نہ دینا چاہیئے۔ شاہ صاحب کا تاثر اس تفاوت مراتب کے متعلق یہ ہے۔

فالمصلحۃ حاکمۃ بسد	اجتماعی اور معاشی مصلحت یہی ہے کہ
ھذا الباب	اس دروازے کو بند کیا جائے۔

نظری طور پر شاہ صاحب نے بدور بازغہ میں سرمایہ داری پر بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

سرمایہ داری کے موضوع پر دو نظریئے موجود ہیں اور دونوں باہم متعارض ہیں۔ ایک یہ کہ سرمایہ داری اچھی چیز ہے۔ اس سے قلب و دماغ اور مزاج میں صحت رہتی ہے۔ اخلاق و علوم درست ہوتے ہیں، غباوت اور بد خلقی سرمایہ سے نہیں بلکہ اس کے غلط استعمال سے پیدا ہوتی ہے

ذکا اور حسن خلق سرمایہ سے نہیں بلکہ اس کے صحیح استعمال سے پیدا ہوتی ہے ۔۔ دوسرا یہ کہ سرمایہ داری بری ہے کیونکہ اس کا ناگزیر نتیجہ منازعات مشاجرات ، کد و تعب کے ساتھ اللہ کی ذات سے اعراض اور آخرت سے روگردانی ہے - اصل بات یہ ہے کہ سرمایہ داری بذات خود نہ اچھی ہے نہ بری - بلکہ بری ہے جب یہ برائیوں کا ذریعہ ہو - اور اچھی ہے جب برائیوں کی آمیزش کے بغیر صرف خوبیوں کا ذریعہ ہو - دونوں پہلوؤں میں جانبین کی رعایت صرف درمیانی حالت میں ہو سکتی ہے

(بدور بازغہ ص ۵۶)

اس سے شاہ صاحب کا نظریہ صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ داری اور غربت دونوں کے لئے سوسائٹی میں ایک ماڈریٹ اور درمیانی حالت شاہ صاحب کا پیش نہاد ہے ۔ بدور بازغہ میں سرمایہ داری کے بارے میں نظریہ بیان کرنے کے بعد ایک شخص کی معاشی زندگی کا جو نمونہ پیش کیا ہے اور جسے خود انہوں نے انموذج من الحکمۃ المعاشیۃ بتایا ہے - انہوں نے اس نمونہ میں بھی درمیانی درجے ہی کی رعایت رکھی ہے ۔ خوراک ، لباس ، نظافت ، زیبائش ، آرائش ، رفتار گفتار ، ازدواجی رفاقت ، اور ابتلائی حالات پر ایک مختصر سا نوٹ دیا ہے - اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کس قسم کی معیشت کو درمیانی معیشت کہتے ہیں - سوسائٹی کے ہر فرد کو اس درمیانی معیشت میں کس طرح رہنا چاہیئے - یہ فرد گویا شاہ صاحب کی درمیانی معیشت کا نمونہ ہے ۔

بدن اور کپڑے بے داغ اور صاف ہوں - میل کچیل نہ ہو بلکہ اجلے ہوں - پیشاب اور پاخانے کی حاجت کے وقت ڈھیلے سے استنجا کرنا ادنیٰ درجہ ہے پانی بھی استعمال کیا جائے تو بہت عمدہ ہے ۔ بدن پر کسی قسم کا کوئی میل نہ ہو - ہر ہفتہ کم از کم بدن کو

مل کر ضرور صاف کرنا چاہئیے۔ مسواک کرنا، ناک صاف کرنا، بغل اور زیرِ ناف کے بال لینا، اور معنوی نجاستوں سے دامن آلودہ نہ ہو ۔۔۔ لباس ایسا ہو جس سے تمام بدن ڈھک جائے۔ ایسا نہ ہو جس سے طرب، خلاعت اور مجنوں ٹپکے۔ ایسا ہو کہ جس سے لوگوں میں باوقار اور شہامت محسوس ہو۔ کھانا کھانے کے لئے ہاتھ منہ دھو کر اطمینان سے بیٹھے۔ دسترخوان پر کھانا رکھا جائے نہ زمین پر نہ ٹیبل پر، کھانا اپنے آگے سے کھائے تیزی اور بے چینی نہ ہو، لقمہ بڑا نہ ہو، بھوک پیاس ہو تو کھائے پئیے۔ سب سے اچھا کھانا جس کا ملنا آسان ہو، ہضم پورا اور معدے میں ضرر رساں نہ ہو۔ نہ زمین پر کھانا رکھا جائے اور نہ سونے اور چاندی کے برتنوں میں بلکہ مٹی کے برتنوں میں کھانا رکھنا چاہئیے رہائشی مکان کے لئے ضروری ہے کہ سردی اور گرمی کی مضرتوں سے بچانے والا ہو، چور اور ڈاکو سے محفوظ اور مکین اور سامان کی اس میں صحیح معنے میں حفاظت ہو سکے۔

نمونہ کی اس زندگی کو پیدا کرنے کیلئے کس قسم کی آمد درکار ہے اور زندگی کو اس طرز پر گذارنے کیلئے ایک شخص کو کیا کام کرنا چاہئیے اور وہ رفاہیت کس طرح کسب و اکتساب کے ذریعے ہاتھ آئے۔ جس کے بغیر زندگی پریشانیوں کا گہوارہ بن جاتی ہے زندگی سانسوں کی آمد و رفت کا نام نہیں ہے بلکہ زندگی دراصل نام ہے انسانی ضروریات کی تکمیل کا۔ اکتساب کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اکتساب یہ ہے کہ تم اپنی زندگی میں رفاہیت اور ظرافت کی رعایت سے کسی ایسے کام کو اپناؤ جس کے ذریعے زندگی کی گاڑی بہترین طریقے اور شاندار ڈھنگ پر چل سکے ۔۔۔ یہ جو اکتساب میں زندگی کی گاڑی کے لئے احسن وجہ اور ارفق وضع کی شرط لگائی ہے تو اس کا منشا اس کے سوا اور کیا ہے کہ شاہ صاحب عوامی زندگی کے ہر فرد کو احسن وجہ اور ارفق وضع میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ آخر وہ ہی تو بتا رہے ہیں کہ :-

اگر ایسا نہ ہوگا تو تم مشقتوں اور محنتوں سے دوچار ہوگے۔ ضروریات کا تم پر ہجوم ہوگا اور تم رفاہیت کے طریق پر کسی بھی ضرورت کو پورا نہ کرسکو گے

(بدور)

سوسائٹی کو دیکھئے کہ کتنے گھرانے اور کس قدر خاندان ازدحام حاجات کا نشانہ ہیں محنتیں کر رہے ہیں، مشقتیں ہو رہی ہیں مگر حاجات کے ہجوم میں سب کا درجہ صفر کے برابر ہے۔ شادی ہونے کے بعد زندگی ایک نئے دور سے گزرتی ہے، اولاد ہوتی ہے۔ کون ہے جو اپنی اولاد کی تعلیم نہیں چاہتا۔ کون ہے جو بیمار ہو تو دوا نہیں چاہتا یہ تو انسان کے تقاضے ہیں۔ حیوانیت کے درجے میں آکر اپنے دل سے پوچھیں کہ کون زندہ کھانے کے لئے غذا، پہننے کے لئے کپڑا، رہنے کے لئے مکان، اور بقاء نسل کے لئے رفیقہ حیات نہیں چاہتا۔ یہ حیوانی ضروریات ہیں یہاں آبادیوں کی آبادیاں اس سے محروم ہیں۔ زندگی کے انسانی تقاضوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس ماحول میں احسن وجہ اور ارفہ وضع کو دیا لے کر تلاش کرنا ایک بے محل بات ہے۔

بتانا تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ شاہ صاحب کی نگاہ ارفہ وضع اور احسن وجہ والی زندگی پر ہے۔ یہ زندگی اس وقت رونما ہو سکتی ہے جبکہ مکاسب کی راہیں ہر شخص کے لئے کھلی ہوں اور ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے موافق اپنی پسند سے کام کا انتخاب کرے۔ اس راہ سے مزاحمتیں ختم ہو جائیں۔ مکاسب میں بنیادی چیز زراعت ہے۔ زراعت میں بنیادی چیز زمین ہے۔ زمین کے متعلق شاہ صاحب کا نظریہ یہ ہے:-

الارض کلها فی الحقیقة بمنزلة مسجد او رباط جعل وقفاً علی ابناء السبیل وهم شرکاء فیه۔ (حجة الله البالغه ص۱۰۳)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زمین کی حیثیت واقعی بمنزلہ مسجد کی ہے تو اس میں ملکیت اور مالکیت کی حیثیت کیا ہے۔ مسجد تو ملکیت اور مالکیت دونوں سے برتر ہوتی ہے۔ زمین میں ملکیت کا مطلب بھی شاہ صاحب ہی کی زبان سے سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:-

ومعنی الملک فی الحق الآدمی کونہ احق بالانتفاع من غیرہ (حجۃ اللہ ص۳)

مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

میں تو اس سے یہی سمجھتا ہوں کہ رقبۃ الارض کی مالک رائے عامہ ہوتی ہے۔ افراد کی ملکیت اس میں صرف انتفاعی ہے اور شاہ صاحب نے زراعت کے متعلق یہ جو لکھا ہے کہ:-

ویشترط فی ذلک ان لا یضیق بعضهم علی بعض بحیث یفضی الی فساد التمدن (حجۃ اللہ)

تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ صورتِ حال ایسی نہ ہونے پائے جو عوامی زندگی کی پریشانیوں کا سامان بن جائے۔

ہم جسے مزارعت کہتے ہیں۔ عرب سوسائٹی میں یہ لفظ ان معنی میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ ہم تو زمین کی راہوں سے تلاش رزق کی مخصوص صورت کھیتی باڑی کو مزارعت بولتے ہیں اور عرب تمدن میں زراعت کو نہیں بلکہ اس کی ایک مخصوص معاملاتی صورت کو مزارعت کہتے تھے۔ زمین کی راہ سے رزق جیسے بھی آرہا ہے اس کی انکے یہاں متعدد معاملاتی صورتیں رائج تھیں۔ مثلاً ایک معاملاتی صورت یہ تھی کہ باغ لگا ہوا حمید کا ہے اس پر محنت رشید کی ہے۔ پھل دونوں میں تقسیم ہے۔ خواہ تقسیم کی کوئی صورت ہو اسے مساقات کہتے تھے۔ سفیدہ زمین اور بیج ایک کا ہے۔ محنت اور جانور دوسرے کے ہیں اسے مزارعت کہتے تھے۔ سفیدہ ایک شخص کا ہے۔ بیج جانور

اور محنت دوسرے کی ہے۔ اسے مخابرہ کہتے تھے۔ محنت ایک شخص کی ہے، سفیدہ زمین بیج اور جانور دوسرے شخص کا ہے اسے محاقلہ کہتے تھے۔ یہ سب صورتیں زمین کی پیداوار سے متعلق تھیں۔ ایک صورت یہ کہ سب کچھ ایک شخص کا اور محنت دوسرے کی، مگر اجرت بصورت نقدی مقرر۔ اسے اجارہ کہتے ہیں۔

مزارعت کے موضوع پر احادیث دو قسم کی ہیں:-

ایک طرف رافع کی وہ احادیث جن میں مزارعت کی نہی ہے۔ لیکن اس میں رواۃ کا بہت بڑا اختلاف ہے۔ دوسری طرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیبر والوں سے بٹائی کا معاملہ ہے جو قطعاً مزارعت ہے۔ اور اس کے ساتھ سربرآوردہ تابعین کا عمل ہے۔ نہی کی روایات میں چاہے کیسا ہی اختلاف ہو اور اختلاف بھی چاہے اختلاف فاحش ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ نہی ہے اور خیبر کے معاملے میں ایک گنجائش نکلتی ہے۔ گنجائش سے مراد وہ ہی ہے جو عام احناف نکالا کرتے ہیں۔ جو کہتے ہیں اور یہ معاملہ کرتے ہیں۔ وہ تو اس کی اباحت کے قائل ہیں۔ شاہ صاحب نے بھی ھو باق علی اباحتہ کہکر اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ تو سب مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت سے منع فرمایا ہے۔ لیکن اس کے پس منظر میں مختلف ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ ممانعت کا تعلق اس معاملہ سے ہے جس میں زمیندار کی طرف سے قطعہ ارضی کی تعیین ہوجائے یا لوگوں پر پیداوار سے معاملہ متعلق ہو۔ رافع کہتے ہیں کہ یہ معاملہ منع ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ ممانعت صرف تنزیہہ و تادّب کے درجے کی ہے۔ یہ ابن عباس کی رائے ہے۔ بعض کی رائے میں وقتی حالات کے ماتحت مزارعت میں منافات کے رونما ہونے کی وجہ سے ممانعت ہے۔ یہ زید بن ثابت کی رائے ہے۔ گویا نہی پر سب ہی متفق ہیں مگر اس کی نوعیت میں مختلف ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بقول شاہ صاحب

بڑھوتری کی خواہش اموال مباحہ کی امدادی قوتوں کے بل بوتے پر انسانی معیشت کا مایۂ خمیر ہے۔ یہ استغنا اور بڑھوتری جن جن راہوں سے ہوتی ہے ان میں زراعت بھی ہے۔ زراعت کا ایک مخصوص معاملاتی پیمانہ مزارعت ہے۔ اس کی اباحت کو صرف اس وقت ہی برقرار رکھا جانا چاہیئے جب کہ مزارعت یہ بنیادی شرط پوری کر رہی ہو۔

و یشترط فی ذالک ان لا یضیق	ضروری شرط یہ ہے کہ باہم ایک دوسرے
بعضھم علیٰ بعض بحیث یفضی	کی تنگی کا سامان نہ ہو جو شہری زندگی
الی فساد التمدن (حجۃ اللہ)	کو بگاڑ کر رکھدے۔

مدنیت میں اس سے بڑا فساد اور کون سا ہوگا جو زراعت پیشہ لوگوں میں آج برپا ہو رہا ہے۔ نان شبینہ سے محتاج زندگی کی لذتوں اور امنگوں سے محروم انسانی ضروریات کی بابجائی کے لئے بے چین ہیں۔ ان کی انسانی زندگی کے کسی رخ کو دیکھو اور معاشی حکمت کے ایک ایک باب کو ان میں ٹٹولو۔

سب سے پہلے ایک انسان کی حیثیت سے ان کے کھانے کو دیکھو۔ نہ ہاتھ دھلے نہ منہ دھلا ہے۔ کھیتی کے کنارے بیٹھے ہیں۔ ایک موٹی سی باجرے کی روٹی ہاتھ میں لئے ہوئے فرطِ غم سے بڑے بڑے نوالے منہ میں دے رہے ہیں۔ مرچوں کی چٹنی ہے یا پیاز۔ لقمہ سختی سے گلے کا ہار بنتا ہے تو چھاچھ کے ایک گھونٹ سے نوالہ نیچے اتارتے ہیں۔ نہ دستر خوان ہے نہ پلیٹ ہے نہ ہاتھ دھونے کی بالٹی ہے نہ پانی پینے کے لئے جگ اور گلاس ہے۔

ذرا اس کی نظافت کو دیکھئے میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ ناخنوں اور بدن کے دوسرے حصوں میں مٹی گھسی ہوئی ہے جس سے ایک مسکین اور مفلوک الحال نظر آتا ہے۔ اس کا مکان جانوروں کے پیشاب کی جھلوں سے اٹا ہوا ہے

ہی پیشاب کا گیس ساری رات اس کے دماغ کا مکین بنا رہتا ہے۔ گھر کی ساری زندگی کوڑے اور کرکٹ کی زندگی ہے۔ بیمار ہوتا ہے تو دوا نہیں ہے۔ بچے ہوتے ہیں تو تربیتی اور تعلیمی سامان نہیں۔ سفر کرتا ہے تو سواری کے لئے دام نہیں۔ گفتگو سنو تو وحشت صورت دیکھو تو خوف۔ اس سے بڑا فسادِ تمدن اور کیا ہوگا۔ کیا تمدن کا فساد اسوقت ہوگا جب زمیندار کے مکان میں گارے کے لئے اس کا خون اور اینٹوں کے لئے اس کی ہڈیاں کام آئیں گی۔ آہ انسانیت پر یہ ظلم عظیم ہے۔

اللہ اکبر! کیا اس کے مقابلے میں زمیندار کی صورت میں جو انسان نما حیوان پھرتے ہیں۔ کیا وہ رفاہیت بالغ کی تصویر نہیں ہیں۔ کیا وہاں معیشت کی تدقیقات اور تعمقات نہیں ہیں۔ اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو کیا شاہ ولی اللہ کی روح ہم سے پکار کر یہ نہیں کہہ رہی کہ

المصلحۃ حاکمۃ ابسدّ ھذا — مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ اس
الباب (ص۱) — دروازے کو بند کیا جائے

آخر شاہ صاحب ہی نے فسادِ تمدن کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ۔

تمدن اور مدنیت کا فساد یہ ہی ہے کہ بڑے بڑے لوگ زیورات، پوشاک، مکانات، کھانوں اور نسوانی آرائش کی باریکیوں میں پڑ جائیں اور اس کے نتیجے میں لوگوں کی اکتسابی زندگی کا رخ انکی خواہشات کی پابجائی کی طرف ہو جائے۔ کچھ گانے اور ناچ کیلئے لڑکیوں کو تعلیم دیں اور کپڑوں میں رنگا رنگ کے بیل بوٹے۔ حیوانوں اور درختوں کی تصویریں بنائیں۔ کچھ سونے اور چاندی کی باریک صنعتوں میں لگ جائیں کچھ بلند بلند عمارتی ترکیب کا کام کریں۔ جب پبلک میں ان کاموں کا رجحان بڑھے گا تو زراعت اور تجارت پامال ہو جائے گی اور ان

بڑے لوگوں کے اموال خرچ کرنے کا ناگزیر نتیجہ مصالح تمدن کی خرابی ہوگا بالآخر اکتسابی میدان تنگ سے تنگ تر ہو جائے گا ٹیکسوں کی بھرمار ہوگی یہ ایک ایسا نقصان ہوگا جو تمام تمدن کے ایک ایک عضو میں پھیل کر مدنیت میں فساد پیدا کر دیگا (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۰۶)

تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمدن میں فساد کو جن راہوں سے آنے کا موقعہ ملتا ہے ان میں بنیادی چیز ہی رفاہیت بالغہ ہے اور آج رفاہیت بالغہ ہماری زندگی میں جس انداز سے بلا ارادہ آرہی ہے وہ صرف مزارعت ہے۔ یہ تو شاہ صاحب کی زبان سے سن چکے ہو کہ

ان اللہ تعالیٰ یکرہ الرفاہیۃ البالغۃ (ص ۱۰۷)	حد سے زیادہ سرمایہ داری اللہ کو ناپسند ہے۔

اور یہ بھی تم سن چکے ہو کہ

ان انواجب ان یجعل میزان الحکمۃ المعاشیۃ ذا المرتبۃ الوسطیٰ لا غیر۔ (البدور البازغہ ص ۵۵)	معاشی میزانیہ کے لئے ضروری ہے کہ درمیانہ ہو۔

اصول مکاسب میں سے تجارت بھی ہے۔ اصولی طور پر تجارت شریف ترین پیشہ ہے۔ مدنیت میں اس کی اصل یہ ہے کہ انفرادی مکاسب کی موجودگی میں ہر کسب، ہر شخص کی زندگی کی حاجت براری نہیں کرسکتا کیونکہ زندگی خواہشات کے مختلف ہونے اور مزاجوں کے متنوع ہونے کی وجہ سے چند در چند حاجات کا گہوارہ ہے۔ انہیں حاجات کی بار آوری مبادلہ سے کی جاتی ہے۔ اسی مبادلہ کا نام تجارت ہے۔ اور اسی کے زور پر سارے معاملات رونما ہوتے ہیں۔

تفہیمات الٰہیہ میں شاہ صاحب نے جہاں مختلف فتنوں کو بیان کیا ہے۔ ان میں

اکتسابی فتنہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسی تذکرے میں جو یہ بات لکھی ہے:

وينسد الاكساب الشاقة	تمام اچھے کاموں کی راہیں لوگوں پر اس
لتوقفها على التلقي من	لئے بند ہو جائیں گی کہ ان کی پابجائی
السلطان۔	سرکاری ذرائع پر موقوف ہو گی۔

حالات کی کیسی اچھی تصویر ہے۔ جسے آج تجارت کہتے ہیں کونسا شعبہ ہے جس میں لائسنس کے بغیر شخص آزادانہ کام کر رہا ہے۔ کیا یہ لتوقفها على التلقي من السلطان نہیں اور پھر صرف اتنا نہیں کہ کام میں تلقی من السلطان ہو اور آگے چھٹی ہو۔ بلکہ تلقی من السلطان تک راہوں میں جس قدر دامنوں میں الجھنے والے کانٹے اور جس قدر آویزشیں ہیں اسے وہ لوگ جانتے ہیں جنہیں آج کی تجارت سے کوئی تعلق ہے۔ اگر شاہ صاحب نے اب سے ڈیڑھ صدی پہلے تمدن کی نقاب کشائی کرتے ہوئے تلقی من السلطان کے بعد حالات اور مدنیت کا ان لفظوں میں ماتم کیا ہے کہ:۔

ودون هذا التلقي مسابقات ومخاطفات واحتيالات

تو تعجب کا کون سا مقام ہے؟ آج بھی تو تاجروں کی زندگیاں مسابقات (بھاگ دوڑ)، مخاطفات (لوٹ کھسوٹ) اور احتیالات (مکر و فریب) کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ کن کن دفتروں میں دن رات مارے مارے پھرتے ہیں۔ سرمایہ اپنا، جان اپنی، محنت اپنی مگر حساب دوسروں کو دے رہے ہیں۔ قدم قدم پر ٹیکس ہے۔ بکری ٹیکس سے لے کر بولتے جایئے آپ تھک جائیں گے، بھول جائیں گے مگر ٹیکس ختم نہ ہونگے۔ شاہ ولی اللہ نے فساد مدنیت کے جو دو سبب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ

ضرب الضرائب الثقيلة على	کسانوں، تاجروں اور کاریگروں پر
الزراع والتجار والمحترفة	بھاری بھرکم ٹیکس کا بوجھ ہوگا۔

کوئی مانے یا نہ مانے وہ بتا تو گئے ہیں کہ

انما تصلح المدنیۃ بالجبایۃ الیسیرۃ	شہری زندگی تو فقط معمولی ٹیکس ہی سے ٹھیک رہتی ہے۔

مگر آج کی زندگی جبایت لیسیرہ سے کیسے چلے۔ اگر ٹیکس نہ ہوں تو اوپر والوں کے مرافق معیشت کیسے چلیں۔ مگر شاہ صاحب کے لفظوں میں قصر شامخ، آبزن، حمام، بساتین دواب فارہہ، غلمان حسان، توسع مطاعم اور تجمل ملابس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ شاہ صاحب تو اس زمانے کی بات کر رہے ہیں جب تمدن سواری کے لئے جانور رکھتا ہے۔ یہ جانوروں کا نہیں ہوائی جہاز کا زمانہ ہے۔ وہ بالادستی ہی کیا ہے جہاں رہنے کے لئے شاندار باغیچہ اور کوٹھی نہ ہو، خدمت کے لئے بیرے اور سواری کے لئے یو۔ ایس۔ اے کے کارخانوں سے نکلی ہوئی کار نہ ہو۔ یہ چیزیں آسمان سے نہیں برستی ہیں بلکہ

لم تکن لتحصل الا ببذل اموال خطیرۃ	بڑی سے بڑی رقم خرچ کئے بغیر حاصل نہیں ہوتی ہیں۔

اور اموال و دولت الہٰ دین کا چراغ نہیں ہیں۔ ان کے آنے کی راہ اس کے سوا اور کیا ہے۔

لا تحصل تلك الأموال الا بتضعیف الضرائب علی الفلاحین والتجار	اور یہ رقم خطیر کسانوں اور تاجروں پر ڈبل ٹیکسوں کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی

ٹیکسوں کو چھوڑ کر ذرا ایک قدم بڑھایئے۔ ایک اور چیز بھیانک شکل میں سامنے آتی ہے۔ یہ کنٹرول کا بت ہے۔ اس کا پس منظر جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اوپر والوں کے مرافق معیشت کے غلط انداز اور ٹیکسوں کی نا روا بھرمار نے ہر شخص کو نفع اندوز بنا رکھا ہے۔ اسی نفع اندوزی کا شکار تاجر بھی ہے۔ ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ عوام

کی خاطر ہو رہا ہے مگر ہوتا یہی ہے کہ جس چیز پر کنٹرول کی نظر عنایت ہوئی وہ یک دم بازار سے ختم ہوئی۔ سرمایہ داروں کو مایہ بنانے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ غریب دانے دانے کو ترستا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ قیمتیں چڑھ گئیں۔ قیمتوں کا کنٹرول فرما دیجئے۔ جواب میں جو بات ارشاد فرمائی وہی سنانا چاہتا ہوں۔ فرمایا:

ان اللہ ھو المسعر القابض	اللہ ہی نرخ مقرر کرنے والا، بند
الباسط الرازق وانی لا رجوان	کرنے والا، کھولنے والا اور روزی
القی اللہ ولیس احد یطلبنی	رساں ہے۔ میں امیدوار ہوں کہ
بمظلمۃ	اللہ سے ایسے حال میں ملوں کہ
	میرے ذمہ کسی حق کا مطالبہ نہ ہو

یعنی آپ نے کنٹرول کو اس لئے قائم نہیں کیا کہ اس سے آپ کو ظلم کی بو آتی تھی — یاد پڑتا ہے کہ حافظ ابن القیم نے الطرق الحکمیہ میں لکھا ہے کہ کنٹرول کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت حرام اور ظلم ہے اور دوسری صورت جائز بلکہ کبھی کبھار واجب ہو جاتی ہے پہلی صورت یہ ہے کہ دوکانداروں کو خواہ مخواہ کسی ناپسندیدہ قیمت پر فروخت کرنے کے لئے مجبور کیا جائے یہ صورت حرام اور ظلم ہے۔ دوسری یہ کہ کنٹرول کا مقصد لوگوں سے عدل و انصاف کرنا ہو مثلاً یہ کہ رائج الوقت قیمتوں پر فروخت کرنے کے لئے ان کو مجبور کیا جائے اور اس سے زائد قیمت پر بیچنا ان کے لئے ممنوع قرار دیا جائے۔ تو حکومت کی جانب سے یہ اقدام نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے۔ پہلی صورت کے متعلق حضور کا یہ ارشاد ہے کہ ان اللہ ھو المسعر الخ — ہاں اگر تاجر ذخیرہ اندوزی کر کے مصنوعی قحط کی صورت پیدا کر دیں اور عوامی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر ضروریات زندگی کی قیمتیں چڑھانا شروع کر دیں تو عدل و انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ تسعیر کا قانون نافذ کر دیا جائے تاکہ ذخیرہ اندوز مرجیہ اور مناسب نرخوں

سے زیادہ نہ وصول کر سکیں۔

شاہ صاحبؒ نے بھی حجۃ اللہ البالغہ میں یہ فرما کر

فان رُئي منهم جور ظاهر — اگر کھلم کھلا ظلم معلوم ہو تو پھر

لا يشك فيه جاز تغييره — کنٹرول درست ہے۔

دوسری صورت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور نہ صرف فتویٰ بلکہ اسکے نہ ہونے کو مملکت میں فساد قرار دیا ہے۔ فانه من الافساد في الارض ۔ اور سوچنے کی بات ہے، کہ ارشاد میں تسعیر سے حضورؐ کی کنارہ کشی کا منشا دراصل اندیشہ ظلم ہے اور اگر تسعیر نہ کرنے میں پورا معاشرہ ظلم کا یقینی طور پر شکار ہو رہا ہے تو پھر قواعد شرعیہ کی رُو سے اُسے واجب ہونا چاہیئے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

نمبر ۱ پروفیسر محمد عبد الجبار صاحب ایم۔ اے۔ جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ
۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۳ء

اخلاق کا سرچشمہ، غضب اور شہوت کی نیرنگیاں، دونوں قوتوں کیلئے تمثیل، رہبانیت ان کا ازالہ چاہتی ہے، اسلام ان کا ازالہ نہیں امالہ چاہتا ہے۔ اخلاق کی کیفیات میں سے ایک کیفیت کا نام عبادت، عبادت کے موضوع پر ارباب مذاہب میں فکرو نظر کا اختلاف، عبادت کے عبادت ہونے کی شرطیں، اخلاص اور اتباع، عبادت کی فضیلت پر تبصرہ، منشاء عبادت کی تعیین، ارباب فکر کے چار اسکول۔ الٰہیت ایک صفت ہے جو خدا کے سوا کہیں نہیں پائی جاتی، عبادت اپنی نیازمندی اور منعم کی عظمت کا ایک معجون مرکب ہے۔ مدعیان محبت کیلئے محبت کی نشانی، ختم نبوت رائے نہیں بلکہ ایمان کی اساس ہے۔

عزیزی العزیز!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ ۔۔۔۔ پڑھ تو لیا مگر تم نے کبھی سوچا ہے کہ علم کا منشا کیا ہے! سنو!

انسانی طبیعت درحقیقت ایک سواری ہے اس پر سوار دو ہیں غضب اور شہوت۔ اخلاق و صفات کی جو نیرنگی اور جس قدر بہتات بھی ہے وہ انہیں دو سواروں کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ شہوت نام ہے جلب منافع والی قوت کا۔ اور غضب کہتے ہیں دفع مفاسد کی طاقت کو ۔۔۔ اخلاق اچھے ہوں یا برے، سب کا سرچشمہ یہی ہیں جیسے منہ دریات میں شہوت کے استعمال کا نام سوم ہے۔ ایسے ہی ذات سے دفع مضرت میں غضب کا استعمال غرض نقص ہے اگر دفع مضرت نہ ہو سکے

تو یہی حقد بنتا ہے اور شہوی قوت ضروریات کی پابجائی میں ناکام ہو تو اس سے حسد رونما ہو جاتا ہے۔ بخل ہو یا ظلم، کبر ہو یا فخر، سب ان دو قوتوں کی اولاد ہیں۔

ایک مثال سمجھ لو۔ پہاڑوں سے نکلی ہوئی ندی بستی کی طرف آرہی ہے۔ منہ پر مکانات بنے ہوئے ہیں اور مکان والوں کو پتہ ہے کہ سیلاب بہا کر لے جائیگا۔

قوت غضب اور شہوت نہریں ہیں طبیعت کی گوکوں سے ہو کر دل کی آبادیوں سے گذرتی ہیں۔ نہریں پانی ضرور آتا ہے اور سیلاب بن کر آتا ہے حفاظتی تدابیر ضروری ہیں۔ حفاظتی تدابیر میں اختلاف ہے۔

عقل والوں کی ایک جماعت اس کوشش میں ہے کہ خود رَو نہر کو دہانے سے جا کر بند کر دیا جائے۔ یہ طبقہ اپنے مکانات اور اپنی آباد کھیتیوں سے ہٹ کر نہر کے بند کرنے کی فکر میں لگ گیا ہے۔

ایک دوسرا طبقہ نہر کے متعلق کچھ نہیں سوچتا بلکہ اپنی آبادیوں کی پختہ کاری میں مشغول ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مکان اور اس کی بنیادیں اگر مضبوط ہوں تو نہر کا بہاؤ خواہ کیسا تیز ہو مکان محفوظ رہیں گے۔ نہر مکانوں کے پاس آئے گی مگر اس کا رخ دائیں اور بائیں ہوگا۔ یہ طبقہ نہر کا رخ بدلنے کا فکر مند ہے —— دونوں میں فرق ہے اور فرق بھی بہت صاف —— پہلا طبقہ ازالہ کا خواہاں ہے اور دوسرا امالہ چاہتا ہے۔

رہبانیت نے خدا رسی یا خدا شناسی کے لئے دنیا کو ازالہ کی راہ بتائی ہے اور نبوت نے ازالہ کی نہیں بلکہ امالہ کی راہ بتائی ہے۔ قرآن کو غور سے پڑھو تو معلوم ہو جائے گا کہ طریق نبوت میں ہر جگہ امالہ کی روح کار فرما ہے۔ اسلام زندگی کے قدم روکنا نہیں چاہتا بلکہ قدموں میں رفتار باقی رکھتے ہوئے ان کا [illegible] رخ بدلنا چاہتا ہے۔ لوگ اسلام کا نام سنتے ہیں تو بدک جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلام

ہے بنے ہوئے کو توڑ دینے کا اور بس ــــ حالانکہ ــــ

عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

اخلاق جن جن کیفیات کا نام ہے۔ ان میں ایک کیفیت وہ ہے جسے عبادت کہتے ہیں۔ عبادت کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ منعم سے محبت ہو اور ولی نعمت کے سامنے ضرورت مندانہ حالت میں عجز و بیچارگی کا مظاہرہ ہو۔ قوموں کے صدہا اختلافوں کے باوجود اس مرکزی نقطہ پر اتفاق ہے۔ اگر اختلاف ہے تو ولی نعمت کی تعیین اور اظہار محبت کے پیمانوں میں ہے طبیعیین نعمتوں کا سرچشمہ عناصر کو کہتے ہیں۔ صابئین کواکب کی حرکتوں سے اس کا جوڑ لگاتے ہیں اور مشرکانہ ذہن نعمتوں کے اسی گرداب میں سب کو نہیں مگر کچھ کو اپنے من گھڑت اور خانہ ساز شریکوں کا اقرار دیتا ہے۔ نبوت کا نظریہ یہاں بالکل صاف اور واضح ہے کہ ــــ ہستی کی گود میں جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہو رہا ہے وہ بلاشرکت غیرے اللہ جل شانہٗ کی کارفرمائی ہے۔ موٹی سے موٹی بات یہ ہے۔ کہ اللہ جل شانہٗ میں مخلوقی صفات یا۔ تو یا مخلوق میں واجبی اوصاف کی جھلک سمجھنا تمام برائیوں کی جڑ اور سارے غلط عقیدوں کا سرچشمہ ہے۔ اور دل کا پتہ نہیں مگر اسلام کی حد تک جو کچھ میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلام میں عبادت کے عبادت ہونے کے لئے دو بنیادی شرطیں ہیں۔ اول اخلاص، دوم اتباع سنت۔

اس وقت مسلمانوں کو غور سے دیکھو چار طبقوں میں تقسیم ہیں۔ بھوڑی سی مقدار اور مٹھی بھر وہ لوگ ہیں جو عبادات میں مخلص بھی ہیں اور متبع بھی۔ ورنہ کچھ مخلص تو ہیں مگر متبع نہیں اور کچھ متبع تو ہیں مگر مخلص نہیں۔ اور سب سے زیادہ گراہوا وہ طبقہ ہے جو نہ مخلص ہے اور نہ متبع ــــ قرآن میں یہ دونوں شرطیں مذکور ہیں بلکہ انہی دونوں کو قرآن حکیم نے موت و حیات کی کشمکش کا پس منظر قرار دیا

ہے۔

الذی خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً۔

مشہور تابعی حضرت فضیل ابن عیاض سے احسن عملاً کی اخلص واصوب سے تفسیر منقول ہے جب ایک بار ان سے اخلص واصوب کی حقیقت دریافت کی گئی تو جواباً فرمایا کہ اگر عمل میں خلوص ہو مگر صواب نہ ہو تو ناقابل پذیرائی ہے اور ایسے ہی اگر صواب ہو اور خلوص نہ ہو ۔۔۔ مقبول صرف وہ عمل ہوتا ہے جس میں خلوص اور صواب دونوں ہوں۔ خلوص یہ کہ عمل نرا دھار صرف اللہ جل شانہ کے لئے ہو۔ اور صواب یہ کہ طریق سنت کے موافق ہو۔ یہ بات کھلم کھلا علی رؤس الاشہاد واضح ہو چکی ہے کہ

کل عمل لیس علیہ امرنا فھو رد۔

بتاؤ اب کون سی بات ہے جو سمجھائی نہیں گئی۔ اے کاش مسلمان حقیقت شناسی سے کام لیتے مگر ؎

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ

عارف رومی نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہر ہلاک امت پیشین کہ بود
زانکہ بر جندل گمان بردند عود

بات لمبی ہو جائے گی مگر ذرا ٹھہر جاؤ لگے ہاتھ احسن عملاً کے متعلق کچھ سنتے جاؤ۔ یوں فرمایا کہ ایکم احسن عملاً یوں نہیں فرمایا کہ ایکم محسن عملاً۔ دونوں میں فرق ہے۔ احسن اسم تفضیل ہے یہ فاعلی معنے میں زیادتی چاہتا ہے۔ معنے یہ ہیں اچھے سے اچھا عمل اور محسن کے معنے صرف اچھا

عمل کرتا ہے، ہیں۔ احسن عملاً چاہتا ہے کہ پہلے عمل کا کوئی اچھا نمونہ موجود ہو۔ اور پھر اس کے مطابق کام ہو اس طرح حسن دوبالا ہوگا اچھا نمونہ قرآن ہی کا بتایا ہوا یہ ہے کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

افسوس کہ، لوگ عبادت کے نام پر اعمال خود بخود کرنے لگے حالانکہ ان کو نمونہ کے مطابق کرنے کو کہا گیا تھا۔ جنید بغدادی نے کیا اچھی بات فرمائی ہے۔

الطرق كلها مسدودة على الخلق الا من اقتفى اثر رسول الله صلى الله عليه وسلم

خبر نہیں کہ یہ نظام عبادات میں من مانی کارروائیاں کرنے والے کس منہ سے کہتے ہیں کہ نبوت ختم ہے حالانکہ بالفعل اپنے کردار سے ان میں ہر شخص منصب نبوت پر چھاپہ مار رہا ہے۔ بتاؤ تو سہی جو کچھ یہ کر رہے ہیں نبوت اس کے سوا اور کیا کرتی ہے اگر عبادات کے پیمانے بنانے میں یہ آزاد ہیں تو پھر اور کیا باقی ہے۔

یہ تو ہوئی عبادت کی بنیادی شرطیں۔ اب یہ بھی معلوم کر لو کہ سب سے نافع اور افضل عبادت کون سی ہے۔ اس میں بھی چار رائیں ہیں۔

۱۔ ایک طبقے کے خیال کے مطابق عبادت میں جس قدر زیادہ صعوبت، مشقت اور تکلیف سے سامنا ہوگا۔ اسی قدر اس کا فائدہ زیادہ ہوگا۔ ان کا کہنا ہے کہ اجرت بقدر مشقت ملتی ہے۔

۲۔ دوسرے فریق کی رائے ہے ترک دنیا، بے تعلقی، بے رغبتی، بے اعتنائی ہی سب سے اونچی عبادت ہے۔ یہ خیال رکھنے والے پھر دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک عوام، ان کے تصور کے مطابق زندگی کا مقصد ہی ترک دنیا ہے۔ دوسرے خواص، ان کے نزدیک مقصود تو اصل میں دل میں اللہ جل شانہ کی محبت، انابت

اور توکل ہے۔ مگر دنیا سے بے رغبتی اس مقصود تک پہنچنے کے لئے زینہ ہے۔ ان کی رائے میں افضل عبادت یہ ہے کہ ہمہ وقت، ہمہ آن قلب ولسان یادِ الٰہی میں مشغول ہوں۔ اس کی شماطر مراقبات اور اشغال ہیں۔ ان کی بھی پھر دو قسمیں ہیں۔ کچھ وہ جو عرفائے متبعین ہیں کہ اوامر و نواہی کیلئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں خواہ اس کی خاطر اُن کو اپنی جمعیتوں اور مراقبوں سے دست کش ہونا پڑے۔ اور ایک طبقہ ان میں وہ ہے جو صرف قلبی جمعیتوں ہی میں مگن رہتا ہے۔ یہ دوسرا حصہ پھر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ان میں کچھ وہ ہیں جو ان قلبی جمعیتوں کے پیچھے فرائض و واجبات ہی کو چھوڑ بیٹھا ہے۔ اور ایک طبقہ فرائض و واجبات کی حد تک تو مطالبات کی پابجائی کرتا ہے مگر جمعیتِ قلبی کی خاطر سنن اور مستحبات کے چھوڑنے میں بے باک ہے۔

۳۔ تیسری جماعت کے عندیہ کے مطابق عبادت کی انفعیت کا دارومدار اس کے تعدیہ پر ہے مثلاً خدمتِ خلق، محتاجوں کی امداد، لوگوں کی ضروریات میں اشتغال — ان کا کہنا یہ ہے کہ عابد کا عمل اپنی ذات کیلئے ہے۔ اور نفع رسانی کا معاملہ دوسرے کے لئے ہے یہ بہر حال افضل ہے۔ اس لئے متعدی عبادات ہی کا درجہ اونچا ہے۔ اس موضوع پر وہ مختلف احادیث بھی پیش کرتے ہیں جن سے تعدیہ عمل کی بزرگی ثابت ہوتی ہے — الغرض ان کی رائے میں قلبی جمعیتوں اور مراقبوں سے کہیں اونچا مقام تعدیہ عمل والے افعال کا ہے۔

۴۔ چوتھی جماعت یہ اعتقاد رکھتی ہے کہ ہر وقت حالات کے تقاضوں کے موافق رضائے الٰہی کو پیشِ نہاد بنا کر کام کرنا سب سے اونچی عبادت ہے۔ جہاد کے وقت میں جہاد سب سے بڑی عبادت ہے تہجد اور اذکار و اوراد کو چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دے۔ مہمان آجائے تو اوراد و اشغال اور سب نفلی کاموں سے اونچا عمل اس کی میزبانی ہے۔ بیوی بچے موجود ہوں تو نوافل و اذکار سے زیادہ ثواب ان کی معاشی الجھنوں کو دور کرنے میں

ہے۔ صبح کو سحری کے وقت میں نماز، قرآن، ذکر، دعا اور استغفار سب سے افضل ہے۔ استاد کے لئے اور طالب علم کے لئے تعلیم کے وقت میں علمی مشاغل، اذان ہوتے وقت اذان کی اجابت اور دوسرے اوراد و وظائف کا چھوڑ دینا نماز پنجگانہ کے اوقات میں نماز پنجگانہ کے لئے سرگرمی اور اس کا اہتمام، محتاج اور ضرورت مند کے ہوتے ہوئے اس کی امداد، مقام، منصب، مال، جان اس کی اعانت میں صرف کرنا اور اسے سب جمعیتوں اور خلوتوں پر مقدم کرنا سب سے اونچا عمل ہے۔ قرآن پڑھتے وقت جمعیت اور ہمت اس انداز سے پیدا کرنا گویا حق ذوالجلال کے سامنے موجود ہو۔ غزوات میں دعا، ذکر، تضرع و زاری میں وقت لگانا، ایام عشرہ ذی الحجہ میں تکبیرات، تہلیلات، تحمیدات کی بہتات، رمضان کے عشرہ میں خلوت گزینی اور مسجد میں اعتکاف بہترین عبادت ہے۔ مسلمان بھائی بیمار ہو اس کی عیادت کرنا۔ مرگیا ہو تو جنازہ میں جانا، خلوت اور جمعیت سے کہیں زیادہ اونچا ہے۔ لوگ مصائب میں مبتلا ہوں، تکلیفوں کا شکار ہوں، ان سے الگ نہ ہونا، صبر کی پوری قوت کے ساتھ ان میں رہنا پیش پا افتادہ تکلیفوں کو برداشت کرنا ہی برگزیدہ عمل ہے۔

ماحول میں نیکیاں ہوں تو جلوت اور برائیاں ہوں تو خلوت افضل ہے۔ ہر عمل کی فضیلت اور بزرگی کا اصلی معیار وہ حالات ہیں جن میں وہ عمل ہو رہا ہے۔ اصل واجبات وقت کو پورا کرنا ضروری ہے اور یہی اس وقت افضل ہے اور بس ۔۔ دراصل یہ اختلاف مقصود عبادت پر غور نہ کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ جب کسی کام کا مقصد معلوم نہ ہو اور علت و مصلحت سمجھی نہ گئی ہو تو یہ اختلاف ناگزیر ہے ۔۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ عبادت کا منشا کیا ہے؟ افسوس کہ ارباب فکر منشاء عبادت متعین کرنے میں ہی چار گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

اول وہ گروہ ہے جس کے نزدیک عبادت کا کوئی منشا، مقصود اور غرض

نہیں ہے۔ اور صرف امری درجہ ہی اس کا سبب ہے اور بس ـــ معاشی سعادت اور معادی نجات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس غیر معقول "عقلیت" کا اظہار ان لوگوں کی جانب سے ہوتا ہے جو افعال الٰہیہ میں کسی حکمت و مصلحت کے قائل ہی نہیں ہیں گویا پھیلی ہوئی اس زندگی کا نہ کوئی مقصد ہے نہ علت ہے نہ کوئی غائیت ہے اور نہ کوئی حکیمانہ حکمت ہے۔ نہ یہاں اسباب اور مسببات کا کوئی رشتہ ہے اور نہ مخلوقات میں قوت اور طبیعت ہے ـــ

حافظ ابن القیم نے مفتاح دار السعادۃ اور طریق الہجرتین میں اس نظریہ کی قباحت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس طبقہ کا سرگروہ جعد بن درہم ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ کے مقدمہ میں اس نظریے کے بودے پن پر بہت لے دے کی ہے۔ واقعی حکیم الامت نے سچ فرمایا ہے کہ:

هذا ظن فاسد تكذبه السنة واجماع القرون المشهود لها بالخير

بلکہ اس سے بھی ترقی کر کے صاف صاف کہدیا ہے کہ

من عجز ان يعرف ـــ فانه لم يمسه من العلم الا كما يمس الابرة من الماء حين تغمس وتخرج

کیا اس فقرے میں شاہ صاحب نے یہ راز فاش نہیں کر دیا کہ اس طبقے کو علم کی ہوا بھی چھو کر نہیں گذری ہے اور بقول حضرت شاہ صاحب یہ فخر کی بات نہیں بلکہ

هو بان يبكي على نفسه احق من ان يعتد بقوله

گویا بریں عقل و دانش بباید گریست والا معاملہ ہے۔

دوسرا گروہ اس کی بالکل اپوزیشن ہے اور اس کے زورِ بیان کو دیکھکر کچھ لوگوں نے مان ہی لیا ہے کہ اس نظریہ کی بنیاد عقلیت پر ہے۔ اس کا کہنا

ہے کہ عبادات کا مقصد وہی ہے جو بازار میں خرید و فروخت لین دین میں سکہ کا ہوتا ہے۔ گویا عبادات ان اجور، ثواب اور نعمتوں کی قیمتیں ہیں جو بارگاہِ حی وقیوم سے بندوں کو ارزانی ہو رہی ہیں اور ہوں گی۔ اس نظریہ کی بنیاد پر اللہ اور اس کی مخلوقات کے باہمی تعلقات بائع اور مشتری کے اور مستاجر و اجیر کے بنتے ہیں۔

یہ دونوں گروہ اپنے نظریات میں ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں اور دونوں میں حد درجہ تباین ہے۔ پہلا طبقہ اعمال اور اس کی جزا میں اگر سرے سے ہر تعلق کی نفی کرتا ہے اور یہ جائز قرار دیتا ہے کہ اللہ جل شانہ، اس کو بھی عذاب و تکلیف کی آماجگاہ بنا دے گا جس کی ساری عمر خدا کی طاعت میں ختم ہو گئی ہو اور اس کو نعمتوں سے مالا مال کر دے گا جسنے عمر بھر میں کوئی سانس بھی خداوند ذوالجلال کی بغاوت کے بغیر نہ لیا ہو۔ دونوں کا مقام ایک ہے۔ تو دوسرا گروہ اعمال ہی کو اصل قرار دیتا ہے اور اللہ جل شانہ کے فضل و رحمت اور قدرت کو اعمال کی زنجیروں میں جکڑ کر اصلح کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ درحقیقت دونوں ہی صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں۔ پہلا اس لئے کہ اعمال ثواب و عقاب کے لئے اسباب ہیں۔ یہ بھی اپنے مقتضیات سے ایسا ہی تعلق رکھتے ہیں جیسے دنیا کے سارے اسباب مسببات سے۔ دوسرا اس لئے کہ اعمال صالحہ کا رشتہ وجود اللہ جل شانہ، کی توفیق اور فضل و رحمت سے ملا ہوا ہے۔ اس لئے اعمال بذاتِ خود قیمت نہیں ہیں۔ ارشادِ نبوت لن یدخل احد منکم الجنۃ بعملہ میں باء عوض اور مقابلہ کے لئے ہے اور اس میں زبانِ نبوت اس گروہ کی تردید فرما رہی ہے جو عبادات کو نعمتہائے الٰہیہ کی قیمتیں بتلاتے ہیں۔ اور زبانِ وحی ادخلوا الجنۃ بما کنتم تعملون میں باء سببیت کے لئے ہے اور اس گروہ کی صاف اور کھلی تردید ہے جو جزا اور اعمال کے درمیان

کسی ربط باہمی کا قائل نہیں ہے۔ گویا دونوں افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ راہِ اعتدال اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اعمال نعمت ہائے الٰہیہ کے لئے سبب ہیں مگر عوض اور قیمت نہیں ہیں یہی مسلکِ حق ہے۔ تیسرا گروہ بھی ہے۔ اس کے خیال میں عبادت کی غرض یہ اور صرف یہ ہے کہ ریاضت اور مجاہدہ کے ذریعے نفوسِ انسانی میں فیضانِ علوم کی صلاحیت رونما ہو جائے اور نفس اپنی بہیمی اور سبعی قوتوں سے الگ تھلگ ہو جائے۔ اس گروہ میں دو طبقے ہیں۔ ایک وہ فلاسفہ جو قدم عالم وغیرہ کے قائل ہیں۔ دوسرے فلاسفہ صوفیائے اسلام دونوں عبادات کو ریاضیات کے درجہ کی بات سمجھتے ہیں۔

چوتھا گروہ محمدی اور ابراہیمی ذہن رکھتا ہے۔ عبادت اور اس کے پس منظر، غایت اور غرض کو ایک تحقیقی نظر سے دیکھتا ہے اور یہ نظریہ ٹھیٹھ فطری اور عقلی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عبادت کا کوئی پس منظر الٰہیت کی حقیقت سے الگ ہو کر نہ مقرر ہو سکتا ہے اور نہ ہی تصور میں آسکتا ہے۔ الٰہیت بھی خدا کی دوسری صفات کی طرح ایک صفت ہے اور یہ صفت اللہ جل شانہٗ کے سوا کہیں نہیں پائی جاتی نہ حقیقتاً نہ مجازاً ——— خداوند ذوالجلال کی الوہیت ہی عبادت کا اصلی سبب، اثر اور تقاضا ہے۔ اللہ اور عبادت میں باہم ایسا ہی تعلق ہے جیسے متعلقاتِ صفت کو صفت کے ساتھ ہوتا ہے۔ کیا معلومات بغیر علم کے اور مقدورات بغیر قدرت کے کوئی وجود رکھتی ہیں؟ اگر نہیں رکھتی ہیں اور یقیناً نہیں رکھتی ہیں تو پھر عبادت کا بغیر الاہیت کے وجود کیوں اور کیسے ہو سکتا ہے، الٰہیت خود عبادت چاہتی ہے اسی طرح جیسے بھوک روٹی اور پیاس پانی چاہتی ہے۔

جیسا پہلے بتا آیا ہوں کہ عبادت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ منعم کے

انعامات کی بے پایاں بارش دیکھ کر خواہ مخواہ آدمی تو آدمی حیوانات میں بھی وجدانی طور پر ایسی محبت پیدا ہوتی ہے جس میں اپنی نیازمندی اور منعم کی عظمت کی آمیزش ہوتی ہے یہی تعظیم و تذلل کے امتزاجی پیمانہ محبت سے عبادات کی قسمیں بنتی ہیں۔ اس لئے اصل عبادت اللہ جل شانہٗ کی محبت ہے۔ نہ صرف محبت بلکہ بلا شرکت غیرے محبت اللہ جل شانہٗ کی عبادت ہے۔ اس کے ساتھ کسی سے بھی محبت نہیں ہو سکتی ہے۔ محبت اگر کسی سے ہو سکتی ہے تو صرف اس کی خاطر ہو سکتی ہے۔ انبیاء و اولیاء سے اسی لئے تو محبت ہوتی ہے کہ وہ اللہ والے ہوتے ہیں۔ چونکہ عبادت کی حقیقت، غایت محبت ہے اور محبت کا کوئی مرحلہ بغیر اوامر کے اتباع اور نواہی سے اجتناب کے پورا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نبوت کی اتباع ہی کو مدعیانِ محبت کے لئے محبت کی نشانی قرار دیا ہے۔ قرآن میں ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

اللہ سے محبت کی لازمی شرط اتباعِ رسول بتائی گئی ہے چونکہ مشروط کا شرط کے بغیر پایا جانا محال ہے اس لئے اتباع نہ ہونے کی صورت میں محبت ناممکن ہے کوئی شخص ولی نہیں ہو سکتا اتباع چھوڑ کر ــــ اور یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ پیغمبر کی اتباع کو شرطِ محبت قرار دیا گیا ہے صرف اطاعت کو نہیں۔ اتباع اور اطاعت میں بہت بڑا فرق ہے۔ اطاعت وہی ہے جسے ہم اردو میں کہا ماننا کہتے ہیں اور اتباع کہتے ہیں کسی محسوس اور مرئی نمونہ کے مطابق کرنے کو اور بات ماننے کو۔ اسی لئے سارے قرآن میں یہ کہیں نہیں آیا کہ اللہ جل شانہٗ کی اتباع کرو۔ یہ ضرور آیا ہے کہ اطاعت کرو۔ اور اسی لئے اطاعت کا مطالبہ زبانِ نبوت نے سیاسیات میں سب کے لئے کیا ہے۔ فرمایا

اطیعوا ولو عبداً حبشیاً

مگر اتباع کا دائرہ صرف خلفاء راشدین تک محدود رکھا ہے ۔کیونکہ ان کے تمام اعمال براہِ راست سراج رسالت سے ماخوذ تھے ۔شرطِ محبت چونکہ اتباع ہے ۔اس لئے نصر آبادی کہا کرتے تھے

ادعیتم حب رسول اللہ وترکتم سنتہٗ

آمدم برسرِ مطلب ۔عزیزِ من! علم کا منشا یہ اور صرف یہ ہے کہ محبت کے لئے جس کی اتباع کو شرط قرار دیا گیا ہے اس کی زندگی کی مختلف حالتیں ، اعمال ، احوال سامنے آجائیں تاکہ ایک انسان مسلمان ہونے کے بعد شرطِ محبت کو پورا کر سکے ۔

شاید تم اسے فرزانگی کہو مگر میں تو اپنے اس عمل کو جو ختم نبوت کے سلسلے میں مجھے قید و بند تک لے آیا دیوانگی اور صرف دیوانگی سمجھتا ہوں ۔فرزانوں کو تو تم سمجھا سکتے ہو ، بہلا سکتے ہو مگر دیوانے دیوانے ہوتے ہیں یہاں افہام و تفہیم کام نہیں دیتا ۔

عشق می گوید کہ اے محکومِ غیر ۔۔۔ سینۂ تو از بتاں مانندِ دیر

تا نہ داری از محمد رنگ و بو ۔۔۔ از درودِ خود میالا نامِ او

اس موضوع پر اپنی ذات کی حد تک صرف اتنا جانتا ہوں کہ چالیس سال کی عمر کا تقریباً آدھا حصہ مطالعہ و تحقیق اور فکر و غور میں بیت گیا ہے ۔اس بیس سال کی مدت میں پڑھ کر سن کر ، سوچ کر ، سمجھ کر اور مشاہدہ تجربہ کر کے اس بارے میں میری معلومات کا ایک خاص سانچہ بن چکا ہے ۔میں ایک یقین رکھتا ہوں جس کی پشت پر برسوں کے مطالعہ سے فراہم کئے ہوئے دلائل ہیں ۔میں نے جس چیز کو حق پایا ہے ۔اس پر پورے قلبی اطمینان اور دماغی سکون کے ساتھ ایمان لایا ہوں ۔میری یہ معلومات میری ذات تک محدود نہیں رہی ہیں بلکہ میں پورے انیس سال سے ان کی تبلیغ کر رہا ہوں ۔اب اگر کسی نے یہ سمجھا ہے کہ میری معلومات ، میرے خیالات اور میرے عقائد کو صرف طاقت اور جبر کی دلیل سے بدلا جا سکے گا ۔تو میں اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہوں

کہ ایسے شخص کا مقام ایوانِ حکومت نہیں بلکہ کچھ اور ہے اور اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس دباؤ میں آکر میں اپنا ایمان اس کے پاس رکھ دوں گا اور آئندہ راشن کٹے ہوئے خیالات ہی ظاہر کروں گا تو میں اس کو آگاہ کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اپنی ترازو میں تولنے میں غلطی کی ہے میرا دل صداقت کے لئے تو ہمہ وقت کھلا ہوا ہے اور میری رائے کو علمی اور عقلی دلائل سے بدلا جاسکتا ہے۔ لیکن حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت میری رائے۔ نہیں بلکہ میرا ایمان ہے اور ایمان "قابلِ بیع و رہن چیز نہیں ہے۔ تین ماہ کی قید کے بعد جب میں باہر گیا تو میرا درس، جمعہ کی تقریر اور عید گاہ کا خطاب گواہ ہے کہ میرا پہلا بول وہی تھا جس کی پاداش میں تین ماہ اندر رہ کر جا چکا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ یہ ایمان ہے اور اس کا اظہار میرا پیدائشی حق ہے۔ اسے دبانے کی پہلے بھی جس نے کوشش کی ہے ناکام ہوا ہے اور آئندہ بھی جو کرے گا انشاءاللہ ناکام رہے گا۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ذاتِ نبوت سے عشق ہو اور چھپ جائے۔ یہاں شرطِ محبت ہی اتباع ہے اور بس۔ تم نے اگر اس وقت کا مطالبہ پورا نہیں کیا تو یہ رونے کا مقام ہے۔ قرآن نے تبوک میں پیچھے رہنے والوں سے کہا تھا۔

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا

خدا سے اس گناہ کے لئے مغفرت کی دعا مانگو۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

بنام مولانا عطاء الرحمٰن عتیق مولوی فاضل۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ محلہ دھاروال سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۳۰ر اکتوبر ۱۹۵۲ء

اسلامی نظامِ حیات کی برتری کی تمنا، رائے عامہ اور جمہوریت، رائے عامہ کے جائزہ لینے کا طریق، باطل کی ہواؤں سے حقائق کے چراغ نہیں بجھتے، جو کچھ مل جائے غنیمت ہے۔ سب کی فکر میں سب کچھ نہ چھوڑنا دانش مندی ہے، زعامت اور قیادت کا فرق ——

عزیزمن! السلام علیکم

دھیرے دھیرے حالات کو بدلتے ہوئے پڑھ پڑھ کر کڑھ رہا ہوں۔ اپنے لئے نہیں۔ اپنا تو ہے ہی کیا۔ آخری سانس ہیں۔ خدا کرے ایمان کے ساتھ دنیا سے روانگی ہو۔ زندگی تو اپنے ملک کے عوام کی وجہ سے کڑھن ہو رہی ہے۔ کیا ہوگا۔ کیا واقعی ایسا وقت آئے گا کہ اس ملک کی عوامی زندگی راحت کا سانس لے گی اور ان زمین پر لیٹنے والوں، بھیک مانگنے والوں، دواؤں سے محتاج ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینے والوں کو رہنے کیلئے اچھا مکان، سواری کے لئے کار، کھانے کے لئے عمدہ عمدہ اور لذیذ کھانے اور بیماری کے لئے شفاخانوں کی امداد ملے گی؟؟؟

پڑھتے ہیں کہ اسلام نے اپنے عہد اقتدار میں عوامی معاشرے کو اتنا بے نیاز اتنا باوقار اور متمول بنا دیا تھا کہ صاحبِ نصاب کو صدقہ دینے کے لئے ڈھونڈے سے شہری زندگی میں کوئی غریب نہ ملتا تھا۔ واہ واہ کیا کہنے ہیں اس نظام کے۔ اور کیا یا ارضی زندگی ابن آدم کیلئے پھر جنت کی پرکیف اور شاداب زندگی نہیں۔ بس کڑھن یہی ہے اور غم اسی کا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایک دفعہ تو خالص اسلامی زندگی خس و خاشاک سے صاف ہو کر سراب ضلالت میں بھٹکتی ہوئی دنیا کے سامنے آجائے علمی نہیں بلکہ عملی طور پر۔ کم از کم ان نادانوں کو جو ہر قدم پر اپنے گھر سے ہٹ کر دوسروں

کے لقموں کو دیکھتے رہتے ہیں اور ہر نظر فریب لقمے کو دیکھ کر لٹو ہو جاتے ہیں۔ کبھی کمیونزم، کبھی فیسی ازم اور کبھی امپیریلزم کا منہ دیکھتے ہیں ــــ پتہ لگ جائے کہ اسلامی نظامِ حیات کی برکتیں کیا ہیں، دستور ساز اسمبلی نے قدم تو اٹھایا ہے مگر کیا کہوں اور کس سے کہوں۔ ان اوپر والوں کو کچھ پتہ نہیں کیا ہو گیا اور کس دھن میں ہیں۔ ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ جمہوریت کا مگر کردار پیش کرتے ہیں۔ امپریلسٹوں کا۔ اسلام کو ان لوگوں نے ہوّا بنا دیا ہے۔ ساری آبادی اسلام اسلام کر رہی ہے۔ مگر ان کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ اور مزہ یہ ہے کہ ہر سانس میں جمہوریت کی راگنی الاپتے ہیں پتہ نہیں کہ ان کی لغت میں جمہوریت کس بلا کا نام ہے۔ آزاد ملکوں کا دستور ہے کہ جمہور کی جانب سے چنے ہوئے نمائندے ہر قدم پر جمہور کے احساسات کا احترام کرتے ہیں مگر یہاں کا الٹا دستور ہے۔ رائے عامہ مطالبہ کرتی ہے اور پوری قوت سے مطالبہ کرتی ہے۔ جلسے کرتی ہے۔ جلوس نکالتی ہے۔ قرار دادیں پاس کرتی ہے۔ تاریں روانہ کرتی ہے۔ لفافوں اور کارڈوں کے پلندے کے پلندے بھیج دیئے جاتے ہیں مگر اکڑی ہوئی گردن یہی کہتی رہتی ہے کہ ایک مخصوص طبقے کی آواز ہے۔ یہ جتانے کے لئے کہ یہ آواز عوامی ہے۔ جب عوام خود ہی پانچ آدمیوں کو وزیروں کی کوٹھی تک بھیجنے کا ارادہ کرتے ہیں اور ہر شہر سے اس کے لئے قدم اٹھاتے ہیں تو یہی عوام کے نمائندے اور جمہوریت کا راگ الاپنے والے عوام کے خون سے ہولی کھیلتے ہیں اور نام رکھتے ہیں اس کا لاء اینڈ آرڈر ــــ جب دل کی بھڑاس اس سے بھی نہیں نکلتی تو خالص امپریلسٹ کا مخصوص مستبدانہ اور حاکمانہ چولا پہن کر پنجاب کے مشہور اوڈوائر کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ کیسی بے انصافی اور کیسے بیچارے عوام کو پریشان کرنے کا سامان ہے۔ کوئی ان سے پوچھے خدا کے بندو! یہ کہاں کی جمہوریت ہے۔ انصاف تو یہ تھا کہ اگر عوام کے نمائندوں کو کسی مطالبے کے عوامی ہونے

کا یقین نہ آئے تو اس کے لئے یقین کے ذرائع پیدا کریں۔ ہر شہر میں خود جلسوں میں پہنچیں۔ اگر یہ نہیں تو استصواب کرالیں سارے ملک کا نہ سہی ایک صوبے کا کرائیں سارے صوبے کا نہ سہی ایک ضلع کا کرائیں۔ سارے ضلع کا نہ سہی تو ضلع وار ایک ایک تحصیل کا کرائیں۔ مگر یہ کام تو وہ کرے جسے رائے عامہ کے سامنے جھکنا ہو اور جو کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد رائے عامہ کو جھکانے اور کچلنے کا تہیہ کر چکے ہوں وہ ایسا کیوں کریں؟ تحریک ختم نبوت اسی استبداد کی بھینٹ چڑھ گئی۔ رائے عامہ کو پامال کر دیا گیا۔ پامالی کی وجہ جواز کے لئے بھانت بھانت کی بولیاں بولی گئیں بتایا گیا کہ ہندوستان سے مل گئے۔ کہا گیا کہ دولتانہ اقتدار کا خواہاں ہے۔ اس نے مولویوں کو پیسے دے کر استعمال کیا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر کیا باطل کی ہواؤں سے کہیں حقائق کے چراغ بجھے ہیں۔ حقیقت تو حقیقت ہے خواہ اس کے لئے مجاز کے کتنے ہی مصنوعی ڈھانچے بنائے جائیں ـــ مجھے اب اسلام کا نہیں بلکہ اسلام والوں کا دکھ کھائے جا رہا ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ ایک خواب شیریں تھا۔ مزہ بڑا آیا۔ خواب تھا واقعی یہ خواب کہ اسلام برسرِ اقتدار ہے۔ قرآن و سنت رائج، خلافتِ راشدہ کا دور عود کر آیا ہے۔ بازاروں میں کلبوں میں، عدالتوں میں خدا اور رسول کی طاعت ہی طاعت ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود اب تک جو کچھ ہوا ہے خوب ہوا ہے میں اس اصول کا آدمی ہوں کہ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ۔ جو کچھ ہوا ہے غنیمت ہے۔ اگر بالادست قوت صالح ہو تو اسی سے بہت کچھ غیر معمولی فوائد رونما ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ ابھی خود اس میں بہت کچھ لب کشائی اور مطلب برآری کی گنجائش ہے۔

اوّل تو آئین اور قانون کی خود باہمی آویزش ایسی ہے۔ جس سے چابکدست

باآسانی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

دوم یہ کہ قرارداد کا انطباق مستقبل میں بننے والے صوبائی قانون سازاداروں کے قوانین پر ہو۔

سوم رائج الوقت قوانین نہ کالعدم ہوں گے اور نہ ان کو قرآن وسنت کی مخالفت کے بہانے سے فیڈرل کورٹ میں چیلنج کیا جا سکے گا۔

چہارم شہریت اور شہری آزادی خود محتاج تشریح ہے۔ کل کا ذکر ہے کہ پنجاب کے قانون ساز ادارے نے شراب کی بندش کا قانون بنایا اور ایک شخص نے اس کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کیا۔ عدالت نے شہری آزادی کے بہانے سے قانون کو ناجائز قرار دیا۔

پنجم مذہبی آزادی کا جو ٹائٹل دستوری طور پر دیا گیا ہے۔ وہ اس مرحلہ پر عجب نہیں کہ بے دینی کی وبا پیدا کر دے اور زمانۂ اکبر کی طرح ایک گروہ ایسا پیدا ہو جائے جو قرآن وسنت کی بیان کردہ حدوں کو اپنے فکر ونظر کی کوتاہیوں سے پامال کر دے۔

ششم دستوری چربے کی یہ آئیٹم بڑی ہی خطرناک ہے کہ قرآن و سنت کی تعبیر جو فرقہ جس طرح کرے گا۔ اسی کو اسی طرح مانا جائیگا۔

شیعوں کو جانے دیجئے یہ تو شاہی فرقہ ہے۔ چکڑالوی فرقہ —— اور بھنگ پینے والوں کا مخصوص فرقہ ہے یعنی جنہیں ہم اہل سنت کہتے ہیں۔ ان میں خود ہزاروں مذہبی بولیاں بولنے والے موجود ہیں۔ کل کی بات ہے۔ کہ عرس پر کنجروں کے ناچ کے متعلق پنجاب اسمبلی میں سکندر کے زمانے میں کسی شخص نے آواز اٹھائی تو مسٹر شہاب الدین نے یہ کہہ کر ختم کر دی کہ مذہب میں مداخلت ہے اور مذہبی مداخلت شہری آزادی کے

خلاف ہے۔

اب غور فرمائیے کہ ان حالات میں اس اسلامی جمہوریہ میں قرآن و سنت کی کس حد تک پابجائی ہو گی۔

الغرض ابھی بہت کچھ خدشات ہیں — اور کیا عرض کروں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

بنام: مولانا حافظ خواجہ محمد احسان الحق صاحب مولوی فاضل ایڈمنسٹریٹو سول جج گوجرانوالہ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۴ر نومبر ۱۹۵۳ء

خلوت ایک بہت بڑی نعمت ہے، اللہ سبحانہٗ کی شان جمالی و جلالی، بلاء اور بلاء حسن میں فرق، شیخ اکبر اور مولانا روم کا نظریہ، علامہ محب اللہ بہاری کا تعارف ــــ

عزیزی العزیز! السلام علیکم

مورخہ ۲۴ر نومبر وقت عصر ہے۔ اذکار سے فراغت ہوئی تم یاد آئے۔ یہ پتہ نہیں کہ کیوں؟ تم تو سوچتے ہو گے کہ مجھے تکلیف ہو گی۔ اس لئے کہ جہاں میں ہوں۔ لوگوں کو اس جگہ سے نفرت ہے۔ نام ہی سے کتراتے ہیں مگر آہ لوگوں کو پتہ نہیں کہ یہاں کیا ہے۔ اگر انہیں پتہ ہو جائے تو باہر کی کروڑہا سرمایہ دارانہ زندگیاں قیمت دے کر بھی اسے خریدیں اور تمنائیں کریں۔ مگر کھوکھلی تمناؤں، جھوٹی آرزوؤں سے یہ نعمت نہیں ملتی یہ تو خاص اللہ جل شانہٗ کا انعام ہے۔ مجھے تو اس زندگی کے اب قیمتی ہونے کا پتہ چلا ہے۔ دیکھئے میاں کب تک رکھتے ہیں۔ اب تک ان کی شانِ جمالی کی گود میں وقت گذرا تھا اور سمجھتے تھے کہ بس گود یہی ہے۔ اب شانِ جلالی کی گود دیکھی تو اس کی بوقلموں لذتیں اور رنگ برنگ کی حلاوتیں اور ہی نظر آئیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ اللہ جل شانہٗ نے فرقان میں بدر والوں کو سمجھاتے ہوئے لیبلی المؤمنین منہ بلاءً حسنًا میں بلاء کے ساتھ حسن کی قید کیوں لگائی تھی۔ وہ محبت ہی کیا ہے اور اس میں مزہ ہی کیا ہے جو جفا سے خالی اور شورشوں سے نا آشنا ہو۔ مزہ تو تڑپنے ہی میں ہے اور تڑپ تڑپ کر مٹنے میں ہے۔ اللھم ارزقنی

شہادۃ فی سبیلک واجعل موتی ببلد رسولک ــــ

اب فکر یہاں کی نہیں وہاں کی ہے۔ اللہ سے دعا کرو کہ انجام بخیر ہو۔ دل میں ایک آرزو ہے۔ اس کی پابجائی کی تدبیر سوچتا ہوں مگر ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی۔ کوشش کر رہا ہوں اور بڑا امید ہوں کہ انشاء اللہ گوہر مقصود ضرور ملے گا۔

اس وقت دماغ میں ایک خلجان ہوگیا کہ شیخ اکبر اور مولانا روم کا نظریہ یہ بتایا جاتا ہے کہ جو محسوس نہیں وہ معقول بھی نہیں۔ نظریہ تو خوب ہے مگر یاد پڑتا ہے کہ ملا محب اللہ بہاری صاحب مسلم الثبوت نے اسے براہمۂ ھند کا فکریہ قرار دیا ہے۔ ملاجی کے بارے میں آزاد بلگرامی نے بحرے ست از علوم و بدرے ست بین النجوم لکھا ہے۔ عالمگیر کے زمانے میں لکھنؤ اور دکن کے منصب قضا پر رہے۔ پھر معتوب ہو کر معزول ہو گئے۔ اس کے بعد سفارشوں سے پھر منظور نظر ہو کر شاہزادہ عالم کے اتالیق مقرر ہوئے عالمگیر کی وفات کے بعد شاہ عالم کے زمانے میں ہمارے ھندوستان کے محکمۂ قضا کی صدارت ملی۔ عالم بڑے ہیں۔ بقول صاحب مآثر الکرام آباؤ اجداد انبہٹہ کے رہنے والے ہیں۔ انبہٹہ کی زمین ہی بڑی مردم خیز ہے۔ درس نظامی میں ان کی دو کتابیں داخل ہیں اور دونوں عجیب ہیں۔ سلم العلوم اور مسلم الثبوت ــــ سلم العلوم میں ایک جگہ شاید قضایا کی بحث کے آغاز میں ایک اعتراض کا جواب دیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ یہ جواب میرا خانہ ساز ہے۔ مجھ سے پہلے یہ کسی کو نہ سوجھی حالانکہ ان سے پہلے تفتازانی نے مطوّل میں بھی یہی جواب لکھا ہے اور ملاجی سے اچھا لکھا ہے۔ مولانا ابراہیم بلیاوی نے حاشیہ پر بہت کچھ مدافعت کی ہے مگر بات چپکی نہیں ہے۔ اصل یہی ہے کہ شاید ملاجی چوک گئے عافاہ اللّٰہ۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ

بنام مولانا محمد میاں صدیقی کاندھلوی فاضل جامعہ اشرفیہ و مولوی فاضل علمی مرکز انارکلی لاہور۔

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۰؍نومبر ۱۹۵۳ء

حسن پسندی اور حسن کاری، قرآن حسن کاری کا داعی بن کر آیا حسن پسندی کے لئے قرآن وحدیث کا سہارا، حسن پسندی کا نسب نامہ، حسن کاری کی تشریح، آیت محکم سے اخذ کردہ نتائج، امت میں استحسان کی مثالیں، صحابہ کو جو چیز سیاست میں گوارا نہ تھی وہ ہمیں عبادت میں پسند ہے، اباحت کا نظریہ اور اس کا نسب نامہ۔

عزیزی المخلص السلام علیکم

اس وقت دن کا ایک بجا ہے۔ چائے پی کر قلم دوات سامنے رکھی معاً تم یاد آئے۔ اس یاد کی اس خط سے تلافی کر رہا ہوں۔ جی تو چاہتا ہے ؎

گاہے از ہجر دوستاں کردن

گریہ ہائے ہائے می خواہم

کسی نے سچ کہا ہے ؎

راحت از روزگار نتواں یافت

خرمی ازیں دیار نتواں یافت

مزہ چاہتے ہو تو دیار پر زور دے کر پڑھو اور سنائی کا دل پہلو میں ہو تو اسلام کا مرثیہ کہو ؎

مسلماناں مسلماناں مسلمانی مسلمانی

ازیں آئینِ بے دیناں پشیمانی پشیمانی

کیا کہوں اور کیسے کہوں ؎

سواد نامہ خود افسانہ ما است　　　کہ ایں دور از دل دیوانہ ما است

دل دیوانہ والی بات خوب جچی - واقعی ہم جسے فرزانگی کہتے ہیں وہ اغیار کی زبان میں دیوانگی ہونی چاہیئے - اے کاش ہمارے عمل کی یہی قیمت ہو - شاید کہیں پڑھا ہے نہ معلوم اس کا روائیتی مقام کیا ہے کہ

لن یؤمن احدکم حتی یقال انہ مجنون

اللہ اللہ کیسے ہوں گے وہ دیوانے جن کے نام کو اسلام کے نام پر بٹہ لگانے والے ہم فرزانے ہیں - شاید والدین نے غلطی سے علی نام رکھ دیا ورنہ ؎

مرد را کردار عالی گر داند نہ نام!!
ہر کسے را علی نام است نے چوں حیدر است

بیابانی تو سب ہوتے ہیں مگر ہر آہوئے صحرائی کا خون مشک اذفر نہیں ہوتا - ان کی دیوانگی پر ہزار فرزانگیاں قربان - جنہوں نے اسلام کو دنیا میں پیش کیا اور اس کی خاطر جانوں اور مالوں کی بازی لگا دی - کیسے عواقب سے بے خبر تھے اور کیسے نتائج سے بے پرواہ - گویا کہ رسم ناز چناں باشد و نیاز چنیں - ایران والوں نے انکو دیکھ کر دیوانہ دیوانہ پکارا تھا - ان کو ان کی نیازمندانہ سرشاریوں کی وجہ سے دیوانہ ہی پکارا جانا چاہیئے - اللہ اللہ نہ ان کے یہاں سیاسی مصلحتیں تھیں نہ اقتصادی منفعتیں - سب سے بڑی سیاسی مصلحت اللہ کے دین کا بول بالا اور سب سے بڑی اقتصادی سودمندی نفس کی لذتوں کو ختم کر کے رسالت کے چراغ کو روشن کرنا تھا - آہ آج تقدیر الٹ گئی - فضا بدل گئی - زمین دگر ہوگئی - زندگی کے ہر گوشے میں حسن کاری کی جگہ حسن پسندی آگئی - قرآن حسن کاری کا داعی بن کر آیا ہے جسے قرآن و سنت کی زبان میں احسان کہتے ہیں - احسان کے معنے نیکی کردن نہیں بلکہ نیکوکاری کردن ہیں - زندگی کے ہر گوشے میں نیکوکاری اور حسن کاری کا مطالبہ تھا یعنی صرف عمل کا نہیں بلکہ ہر عمل میں حسن کار بننا ضروری قرار دیا

تھا۔ شاید طبرانی کی روایت ہے کہ

ان اللہ کتب الاحسان علی کل شیٔ

بعد کو یار لوگوں نے مطالبہ کی سختی سے تنگ آکر ترمیم کی اور حسن کاری کی جگہ حسن پسندی کو قرآن کی ساری آیتوں اور رسالت کے سارے ارشادات کو پس انداز کر کے اسلام کا مطالبہ بنا دیا۔ گویا اسلام کا مطالبہ احسان نہیں بلکہ استحسان ہو گیا اور داد دیجئے اس ذہن کی جس نے اس کی تائید

ما راٰہ المسلمون حسنًا فھو عند اللہ حسن

سے پیدا کر ڈالی۔ اور اس باریک پردے کے پیچھے نبوت کے خلاف ہر شخص نے من مانی سازشیں کیں۔ جی بھر کر اسکیمیں بنائیں۔ وہ ساری کر لسی جسے نبوت کنڈم کرنا چاہتی تھی نبوت ہی کے نام پر چالو ہو گئی۔ ایجنسیاں کھل گئیں اور کوچہ بکوچہ، در بدر، محلہ بہ محلہ، قصبہ در قصبہ اور شہر در شہر ایجنٹ پھیل گئے فانا للہ وانا الیہ المشتکیٰ ــــــ

اجتماعی اور سیاسی زندگی سے لیکر انفرادی زندگی تک یا دارالحکومت سے لیکر مسجد اور خانقاہ تک کایا پلٹ گئی۔ مسلمانوں میں سب سے پہلی تلوار اٹھی۔ کیوں؟ پتہ نہیں کہ لوگ کیا سمجھتے ہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ بنیادی اختلاف یہی تھا کہ سیاسی اور اجتماعی زندگی میں کچھ لوگوں نے احسان سے ہٹ کر استحسان کی راہ اختیار کر لی۔ یعنی فکر و نظر کہئے یا نفس کا چور کہئے۔ سوچنے والوں نے یہ سوچا کہ نبوت نے سیاسی اور اجتماعی زندگی میں جو اسوہ حسنہ چھوڑا ہے اس کی پابجائی ضروری نہیں۔ یہ اسلام کے نام لیواؤں میں سب سے پہلے شیطان کو قدم جمانے کا موقعہ ملا اور قرآن کی چیختی ہوئی متعدد آوازیں خالص سیاست کے میدان میں صدا بصحرا ہو گئیں۔ نہ ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی

پر نظر رہی نہ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ سامنے رہا اور نہ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً پر غور کیا۔ سب سے بے نیاز ہوکر اور فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی سے نظریں بچا کر فیصلہ کر لیا کہ سیاسی اور جماعتی زندگی میں اسلام حسن کاری کا نہیں بلکہ حسن پسندی کا خواہاں ہے۔ بلکہ بعد میں کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ حکومت کے باب میں مجھ سے حسن کاری کا جو مطالبہ کرے گا اضرب عنقہ میں اس کی گردن اڑا دوں گا

اب ذرا آگے بڑھئے اور سوچئے کہ اس بنیادی تبدیلی کا نتیجہ کیا نکلا۔ وہی جو ایک کم ظرف کو پولیس کمشنر بنانے یا ایک نادان تنگ نظر کو وزیر اعظم بنا دینے کا ہوتا ہے۔ اول اقتدار کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ اس شراب کو پی کر کوئی بھی نبوت سے الگ ہوکر قابو میں نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ حکومت کے فرائض انجام دینے کے لئے جس علم کی اور جس بے لوثی و بے غرضی اور بے نیازی کے ساتھ خدا کے ڈر اور محاسبہ کے دغدغے کی حاجت ہے وہ نبوت سے الگ ہوکر کہاں سے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کو چھوڑ کر ہر دور میں کوئی سیاست بھی خواہ وہ انفرادی زندگی میں کیسی ہی اچھی ہو انسانی زندگی میں صحیح توازن قائم نہ رکھ سکی ــــ

ظلم وعدوان، ناجائز نفع اندوزی، بے اعتدالی اور ناہمواری نے کسی نہ کسی صورت سے راہ پائی۔ انسانی زندگی فطری آزادی سے محروم ہو گئی۔ سارے مصائب، ساری تباہیوں اور امت کی ساری محرومیوں کی اصلی جڑ یہی ہے یہ وہ روگ ہے جس نے پورے اسلام کا نقشہ بدل دیا ہے۔ اور جس بیماری کا آغاز دماغ سے ہوا تھا وہ پلوں دوڑ کر سارے جسم اسلام میں پھیل گئی۔ اخلاق وروحانیت، علم و فکر، تمدن و معاشرت اور یاد الٰہی اور نیاز مندی کو دیمک کی طرح اندر اندر کھا رہی ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پھر

سے لفظ کو حسن پسندی اور استحسان سے ہٹایا جائے اور قرآن کے مطلب یعنی حسن کاری اور احسان کو پورا کیا جائے۔

تاریخ میں آج تک ان دونوں کے نام موجود ہیں جن میں اس کے لئے سرتوڑ اور جانگسل کوشش کی گئی تھی۔ صفین ہو یا حرہ۔ کربلا ہو یا بیابان مکہ اور پھر علی ہوں یا حسین شہید ہوں یا دوسرے تابعین۔ اسی میدان کے ہیرو ہیں۔ یہ اس کے سوا کچھ نہیں چاہتے تھے کہ خالص سیاسی زندگی میں استحسان سے منہ موڑ کر احسان کو اپنایا جائے ؎

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؓ

کہتے تھے اور صرف یہی کہتے تھے کہ سیاست میں نبوت نے جو اسوۂ حسنہ چھوڑا ہے اور جسے خوبی کے ساتھ پہلوں نے نبھایا ہے اس میں ترمیم نہ ہو۔ یہی احسان اور حسن کاری ہے۔ حافظ ابن کثیر نے شاید لیبلوکم ایکم احسن عملاً کے تحت فضیل بن عیاض کے حوالے سے ان گنت تابعین اور صحابہ کا یہ تاثر نقل کیا ہے۔

لا یقبل العمل الا اذا کان خالصاً و صواباً والخالص ان یکون للّٰہ تعالیٰ والصواب ان یکون علیٰ سنۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم (او کما قال)

جنید بغدادی کی طرف منسوب کر کے جو تصوف کی کتابوں میں یہ فقرہ لکھا جاتا ہے کہ

الطرق کلھا مسدودۃ علی الخلق الا من اقتفی اثر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ زندگی کی کوئی شاخ بھی اثر رسول سے الگ ہو کر عنداللہ مقبول نہیں ہے اور کیوں ہو جب کہہ دیا گیا ہے کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ الخ

اس آیت میں ایمان کو کڑی شرطوں کے ساتھ مقید کیا ہے کہ۔

الف:۔۔۔ ما شجر بینھم میں رسالت کا فیصلہ

ب:۔۔ فیصلہ موافق ہو یا مخالف۔ اس کے خلاف دل گرفتگی نہ ہونا۔

ج:۔۔۔ ساری زندگی کے سارے حالات میں اپنے آپ کو سراپا رسالت کو سونپ دینا۔

دیکھئے ویسلموا کے ساتھ تسلیماً کی قید کس قدر معنی خیز ہے۔ اس نے بات میں کتنا زور پیدا کیا ہے۔ کیا ۔۔۔ اس کا حاصل یہ نہیں ہے کہ قرآن احسان چاہتا ہے اور احسان یہ ہے کہ زندگی کے گوشوں کے لئے خوبصورت نے جو محسوس اور مرئی نمونہ عمل چھوڑا ہے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا جائے۔ جیسا پہلے کہہ چکا ہوں کہ مرض کی ابتداء دماغ سے ہوئی اور اس کی بیماری پلوں دوڑ کر امت کے سارے جسم میں پھیل گئی۔ ہر مقام، ہر گوشے اور ہر جگہ پر حسن پسندی نے قبضہ کر لیا۔ مرض اتنا عام ہو گیا کہ اب عام مسلمان تو درکنار خود علماء اور خواص کے طبقہ میں اس فکر و نظر کے رکھنے والے تو ہیں کہ عبادات اور شعائر میں احسان ہونا چاہیئے اور اس کے لئے وہ آئے دن نت نئے رنگ میں شور بھی مچاتے رہتے ہیں۔ لیکن ایسے ارباب نظر معدودے ہیں جو دور اول کی طرح سیاسی اور اجتماعی زندگی میں نظریہ احسان کے داعی ہوں ۔۔۔ میں کیا کہوں ۔۔۔ یہاں تو معاملہ بالکل الٹا ہوا ہے۔ سیاست، اجتماعیت اور ریاست تو بڑی چیزیں ہیں۔ اب تو آخری دور میں ایک خاص طبقہ ایسا بن چکا ہے

جو عبادات میں بھی نظریہ استحسان کا مدعی ہے اور اس کے لئے ایک علمی ترکش سے دلائل کے تیر بھی نکالتا رہتا ہے۔ شائد آپ نے ان لوگوں کے کردار و گفتار پر غور نہیں کیا۔ کردار میں ان کی نماز پر ایک چلتی نظر ڈال کر ان سے پوچھئے کہ نماز میں نیت کے تلفظ سے لیکر وہ تمام کام جو نماز کے بعد امام اور مقتدی مل کر کرتے ہیں یعنی سب کا بآوازِ بلند لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہنا۔ صلوٰۃ و سلام بلفظ خطاب یا بلا خطاب پڑھنا۔ امام اور مقتدی دونوں کا سنتوں کے بعد اجتماعًا دعا مانگنا ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ کی اصل کیا ہے ۔۔۔ جواب میں آپ کے سامنے نظریہ احسان نہیں بلکہ استحسان آئے گا۔ کس کس بات کو روؤں۔ مساجد سے ہٹ کر ذرا معابد میں آ جائیے۔ یہاں بے چارے احسان کا گذر ہی نہیں ہے۔ قدم قدم پر استحسان براجمان ہے۔ پیشانیاں رگڑی جا رہی ہیں، مرادیں مانگی جا رہی ہیں۔ نذریں چڑھ رہی ہیں، منتیں مانی جا رہی ہیں۔ ایصالِ ثواب نے الٹی زقند لگا کر عذاب کی صورت اختیار کر لی ہے سب بھر گئے ہیں، سب نے منہ موڑ لیا ہے۔ سب دوسروں کے چلانے والے بن گئے ہیں۔ سرتا سر کام کا نقشہ بدل گیا۔ کہاں تک چھیڑوں یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں ؎

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

یہ ساری خرابی احسان کی جگہ استحسان کے آنے سے ہوئی۔ اللہ اکبر! صحابہ کے زمانے میں صرف سیاسیات میں احسان کی جگہ استحسان آیا تو نیاموں سے تلواریں نکل آئیں خون کے معرکے قائم ہو گئے۔ آہ آج زندگی کی ہر گلی میں حسن پسندی سے کام لیا جا رہا ہے۔ اسلام کے ہر گوشے پر یزید اور حجاج کا روحانی تصرف غلبہ پا رہا ہے مگر کوئی حسین اور زید نہیں

ہے۔ بہرحال احسان اور استحسان کی نظریاتی کشمکش کا آغاز وہ تھا اور انجام یہ ہے ۔ بات لمبی ہو جائے گی مگر کیا کروں کئے بغیر چارہ نہیں۔ جس دور میں احسان و استحسان کی کشمکش کا آغاز ہوا تھا۔ وہ دور صدری کہلاتا ہے۔ یعنی علوم سینوں میں تھے۔ ایک کروٹ کے بعد جب علوم سینوں سے صحیفوں میں منتقل ہوئے اور مباحث کی طرح اس موضوع پر بھی غور و فکر شروع ہوا تو علمی اصطلاحوں میں اسی موضوع نے حسن و قبح عقلی و شرعی کا اصطلاحی لبادہ پہنا۔ اور پنے والی بات یونانی فلسفہ کی موشگافیوں میں دب کر رہ گئی۔ بغداد کے بازار میں جائیے ۔ آستینیں چڑھی ہوئی ہیں۔ گرما گرم بحث ہو رہی ہے کہ حسن و قبح شرعی ہے یا عقلی ۔ اصولِ فقہ اور البیان کا یہ بلند پایہ موضوع ہے ۔ میں صرف زنجیر کا سرا بتانا چاہتا ہوں۔ مختلف کڑیوں سے بحث کر کے دماغ کو الجھن میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ لکھتا جاؤں۔ مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں قلم کی غلط کروٹ کا شکار نہ ہو جاؤں۔ اچھا آج ختم کرتا ہوں پھر کبھی یاد آئے تو بات پوری کروں گا مگر اشارتاً اتنی بات اور کہے جاتا ہوں کہ تم نے فقہ اور اصول کی کتابوں میں اباحتِ اصلیہ کا مسئلہ لکھا دیکھا ہوگا اور پڑھا بھی ہوگا اور کہیں اصل حرمت کا فیصلہ بھی پڑھا ہوگا اور کسی جگہ تمہاری نظر سے یہ عبارت بھی گذری ہوگی کہ الاصل التوقف ۔

اس کا شجرہ نسب بھی اسی احسان اور استحسان سے ملتا ہوا ہے۔ یہ موضوع ذرا تفصیل طلب ہے غالباً مسلم الثبوت کی کسی شرح میں لکھا ہے کہ الاصل فی الاشیاء الاباحۃ یزید اور عبدالملک کا مذہب ہے ۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بنام مولانا منظور احمد صاحب خطیب جامع مسجد نارووال ضلع سیالکوٹ۔

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ
۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء

غداری کا الزام خود الزام تراشوں کی کھلی غداری کا آئینہ دار ہے ، عبدالملک بن مروان کا آزادیٔ رائے کو کچلنے کے لئے آرڈیننس ، سیاسی زندگی کے سارے گوشے آج مصلحت اور منفعت کے تقاضوں سے پورے ہوتے ہیں۔

عزیز من ! السلام علیکم

یہ خط ایک خیالی دنیا میں لکھ رہا ہوں۔ خیالی اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ میری بات تم تک نہیں پہنچے گی۔ میں آجکل زندوں کے گورستان میں رہتا ہوں۔ مگر یہ لوگوں کا تاثر ہے۔ ہے تو یہ جیل مگر میرے لئے اللہ کی رحمت — کیوں ؟ یہ موضوع ذرا تفصیل طلب ہے۔ پھر سہی۔ جیل کا نام سنتے ہی تم شائد اس کشمکش میں ہو کہ یہ کیوں ہوا۔

عزیز من ! آج کی دنیا میں یہ بات پوچھنے کی نہیں۔ تم پہلے وکیل تھے اب جج ہو۔ قانون والی بات تم خوب جانتے ہو۔ کوئی حکومت قانونی نہیں ہے۔ جب تک عدلیہ آزاد نہ ہو اور جب تک فرماں روائی ہنگامی قوانین اور سیکورٹی کی فراہم کردہ اطلاعات کے بل بوتے پر چل رہی ہو۔ سمجھ لو کہ شخصی انصاف کا جنازہ نکل گیا۔ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں کہ غداریٔ مملکت کا جو الزام مجھ پر لگانے والے لگاتے ہیں۔ کیا میں اپنی انفرادی ، اجتماعی اور سیاسی زندگی کے دوائر تک اس کا مرتکب ہو سکتا ہوں۔ بھلا جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ ایک ٹڈ یبی کو ایذا دینا تقاضائے ایمان کے خلاف ہے اس پر یہ الزام لگا دینا کہ وہ ایک ایسی مملکت کے خلاف ہے

جسے مسلمانوں نے اپنے خون سے سینچ کر، اپنی آبرو کو بیچ کر اور اپنی دولت کو لٹا کر بنایا ہے۔ فی الواقع خود الزام تراشوں کی کھلی غداری کا آئینہ دار ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اپنے عدل و انصاف اور اخلاق و کردار کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ وفادار بناتے مگر کر یہ رہے ہیں کہ اپنے کردار و گفتار کے تیروں سے خود غدار بنا رہے ہیں۔ فانا اللہ و الی اللہ المشتکیٰ۔

تم توجہ ہو۔ فرمایئے کیا رائے عامہ کی بنائی ہوئی حکومت میں رائے عامہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے منتخب حکمرانوں کے سامنے اپنے دل اور ضمیر کی آواز کو پیش کریں۔ مگر ہمیشہ سے اقتدار کی اس کج ادائی نے کہ واقعات پر مبنی حکایت کو نہ کہ شکایت کو خود اقتدار کے خلاف چیلنج سمجھا۔ اچھے اچھے کام کے آدمی موت کے گھاٹ اتار دیئے۔ اسلامی تاریخ میں عبدالملک جیسے انجصاص انجر الناس اور افسق الناس کہتے ہیں، نے رائے عامہ کی آزادی کو کچلنے کے لئے آرڈیننس نافذ کیا تھا کہ

من قال لی بعد یومی ھذا اتق اللہ اضرب عنقہٗ

بنوامیہ کی باقاعدہ مضبوط حکومت دراصل عبدالملک ہی سے شروع ہوئی ہے۔ گویا دراصل قبائے استبداد کا سب سے پہلے باقاعدہ زیب تن کرنے والا دیو استبداد یہی ہے مگر دنیا جانتی ہے کہ یہ رائے عامہ اور جمہوریت نہیں ہے۔

بہر حال کہنا یہ چاہتا ہوں، میری یہاں آمد تعجب خیز نہیں ہے۔ حکیم سنائی نے کیسی اچھی بات کہی ہے ؎

منکہ چوں سیمرغ در یک گوشہ مسکن کردہ ام
مادرائے مرکز خاکی نشیمن کردہ ام!

کہنے والے تو غدار کہتے ہیں اور ان کو کہنا چاہئیے۔ وہ اگر یہ نہ کہیں تو آپ ہی بتائیے اور کیا کہیں کہ، وہ نہیں جانتے اور جانتے ہیں کہ جانتے ہیں ـــ کہ ہم غدار نہیں ہیں ـــ جی نہیں وہ ضرور جانتے ہیں اور جانتے ہوئے انجان نہیں بلکہ دانا شریر بنے ہوئے ہیں

اور ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ جب بات نہ مانی ہو اور عزت نفس میں آمادگی نہ ہو تو بات یونہی بنایا کرتے ہیں طاقت غداری کا الزام ہی تراشا کرتی ہے مگر ایو جالسٹائے کے لفظوں میں کہوں گا کہ غداری کا الزام اس وقت تک ہے جب تک ناکامی ہے اور جب آواز میں قوت اور رائے عام میں اظہار پیدا ہوا تو یہی غدار کہنے والے ان گوشہ نشینوں کو محب وطن اور مجاہد کہہ کر پکاریں گے۔ کیا ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوا؟ کیا

ھو کالذی ھدی من الذین آمنوا سبیلاً

میں اس طرف اشارہ نہیں ہے۔

بیروں تراود از دل شاں تلخی مزاج

میرے بھائی! یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ سیاسی زندگی کے سارے گوشے کج مصلحت، پالیسی اور منفعت کے اقتضاء سے انجام دیئے جا رہے ہیں اور جب تک نظامِ حکومت کی بنیاد اس سے ہٹ کر صرف خوفِ خدا، خوفِ حساب پر قائم نہ ہوگی اور جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی زیادتی سے مواخذہ عدالت الٰہی کے دغدغے کی سرشاریوں سے نہ ہوگی زندگی کی سرکل اسی طرح بگڑی رہے گی۔ سائنس کی مدد سے چاہے کتنے خارجی اسباب تلاش کر لو مگر اصلی سبب خود ما بانفسہم ہے۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

بنسپل خواجہ احسان الحق ایڈمنسٹریٹو سول جج گوجرانوالہ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۹ نومبر ۱۹۵۳ء

زحمت میں رحمت، مصیبت میں نعمت کا تصور، تنہائی عتاب و عقاب نہیں بلکہ بیماری کی دوا ہے، خلوت اور جلوت کا تقابل، غلط رفاقت ہو تو خلوت سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے، خلاف مزاج صحبت سے قبض ہوتا ہے —

جی نی اللہ حافظ صاحب! السلام علیکم

کہنے کو تو جہاں میں ہوں لوگوں کی زبان میں زندوں کا گورستان ہے۔ اور ہے بھی لوگوں کے خیال کے مطابق کچھ سچ مگر میرا تاثر یہاں کے بارے میں ہمیشہ لوگوں کے خلاف رہا ہے۔ لوگ یہاں کے معاشرے میں جیسے سب سے بڑی زحمت سمجھتے ہیں وہ ہی میرے نزدیک سب سے بڑی رحمت ہے۔ اور جو ان کے خیال کے مطابق مصیبت ہے وہ میرے لئے نعمت ہے — لوگ یہاں سب سے زیادہ کوٹھری میں تنہائی سے گھبراتے ہیں۔ اندھیرے کی نگری اور مکین تن تنہا — بعض کے لئے یہی اختلاج قلب کا سامان بن گیا۔ مگر مجھے اس چیز سے پیار ہے۔ جوں جوں خلوت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ میرے دل کی کلیاں زیادہ سے زیادہ کھلتی ہیں۔ اور جس قدر جلوت کا سامان ہوتا ہے اسی قدر دل میں کملاہٹ کے آثار ظاہر ہوتے جاتے ہیں ؎

مرغِ آتش خوارہ کے لذت شناسد دانہ را

پچھلی دفعہ ایک بار جب مسٹر غلام سرور کا عتاب برق و رعد بن کر یہاں کے خرمن امن کو تباہ کر رہا تھا تو — نزلہ بر عضوِ ضعیف افتاد — کے مطابق میں بھی مغضوبِ نگاہوں کا شکار ہوا۔ عتاب کے نتیجہ میں جو عقاب میرے لئے تجویز ہوا وہ تنہائی کی رہائش تھی لیکن اس بیچارے کو کیا پتہ؟ کہ یہ میری بیماری کی دوا ہے اور یہ وہ ہی نسخۂ شفا ہے جو

تلاش کے باوجود مجھے باھر نہیں ملتا تھا۔

وہ بند کر کے چلے گئے۔ میں باغ باغ تھا اور دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ ان کے باھر نکلتے ہی الحصن الحصین اور قرآن حکیم پر ایک نگاہ ڈالی اور دیوار پر کوٹلے سے چوبیس گھنٹے کی مشغولیت کا پروگرام بنا لیا۔ پندرہ دن بڑے مزے سے گزرے لیکن آپ یہ نہ سمجھ جائیے کہ میں جلوت کی افادیت کا منکر ہوں۔ حاشا ثم حاشا۔ نہیں اگر صالح اور عالم ہوں تو ھزار خلوتیں ان پر قربان۔ لیکن صرف وقت کو گزارنا میرا مسلک نہیں ہے۔ خلاف مزاج صحبت سے جتنا مجھے قبض ہوتا ہے شاید ہی کسی کو ہو۔ خبر نہیں لوگ کیسے برداشت کر لیتے ہیں اور کیونکر وقت کو کڑھن، کٹھن اور گھٹن کے ساتھ گزارتے ہیں۔ یہاں کی فضاؤں میں آجکل ساری مادی اور جسمانی راحت کے سامان فراہم ہیں مگر حبس رفاقت کا ہے

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

ہے۔ اس سے حد درجہ تکلیف ہے۔ اخلاق نے فائدہ نہیں زبان سے کہا نہیں۔ شرافت سوز گفتار سے کان پھٹ جاتے ہیں اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مگر کلیجہ تھام کے بیٹھے ہوئے ہوں اور اس پر بھی اللہ سے اجر کا متمنی ہوں۔ غیبت کی گرم بازاری میں تنابز بالالقاب، لمز اور ھمز کے سارے اطوار، تمسخر اور استہزاء کی عام صورتیں نت نئے رنگ میں دن بھر دیکھتا ہوں۔ رحم کی اللہ سے دعا بھی کرتا ہوں آپ بھی دعا فرمائیے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

بنام حافظ محمد صادق صاحب گندم منڈی سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

یکم دسمبر ۱۹۵۳ء

وقت کی قدروقیمت، انبیاء وقت کے سب سے زیادہ قدرداں تھے
میدانِ حشر کا نظارہ، قبر کا بھیانک اور خوفناک منظر، یہاں منٹ
پل اور گھڑی بڑی قیمتی ہے، اس مختصر سی زندگی میں ایک لمبی زندگی
کے لئے سامان فراہم کرنا ہے، دور اندیشی یہ ہے کہ ابد اور دوام کی زندگی
کیلئے پوری تیاری ہو، اس زندگی میں نگاہوں، کانوں کو مرضیاتِ الٰہی کا
خوگر بناؤ، اچھی زندگی کا مختصر سے مختصر لائحہ عمل، صدقہ کی قوت اور
اللہ کے یہاں اس کا مقام۔

عزیز سلمہ، السلام علیکم

اس وقت ڈیڑھ بجا ہے۔ تم یاد آئے۔ اگرچہ اکثر یاد ہی آتے رہتے ہو اور خصوصاً دعاؤں میں۔ اس وقت چائے اور نماز سے فراغت ہوئی تو تم خود بخود بن بلائے مہمان بن گئے جی چاہا کہ تم سے باتیں کر لوں اور دوسرے مشاغل کو ملتوی کر دوں۔ اس وقت پروگرام تو تلاوت قرآن کا ہے مگر کیا کروں تم سے بات نہ کروں تو شکایت کرو گے۔ کہو وقت گذار رہے ہو یا گذر رہا ہے۔ وقت بڑی قیمتی چیز ہے لوگوں کو اس کی قدر نہیں۔ بے قدری اس لئے ہے کہ ابھی اس کی قدردانی کا مقام آنکھوں سے اوجھل ہے۔ اس مقام کو آج تک انبیاء کے سوا آنکھوں سے کسی نے نہیں دیکھا۔ انہوں نے دیکھا تو ان کی نیازمندی کی رگ پھڑکی، اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا اور رات فکرونظر کے ساتھ اختر شماری میں گذار دی۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

سوچو کہ ایک صاف اور چٹیل میدان، باغات، محلات، حور و غلمان، میوہ جات،

دلچسپی کے سارے سامان اور ذرے ذرے کے ایسے سارے اسباب مہیا کرتے ہیں کہ دل ہیں چین، نگاہوں میں سرور، شنوائی میں کیف اندوزیاں ہوں اور یہ سب کچھ ہو مگر تنوع اور بوقلمونی کے ساتھ ہو تناسب اور توازن کے ساتھ ہو۔ اللہ اکبر!

مشکلات کا اتنا انبار ہے کہ ہر مصیبت اور ہر تکلیف بھیانک شکل سامنے لئے ہوئے کھڑی ہے۔ سانپوں، بچھوؤں اور تمام زہر چکاں جانوروں کی بھیڑ سے گزر کر جانا ہے۔ ایسا ساز و سامان ساتھ لے جانا ہے کہ راستے کی تاریکی کے ساتھ کسی ایذا رساں چیز کو راستہ روکنے کی ہمت نہ ہو۔ اس کے آگے ایک لق و دق میدان ہے۔ مخلوق کا اتنا ہجوم ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے گرمی کی اتنی تیزی ہے کہ ہر شخص اپنے پسینہ سے اس قدر شرابور ہے کہ عرق در عرق ہے اسی میں حساب ہو رہا ہے۔ چیکنگ اتنی سخت ہے کہ رائی اور ماشہ بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔ الفاظ نہیں معانی تولے جا رہے ہیں۔ کردار بلکہ گفتار بھی تل رہی ہے۔ صورتیں اس قدر وحشت ناک ہیں کہ ہر شخص دیکھتے ہی لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ کوئی بناوٹی حساب یہاں کام نہیں دیتا اچھوں اچھوں کے چھکے چھوٹ رہے ہیں۔

اس منزل سے پایاب ہونے کے بعد وہ میدان سامنے ہے۔ جس میں ہمیں یہاں رہ کر سامان کے لئے میٹریل تیار کرنا ہے کہ

مالاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔

اتنے بڑے اور اہم کام کیلئے وقت صرف زیادہ سے زیادہ ساٹھ سال کے لگ بھگ ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ وقت تھوڑا ہے یا زیادہ، اسے گزرنا چاہیئے یا گذارنا چاہیئے۔ اس کا منٹ، اس کی پل، اس کی گھڑی بڑی قیمتی ہے۔ پردہ ہٹنے کے بعد یالیتنا نُرَدُّ اور فارجعنا کی صدائیں بلند کریں گے۔ شرم سے گردنیں جھکی

ہوں گی اذا المجرمون ناکسوا رؤسھم آنکھیں زمین میں گڑی ہوں گی خشعا ابصارھم چہرے کالک والے اور ذلیل ہوں گے ترھقھم قترۃ اور ترھقھم ذلۃ۔ نہ بھائی ہوگا نہ بہن۔ نہ باپ ہوگا نہ ماں، نہ بیوی ہوگی نہ بچے یوم یفر المرء من اخیہ وامہ وابیہ وصاحبتہ وبنیہ۔ نہ بنے ہوئے مکان نہ بچی ہوئی دکان ہوگی ہر شخص اپنی حالت میں مگن ہوگا لکل امرء منھم یومئذ شان یغنیہ۔

میرے پیارے یہ وقت غفلت سے گزار دینے کا نہیں۔ دور اندیش بنو۔ دور اندیشی یہ نہیں ہے کہ اتنا کماؤ کہ تمہارے بعد تمہاری اولاد بھی مزے کرے بلکہ دور اندیشی یہ ہے کہ اس تھوڑے سے وقت میں اتنی محنت کرو کہ آئندہ ابدالآباد کی زندگی میں سکھ اور چین نصیب ہوگا کہ وہی زندگی اصل زندگی ہے اللھم لا عیش الا عیش الآخرۃ۔ قبر کی مشکلات حل ہوں۔ میدان حشر کی رسوائیوں سے بچاؤ ہو۔ اور بالآخر عیشۃ راضیۃ بسر ہو۔ چہرے پر چمک دمک ہو۔ بشاشی بشاشی ہو۔ تروتازگی ہو۔

میرے عزیز! یہاں نگاہوں کو اللہ جل شانہ کے احکام کا پابند بناؤ تاکہ یہ نگاہیں اس زندگی میں دیدار الٰہی کی لذت، یا بیوں سے ہمدوش ہوسکیں۔ یہاں کانوں کو مرضیاتِ الٰہی کے لئے وقف کردو تاکہ اس زندگی میں کلام الٰہی کے سننے کی کیف اور لطافت سے بہرہ یابی ہو۔ قدم قدم پر احتیاط سے چلو۔ منہ سے بات سوچ کر اور تول کر نکالو اور یقین کرو کہ منہ سے نکلا ہوا ایک بول یہاں رائیگاں نہیں۔ اس کی پشت پر نتائج کا ایک پہاڑ ہے۔

زندگی کو اچھی بناؤ ـــــ حلال روزی کمانے کے ساتھ ساتھ محرمات سے بچتے ہوئے اور فرائض کی پابندی کرتے ہوئے کچھ تھوڑا سا وقت چوبیس گھنٹوں میں نفس کے محاسبہ کے لئے نکالو۔ حلال کی قید اس لئے لگائی ہے کہ اس

سے ہٹ کر ساری عبادت اور نیاز مندی بیکار ہے۔ مال سے محبت بہت ہی کم کرو زیادہ سے زیادہ خدا کی راہ میں صدقہ کرو۔ پیارے! صدقہ میں اللہ جل شانہٗ نے وہ قوت رکھی ہے کہ اس سے گناہ دُھل جاتے ہیں اور غضب رب ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اس لئے صدقہ بڑی ضروری چیز ہے۔ تم تاجر ہو تاجروں کے نام تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس صدقے کے بارے میں خاص پیغام ہے۔ فضائل صدقات اردو میں لکھے ہوئے ہیں ان کو پڑھو۔ اچھا لو اب رخصت ہوتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۴؍دسمبر ۱۹۵۳ء

کچھ اپنا حال، روزانہ کالائحہ عمل، جیل کی زندگی کے چوبیس گھنٹے، دن بھر کے مشاغل اور روزمرہ کا پروگرام

جی فی اللہ وفقنا اللہ وایاکم السلام علیکم

جی چاہا کہ کچھ اپنی حالت لکھوں۔ نہ معلوم میرے تاثراتِ قلب زبانِ قلم سے نکلنے کے بعد آپ تک پہنچتے ہیں یا کہ نہیں۔ اس خیال سے کہ دل ڈا بدل رہے اسے لکھ رہا ہوں۔

کچھ ہجوم وساوس اس قدر ہے کہ بے چین ہوں اور بے قرار ہوں۔ ارادۃً سکون چاہتا ہوں مگر بلا ارادہ بیقرار ہو جاتا ہوں۔ وساوس لاتا نہیں ہوں آجاتے ہیں۔ اگرچہ دن رات مشغول رہتا ہوں مگر ان مشغولیتوں کے باوجود دل کی دنیا خطرات کی آماجگاہ بنی رہتی ہے۔ یہ روگ ایسا لگا ہوا ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سے بے نیازی اور بے پروائی ہو۔ الحمدللہ! قلب دن کے اکثر اوقات اللہ جل شانہٗ کی طرف رکھتا ہوں۔ یعنی تکلف سے گزر رہا ہوں۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ جی چاہتا ہے کہ اللہ کی بس ہمہ وقت یاد رہے اور مجھے تکلف کی بھی تکلیف نہ ہو۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ بے تکلفی کی اس طلب میں کچھ میرا نفس مجھے دھوکا دے رہا ہے، تکلف میں مشقت سے گزرنا ہوتا ہے اور نفس مشقت کا چور ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟

رات کے درمیان اٹھتا ہوں اٹھتے ہوئے دعائے مسنون اللھم لک الحمد انت قیم السموٰت الخ سورہ آل عمران کا آخری رکوع اور معشرات سبعہ پڑھتا ہوں استنجا، وضو اور وضو سے فراغت کے بعد تہجد میں لگ جاتا ہوں تین پارے آٹھ رکعت میں کرتا ہوں آٹھ رکعت کے بعد تین وتر بقرأت مسنونہ پڑھتا ہوں۔ وتروں کے بعد طویل دعا مانگتا ہوں دعا سے فراغت کے بعد سلطان الاذکار میں لگ جاتا ہوں۔ جس قدر ہو جائے

میرے نصیب۔ پھر ایک سو بار کلمہ سوم۔ ایک سو بار استغفار۔ اور ایک سو بار درود کے بعد صبح و شام کے مسنون اذکار یعنی بسم اللہ الذی لا یضر الخ تین بار۔ اعوذ بکلمات اللہ تین بار۔ اعوذ باللہ السمیع الخ تین بار۔ سورہ حشر کی آخری آیات۔ سورہ روم کی آیات فسبحان اللہ۔ اخلاص اور معوذتین تین بار اور اصبحنا واصبح الملک الخ ایک بار رضیت باللہ الخ تین بار۔ اللھم عافنی فی بدنی الخ تین بار۔ اللھم انی اعوذ بک من الحقر الخ تین بار۔ سید الاستغفار ایک بار۔ حسبی اللہ لا الہ الا ھو الخ سات بار۔

سنت فجر کے بعد ذرا دائیں کروٹ لیٹتا ہوں اور پھر نماز روشنی میں باجماعت پڑھتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ طویل قرأت کے ساتھ منہ اندھیرے پڑھوں مگر ساتھیوں کا ساتھ ہے اس لئے مجبور ہوں۔ نماز کے بعد کلمہ چہارم سو بار۔ طلوع آفتاب پر دو رکعت نماز اشراق نماز کے بعد غسل اور کھانا۔ کھانے سے فراغت کے بعد کچھ دیر سلطان الاذکار پھر کچھ مطالعہ۔ دس بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک قیلولہ۔ ساڑھے گیارہ بجے کے بعد استنجا وغیرہ سے فارغ ہو کر جائے کا دور اور پھر تا نماز ظہر سلطان الاذکار۔ نماز ظہر ایک بجے کے بعد پڑھتا ہوں۔ نماز کے بعد کچھ لکھنا پڑھنا۔ ڈھائی بجے قرآن حکیم کی تلاوت اور اذکار عصر پونے چار بجے پڑھتا ہوں بعد نماز عصر کھانے سے فارغ ہو کر سو بار درود، سو بار استغفار، سو بار کلمہ سوم۔ اور صبح والے مسنون اذکار۔ بعد از نماز مغرب اوابین چھ رکعت میں نصف پارہ پڑھتا ہوں۔ اوابین سے فراغت ہوئی تو ایک ہزار اسم ذات کا معمول ہے۔ اسم ذات اب تک ایک لاکھ سے متجاوز ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ عشاء تک اخبار کا مطالعہ ہے۔ اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ ملتا ہے۔ اگرچہ میں انگریزی میں کچھ ادبی صلاحیت نہیں رکھتا مگر شدھ بدھ اتنی ضرور ہے کہ کچھ الفاظ، کچھ محفوظات اور کچھ دلالۃ الحال کی مدد سے بات کی تہ تک پہنچ جاتا ہوں۔ مقالہ افتتاحیہ ضرور پڑھتا ہوں۔ بیچارہ ایڈیٹر اپنی جدت طرازی کی وجہ سے گھونٹ گھونٹ پر علماء

کے منہ آتا ہے۔ خیر یہ بارن ہے مائیکروفون تو کسی اور کے قبضہ میں ہے۔

نمازِ عشاء کے بعد مسنون اذکار اور سورۃ ملک، سورۃ سجدہ اور سورۃ دخان کی تلاوت کے بعد سو جاتا ہوں۔ یہ ہے میرا روزمرہ کا معمول اور میرے سارے مشاغل کا پروگرام۔ مجھے علم نہیں کہ اس میں کہاں کہاں غلطی ہے اور کیونکر ہے۔ افسوس کہ کام کے لئے وقت ملا تو پورا نہیں۔ اللہ جل شانہٗ میرے حالِ زار پر رحم فرمائیں اور دعاؤں کے ساتھ اس کمی کے متعلق بھی اللہ جل شانہٗ سے دعا کرتا ہوں۔

حضرت! میں لکھ نہیں سکتا کہ گناہوں کی آلودگیوں کے کتنے داغ ہیں۔ جو میرے دامن پر لگے ہیں۔ اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ معاف فرمائے۔ شاید گناہوں کی ہی ظلمت ہے جو اب تک استقامت کی دولت سے محروم ہوں۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ

بنام مولانا محمد بشیر صاحب صدیقی محلہ کچی مسجد سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۷ر دسمبر ۱۹۵۳ء

جیل کی زندگی کا خاکہ، سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۳ دعوئی بلا دلیل کا نام ہے، اسلامی مملکت کا سیاسی مذاق، ۱۹۵۳ء کا خونیں ڈرامہ، میں مایوس نہیں ہوں، اللہ کی شانِ قدیری اور اس کی شانِ حکیمی کی توضیح اور ان میں باہمی فرق، ما بقوم اور ما بانفسھم کی تشریح، علماء کی فتح اسلام کی آمد کا مقدمہ اور مغرب کی شکست ہے، اسلامی قومیت کا فیصلہ وقت کا اہم تقاضا ہے۔

عزیزم سلمہٗ! السلام علیکم

اس وقت دن کے بارہ بجے ہیں۔ چائے سے فارغ ہوا ہوں۔ شاید تم پوچھو کہ یہ چائے کا کون سا وقت ہے۔ بات یہ ہے کہ لباس اور خوراک میں ایک حد تک آزاد ہوں۔ میرا فیشن یہ ہے کہ بیدار ہونے کے بعد چائے ملنی چاہیئے۔ یہاں کے پروگرام کے مطابق قیلولہ دس سے ساڑھے گیارہ بجے تک ہے۔ اس لئے چائے کا وقت بھی بارہ بجے مقرر ہوا۔ رات کو ایک اور دو کے درمیان پیتا ہوں۔ سو کے اٹھتا ہوں تو جب تک پیالی منہ کو نہیں لگتی کچھ کھویا سا رہتا ہوں۔ میں نے لب کی جگہ منہ اس لئے کہا ہے کہ چائے میں لب سوزی اور لب دوزی میرے نزدیک مکروہ ہے۔ چائے نوشی کے وقت لبوں سے پیدا شدہ آواز میرے مذاق کیلئے بہت ہی گراں اور میری طبیعت کے لئے سامانِ قبض ہے کیونکہ یہ چائے کے لب سوز اور لب دوز ہونے کی علامت ہے۔

اب سنو! میں مؤرخہ ۸ر اگست کو دوبارہ پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا ہوں۔ تم پوچھو گے کہ کیوں؟ اس کا مجھے پتہ نہیں۔ شاید گرفتار کنندگان کو بھی

اس کا پتہ نہ ہوا اور پتہ نہ ہونے کی وجہ صاف ہے۔ جب پولیس کی چیرہ دستیاں آخری حد کو پہنچ جاتی ہیں تو وہ اپنے ترکش سے کے شکار کے لئے وہ تیر استعمال کرتی ہے جیسے سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۳ کہا جاتا ہے۔ دعویٰ تو ہے مگر دلیل نہیں ہے۔ دلیل ہوتی تو کھلی عدالت میں پیش ہوتی۔ ہم بھی ذرا تو سنتے اور مخاطب سے آنکھیں چار کرتے۔ مگر عدالت میں بیچارے معاملہ لے جائیں تو کس برتے پر؟ کیا کہیں؟ یہ شخص محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا علی رؤس الاشہاد اعلان کرتا ہے یا یہ کہ مرزا علیہ ما علیہ کی جھوٹی اور خانہ ساز نبوت کی دھجیاں لوگوں کے سامنے اڑاتا ہے۔

بتایئے ان دونوں باتوں میں سے کون سی بات مملکت خداداد سے غداری کے مترادف ہے۔ ان کی روسیاہی کی یہ سب سے بڑی شہادت ہے کہ آج ایک مسلمان کھلے بندوں پبلک اسٹیج پر ایمان کی دعوت نہیں دے سکتا۔ خوش ہیں کہ ہم نے دبا دیا۔ اور ابلیس بغلیں بجا رہا ہے کہ جو کام وہ انگریز سے نہ کرا سکا وہ محمدؐ کے نام لیواؤں سے پورا ہو گیا۔

قاعدہ تو یہی ہے کہ جمہوری مملکت میں جب ایک بات رائے عامہ کے منہ سے نکلے تو اس کے نمائندے اس پر غور کریں اور اطمینان کے لئے استصواب کرالیں۔ مگر اس مملکت کا سیاسی مذاق ہی کچھ نرالا ہے۔ جہاں اور جب رائے عامہ کا رجحان کسی ایک جانب دیکھا تو فوراً غدار غدار پکارنا شروع کر دیا۔ گالیوں سے کام نہ چلا تو بے محابا لاٹھیاں آگئیں۔ لاٹھیوں سے بات نہ بنی تو انہوں کے سینوں کو انہوں نے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ جب میں سوچتا ہوں کہ آہ رسالت محمدیہ کے نام پر دولتوں کی بھیک مانگنے والوں نے محمدؐ کے نام لیواؤں پر گولیاں چلائیں۔ دلہنوں کا سہاگ لٹ گیا۔ بچے یتیم ہو گئے۔ تو میں کہہ نہیں سکتا کہ میرے قلب و جگر کا کیا حال ہوتا ہے۔

اللہ اکبر! زمانے کے انقلابات کس کس رنگ میں سامنے آتے ہیں۔ میں مایوس نہیں ہوں۔ اللہ جل شانہ کو اس بات پر پوری قدرت ہے کہ دلوں کی کایا پلٹ دے اور انشاء اللہ پلٹ ہی کر رہے گی۔ مگر مجھے میرا تاریخی، سیاسی اور اجتماعی مطالعہ اس وقت اس کے باور کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا اور اب بھی نہیں دیتا۔ اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے اور خدا کرے کہ ہو تو یہ اس کی شانِ قدیری کا ظہور ہوگا ورنہ شانِ حکیمی یہ نہیں ہے۔ شانِ حکیمی تو یہ ہے۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم

ما بقوم نظام فرماں روائی ہے اور ما بانفسہم کردار و گفتار ہے۔ فرمائیے کہ جو میزان اب تک رقموں کے غلط ہونے کی وجہ سے غلط تھی اب وہ خود بخود کیسے درست ہو جائیگی اور شانِ قدیری یہ ہے کہ رقمیں پوری نہ ہوں مگر میزان صحیح آجائے۔ ایسا بھی ہوتا ہے بدر میں ایسا ہی ہوا تھا۔ رقم فی الواقع پوری نہ تھی۔ باہر سے وقتی طور پر مزید رقم کا اضافہ کر کے میزان پوری کر دکھائی تھی۔

لقد نصرکم اللہ ببدر وانتم اذلۃ

جو کام عادۃ اللہ کے ماتحت ہو۔ میری اصطلاح میں وہ شانِ حکیمی ہے اور جو اسباب و علل سے بالا ہو کر رونما ہو وہ شانِ قدیری ہے — عام عادت تو شانِ حکیمی کی ہے۔ شانِ قدیری کا ظہور تو صرف اس وقت ہوتا ہے جب دامانِ اعمال رضائے الٰہی کی خاطر چاک در چاک ہو — خیر یہ تو ماضی ہے۔ اب حال میں بعض تاثرات کی شعوری اور غیر شعوری طور پر اوپر سے نیچے تک پرورش ہو رہی ہے وہ بہت ہی عجیب ہیں اور ان کے نتائج ان سے بھی عجیب تر۔ معلوم ہے کہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ ہی جو کل تک اسلام خطرے میں ہے کا بگل بجا رہے تھے۔ پاکستان سے پوری قوت کے ساتھ اسلام کو ختم کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں اور بالارادہ ان

جراثیم کی پشت پناہی کر رہے ہیں جو اسلام ہی کی بیخ کنی کیلئے منصۂ وجود پر آئے۔ تحریک ختم نبوت کی ناکامی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ وزارت خارجہ کی گدی پر کون براجمان ہوتا ہے یا مرزائی کی ملک میں پوزیشن کیا ہے، سوال یہ ہے کہ علماء کے منہ سے نکلی ہوئی بات مان لی گئی تو علماء کی فتح ہے اور ان کی فتح اسلام کی آمد کا مقدمہ ہے اور یہ مغربی تہذیب کی شکست ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان پر اس تحریک کے سلسلے میں ناپاک الزام لگائے گئے ہیں۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ مرزائیت کے خلاف علماء کا موقف آج کا نہیں بلکہ پاکستان بننے سے پہلے کا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ مرزائیت انگریز کی سیاسی مصلحتوں کا خود کاشتہ پودا ہے۔

یقین کرو کوئی بات طے نہیں ہو سکتی جب تک خالص دستوری زبان میں اسلامی قومیت کا فیصلہ نہ ہوگا۔ اسی فیصلہ ہی پر مرزائیت کی نقاب کشائی ہو گی۔ خود ارباب بست وکشاد کو اپنی موجودہ پالیسی پر از سر نو غور کرنا ہوگا اور بس —— اچھا ختم کرتا ہوں

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ

بشکریہ مولانا حامد الرحمن صاحب کاندھلوی زراعتی کالج ٹنڈو جام ضلع حیدر آباد

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۰ر دسمبر ۱۹۵۳ء

وساوس کا آنا مذموم نہیں لانا مذموم ہے، وساوس دور کرنے کی پانچ تدبیریں، اصلاحِ نفس کے دو طریقے طریقِ نبوت اور طریقِ ولائیت اور دونوں میں فرق، ایک مثال کے ذریعے اس کی تشریح، حواس اور مشاعر کی طرح لطائف بھی پانچ ہیں، صوفیاء کی زبان میں ان کی پیداواری کا نام نسبت ہے۔

عزیزی! وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ السلام علیکم

تم ہجوم وساوس کے ستائی ہو۔ ان کا آنا مذموم نہیں لانا مذموم ہے۔ اگر آنے پر بھی پریشان ہو اور ان کو دور کرنے کی فکر میں ہو تو ان کو دور کرنے کی چند تدبیریں جو اس وقت ذہن میں ہیں، لکھتا ہوں۔ کسی ایک پر عمل کرلو اور پھر بتاؤ۔

اول:۔ آیات سکینہ کی تلاوت کرلیا کرو۔ قرآن میں آیات سکینہ چھ ہیں۔

دوم:۔ کوشش کرو کہ دل کسی لمحہ بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو اور غافل نہ رکھنے کی تدبیر یہ ہے کہ زبان ہر دم کسی نہ کسی ذکر میں مشغول رہے۔

لا یزال لسانک رطبًا من ذکر اللہ

سوم:۔ نمازِ فجر کے فرضوں اور سنتوں کے درمیان چالیس بار یا حیّ یا قیّوم لا الٰہ الا انت برحمتک استغیث پڑھ لیا کرو۔

چہارم:۔ تنہائی کا تھوڑا سا وقت نکال کر سبحان اللہ صرف ایک سو بار، اس طرح کہ سبحان کی یاء سے دل پر ضرب لگاؤ اور حائے کا اظہار ذرا دراز ہو۔ سانس جلالہٗ کی ہائے ہوز پر ختم ہو۔

پنجم:۔ اگر وقت ملے تو صبح کی اذان سے پہلے خلوت میں بیٹھ کر دل کی طرف

متوجہ ہو اور کوزۂ ذہن میں ایک رشتۂ نور دل میں یقین بھرو پھر ستر بار یاھادی کہو۔ امید ہے ان تدبیروں میں سے جو بھی کرو گے انشاء اللہ کامیابی ہو گی۔

مگر عزیز من! ایک بات سنو۔ وساوس ہوں یا ہواجس، خواطر ہوں یا حوادث ان کو ختم کرنا درجۂ مقصودیت میں داخل نہیں ہے۔ مقصود تو صرف اللہ کی یاد ہے یہ دیکھو وہ ہو رہی ہے کہ نہیں۔

اصلاحِ نفس کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریق نبوت، دوم طریقِ تصوف۔ طریق تصوف میں میلانات، تقاضوں اور خواہشوں کا ازالہ کیا جاتا ہے مگر طریقِ نبوت میں ازالہ نہیں بلکہ امالہ ہوتا ہے۔ یعنی طریقِ نبوت میں نفس کے تقاضوں کا رُخ بدلا جاتا ہے اور طریقِ تصوف میں انہی تقاضوں کی بیخ کنی کی جاتی ہے۔ اسے ذرا ایک مثال سے سمجھو۔

نالہ ایک آبادی کے ساتھ ہے اور ہر روز بربادی کا سامان بنا رہتا ہے۔ اس کی بربادی کو روکنے کی ایک تدبیر تو یہ ہے کہ مکان مضبوط کر لئے جائیں۔ سیمنٹ کے پلاستر ہو جائیں۔ اور مکانوں کی کرسیاں اونچی کر دی جائیں۔ نالے کو اپنی جگہ چلنے دیا جائے ــــ اور ایک تدبیر یہ ہے کہ جہاں سے نالہ نکلا ہے اُسے جا کر توڑ دیا جائے اور تباہ کر دیا جائے۔

نفس میں غضبی اور شہوی قوتیں ہیں۔ یہ دو قوتیں ہی اخلاق اور صفات نباتی ہیں۔ یہ ہر جاندار میں ہوتی ہیں۔ قوت شہوی منافع اور مصالح کی تلاش میں رہتی ہے اور قوتِ غضبی مضار اور مفاسد کا ڈیفنس کرتی ہے ما یحتاج کی تلاش میں قوتِ شہوی نکلتی ہے، تو حرص کا میدان نمایاں ہوتا ہے اور دفع مفاسد کے لئے قوتِ غضب میدان میں آتی ہے تو قوت اور عزت ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کی ناکامی

سے حقد اور قوت شہوت کی ناکامی سے حسد ظاہر ہوتا ہے۔ قوتِ شہوی میں جوش ہوتا ہے تو بخل اور غضبی کے جوش میں عدوان یعنی ظلم وکبر اور فخر کا ظہور ہوتا ہے۔

نالے سے میرا مقصود یہی دو قوتیں ہیں جو قلب کی آبادی کی طرف سیلابی صورت میں آکر پوری آبادی کو تباہ کرتا ہے۔ صوفیا آئے اور آبادی کی بربادی کا یہ تماشا دیکھا تو بول پڑے کہ ان دو قوتوں کو جڑ سے ختم کردینا چاہئیے۔ اس کیلئے انہوں نے ریاضات شاقہ اور تعذیب جسم کی صورتیں پیدا کیں۔ لیکن یہ حکیم مطلق کی تخلیقی حکمت سے مقابلہ تھا۔ ناکامی ہوئی اور ناکامی ہورہی ہے ـــ انبیاء آئے اور انہوں نے لوگوں کو بتلایا کہ مکانوں کی بنیادیں مضبوط کی جائیں۔ پلاستر کیے جائیں اور کرسی اونچی رکھی جائے۔ نالے کو بہنے دیا جائے۔ کسی نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ آفاتِ نفس اور وساوس راہ سلوک کے مسافر کیلئے راستے کے بچھو اور سانپ ہیں۔ جو راستہ میں ان کو مارنے میں لگ جائے گا وہ سفر سے رہ جائے گا۔ کام چلتے رہنا ہے۔ ان کی طرف آنکھ بھیر کر دیکھنا بھی نہیں چاہئیے۔ شاید عارف رومی نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

اندریں راہ مے تراش و مے خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

نفس اور اس کی قوتیں بیکار نہیں ہیں۔ یہی نالے کا پانی ہے۔ اس سے جہاں جھاڑ کانٹے پیدا ہوتے ہیں وہیں بہترین کھانے کی خوش ذائقہ سبزیاں بھی نشوونما پاتی ہیں۔ اس کا رُخ بدل دیجئے۔ استیصال نہ کیجئے۔ اکڑ کر چلنا معیوب ہے اور شریعت نے منع کیا ہے مگر میدانِ جنگ میں اللہ جل شانہٗ کو ابودجانہ کی یہی رفتار پسند آئی۔ کیونکہ رخ بدل گیا ـــ اب ختم کرتا ہوں۔

مگراشارۃً ایک بات اور کہے دیتا ہوں — جس طرح حواس خمسہ ہیں ایسے ہی مشاعر بھی خمسہ ہیں۔ یہ تو ہیں اطباء اور حکماء کے زیرِ بحث۔ ان کے ساتھ لطائف بھی خمسہ ہیں۔ یہ ہیں اصلاحِ نفس میں عرفاء کا موضوع۔

حواس خمسہ یہ ہیں:۔ باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ

مشاعر خمسہ یہ ہیں:۔ حسِّ مشترک، متصرفہ، تخیل، وہم، حفظ

لطائف خمسہ یہ ہیں:۔ عقل، قلب، روح، سر، نفس

لطائف کی بیداری کا نام ہے نسبت۔ یہی مقصودِ تصوّف ہے اور یہی منزلِ احسان ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہا

بنام مولوی محمد اسحاق شہابی ٹیچر گورنمنٹ نارمل اسکول پسرور ضلع سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ
۱۵ ر دسمبر ۱۹۵۳ء

انسان ایک عالمِ صغیر ہے، روح کی تکوین، روح سے اخلاق کا تعلق نفس قلب اور عقل کی تشریح، سِر اور روح کی حقیقت، انسان کا امتیازی مقام ان لطائف خمسہ سے وابستہ ہے۔ حواس اور مشاعر کی طرح لطائف پنجگانہ بھی اگر کام نہ کریں تو انسان حیوانیت سے بھی گر جاتا ہے۔

محبی فی اللہ : السلام علیکم

آج آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ تقریب یہ ہے کہ تفہیمات دیکھتے دیکھتے ذہن آپ کی طرف منتقل ہو گیا۔

انسان صرف ہاتھ، پاؤں، ناک، آنکھ اور منہ کے مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے طبقات ہیں اور یہ عالم صغیر اپنے ہر طبقے کے لئے ایک مستقل وجود اور مستقل مدت رکھتا ہے۔ ظاہری طبقہ تو اس کا یہی قالب ہے۔ کھانے پینے کے تقاضے اس میں موجود ہیں۔ ہاضمہ اور غاذیہ قوتیں بھی ہیں۔ کیلوس اور کیموس بھی اسی میں ہیں۔ غذا تین حصوں میں تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ منی، خون، روح ــــ منی مجامعت کے ذریعے رحم عورت میں منتقل ہو کر خون کی آمیزش سے بدن انسان بناتی ہے۔ یہ ہے ظاہری طبقہ ــــ اور اسے عالم صغیر کا طبقہ سافلہ بھی کہتے ہیں۔ یہی فن طب و تشریح کا موضوع ہے۔ اس کے بعد ایک دوسرا طبقہ ہے جسے طبقہ روح کہتے ہیں۔ اس کی تکوین اس طرح ہوتی ہے کہ اخلاط سے پیدا شدہ بخارات لطیفہ دل کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں حرارت دل کی آمیزش سے ایک پاک و صاف معتدل جوہر بنتا ہے۔ یہی روح ہے

جو نفس ناطقہ کی ذولد ہے۔ انسان دراصل اسی جوہر لطیف کا نام ہے اور بدن اسی کا گھرانہ ہے۔ اخلاق اور ظاہری و باطنی احساسات کا تعلق بھی اسی سے ہے۔ یہ جوہر لطیف تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

ایک حصہ — مکان کی دیکھ بھال اور نگرانی کا فرض انجام دیتا ہے اور مکان کے افادی تعلقات کی غور و پرداخت کرتا ہے۔ صوفیاء کی زبان میں اس کا نام نفس ہے یہی وہ مقام ہے جہاں برائیوں کو مختلف طریقوں سے بدن کی عملت میں داخل ہونے کا موقع ملتا ہے۔

دوسرا حصہ — وہ ہے جو نفس ناطقہ کے تابع فرمان رہتا ہے اور قوائے عملیہ میں سکنیت، لطافت اور عبادت کے لئے لگن پیدا کرتا ہے صوفیاء کی زبان میں اسے قلب کہتے ہیں۔

تیسرا حصہ — وہ ہے جو نفس ناطقہ کے احکام کے ظہور کیلئے جولانگاہ کا کام دیتا ہے اسے عقل کہتے ہیں۔ ان تین لطائف کو علماء نفسیات اور فلاسفہ مانتے ہیں۔

خالص دلیل کی زبان سے اگر سننا چاہتے ہو اور ان تینوں کا مشاہدہ چاہتے ہو تو سو آدمیوں کو ایک جگہ جمع کر لو اور ان کے سامنے شاندار کھانے چن دو۔ کھانا چن دینے کے بعد کھڑے ہو کر سب کو مخاطب کرو کہ اس شخص سے زیادہ بیوقوف کون ہو گا جو پیٹ بھر کھانا کھاتا ہے۔ اس طرح کھانے کو صرف بہائم کھا سکتے ہیں۔ خوب کھانے کی برائی بتاؤ۔

اس کے بعد مجمع کو دیکھو کہ اس میں کس کس انداز طبیعت کے لوگ ہیں کچھ مقرر کی تقریر پوری طرح سمجھنے کے باوجود مقرر کو غضبناک نگاہوں سے دیکھیں گے۔ اندر اندر سے ان کو سوسائٹی میں تذلیل کا اندیشہ بھی ہو گا مگر کھانے پر مکھی

کی طرح گریں گے۔ گویا تمثیل کے رنگ میں اگر یوں کہہ دیا جائے کہ ترازو کے ایک پلڑے میں ذلت و رسوائی ہو اور دوسرے میں لذت کام و دہن ہو تو اس کی افتادِ طبع لذت ہو گی۔ اس پر نفس کا غلبہ ہے اور فلاسفہ کی زبان میں یہ مغلوب شہوتِ نفسی ہے ۔۔۔۔۔ کچھ مقرر کی تقریر سے غضب آلود ہوں گے چہرے سرخ ہو جائیں گے رگیں پھول جائیں گی اور یہ کہہ کر اٹھ جائیں گے کہ میں اس قسم کے کمین لوگوں میں بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ ہزار معذرت کیجئے مانیں گے نہیں۔ صوفیاء کی زبان میں یہ مغلوب قلب ہے اور فلاسفہ کے نزدیک یہ نفس سبعی کا شکار ہے۔ کچھ ایسے ہوں گے جو مقرر کے سامنے یوں پڑ رہے گے کہ کھانے کے خراب ہونے کی وجہ بتاؤ۔ اگر تم عقلاً کھانے میں برائی بتا دو گے تو میں نہ کھاؤں گا ورنہ تم بکواس کر رہے ہو اور غلط کہتے ہو۔ فلاسفہ اور صوفیاء کے نزدیک یہ مغلوب عقل ہے۔

اس عملی مثال میں تینوں لطائف موجود ہیں۔

اب ذرا ایک قدم اور آگے بڑھو۔ عقل اور قلب میں بھی دو درجے ہیں عقل ایک درجے میں عالم قدس کی طرف متوجہ رہتی ہے۔ اور ایک درجے میں ماوراء محسوسات سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ عقل کے درجہ اولیٰ کا نام سر ہے۔ دل کے بھی دو درجے ہیں۔ ایک درجہ میں وہ روحانیت اور سکوت و سکون چاہتا ہے اور ایک درجہ میں کود پھلانگ کا خواہاں ہوتا ہے۔ دل کے پہلے درجے کا نام روح ہے یہ ہیں لطائف خمسہ۔

انسان فی الواقع دوسرے حیوانات سے انہی لطائف کی خاطر امتیازی مقام رکھتا ہے اور احسن تقویم بنا ہے۔ ان لطائف میں جوں جوں بیداری ہوتی جاتی ہے تو راستے میں اور لطائف بھی رونما ہو جاتے ہیں۔

کوشش کیجئے کہ یہ لطائف بھی مشاعر اور حواس کی طرح اپنا اپنا کام کریں

تاکہ احسن تقویم کا مقام حاصل ہو۔ ورنہ یقین مانیئے کہ حیوانیت اور شجریت سے زیادہ پستی رونما ہو جائے گی۔ بیشک جسمانی قوت درختوں، پہاڑوں، اور حیوانوں کی طرح بڑھے گی مگر دامانِ حرص وسیع ہو کر کتوں سے زیادہ حریص ہو جائیں گے۔ یعنی صحیح معنے میں ثم رددناہ اسفل سافلین کی تصویر ہوگی۔

شاید حضرت علیؓ کی طرف اخلاق کی کتابوں میں جو یہ مقولہ منسوب ہے کہ ــــ انسان رب کا فرماں بردار ہو تو ملائکہ سے افضل ہے اور نافرمان ہو تو کتے سے بدتر ہے ــــ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ لطائف بیدار نہ ہوں تو اسفل سافلین میں پہنچ جاتا ہے۔ انبیاء کی آمد کا مقصود بھی یہی ہے جیسا کہ قرآن میں وحی کے استشہاد سے ثابت ہو رہا ہے۔

یہ شائد آپ پوچھیں اور اس کے لئے بے چین ہوں کہ لطائف کیسے بیدار ہوتے ہیں؟ سوال میں ذرا گہرائی ہے۔ مختصر جواب سے تسلی نہ ہوگی۔ طویل جواب کیلئے خط کا محدود معیار اجازت نہیں دیتا۔ کوشش کروں گا کہ دوسرے خط میں سمجھاؤں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بنام مولانا فضل حق صاحب بی۔اے۔ خطیب مسجد راجہ بازار سیالکوٹ۔

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۸ر دسمبر ۱۹۵۳ء

توحید بطور مقام حاصل کرنے کا نسخہ اور اس کی ترکیب استعمال

حبی فی اللہ ! السلام علیکم

اگر پانی کو ہوا بنانا ہو تو تدبیر یہی ہے تاکہ گرمی کے زور سے اس کی ٹھنڈک کو گرمی میں تبدریج بدلو یا کچھ اور گرمی کی ایک ضروری مقدار مہیا ہونے پر اللہ جل شانہٗ کے حکم سے پانی بھاپ بن جائے گا۔ بس مسئلہ سمجھ میں آگیا۔ اگر چاہتے ہو کہ توحید بطور مقام ہاتھ آئے اور یہ چاہت بھی سچی ہو۔ توقع، آرزو اور ولولے کے درجہ کی نہ ہو تو بس نفس کے دامنوں سے جو آلودگیاں چمٹی ہوئی ہیں۔ اور جن جن سے جی ٹھنڈا ہوتا ہے ان کو اللہ جل شانہٗ کی محبت، طاعت، خشیت، موالات، سوال، توکل، لجاء، رضاء، تفویض اور تحاکم و رغبت کی گرمی سے ختم کر لو۔ تم پوچھو گے کہ یہ گرمی کیسے پیدا ہو۔ تین کام کرو۔

الف :۔ نفی و اثبات پر بہنات کے ساتھ مداومت کرو۔

ب :۔ جی کو یادِ الٰہی سے غافل نہ رہنے دو۔

ج :۔ زبان کو گناہ کی آلودگیوں سے بچا لو۔

لو چھٹی ہوئی کام ہو گیا ـــــ

اللھم اجعلنا منھم برحمتک - اللھم یسّر علینا - اللھم اجعلنا من الذین یذکرونک دائماً - اللھم جرد انفسنا عن التعلقات کلھا - اللھم وفّقنا لما تحب وترضی

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بنام : جناب عبدالغفور صاحب بٹ محلہ کالج روڈ شہر سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۳ر دسمبر ۱۹۵۳ء

سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۳ میں انصاف کے نام پر بے انصافی اور عدل کے نام پر ظلم ہوتا ہے، خلوت کی لذتیں اور پرکیف لطف اندوزیاں، اللہ کی یاد وہ نعمت ہے کہ اس سے آگے کسی نعمت کا تصور بھی نہیں، خواب میں بشارت، جرم کا کھلے بندوں اقرار، معافی پر موت کو ترجیح، قوم کے لئے مرنا فخر، بچنا لعنت ہے۔

تلمیذی العزیز! السلام علیکم

یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ مؤرخہ ۸ر اگست ۵۳ء کو حکومت کا عتاب برق و رعد بن کر میرے خرمن آزادی پر پڑا اور میں اس غیر جمہوری قانون کی دفعہ ۳ کے ماتحت جسے پبلک سیفٹی ایکٹ کہتے ہیں جیل میں پہنچا دیا گیا۔ اس قانون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انصاف کے نام پر بے انصافی اور عدل کے نام پر ظلم اس کے آسرے پرورش پاتا ہے اور انتظامیہ کو عدلیہ سے بے نیاز ہو کر من مانی کارروائیاں کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ مجرم کو جرم کا علم نہیں ہوتا اور نہ ہی ارادۃً بتہ ہی دیا جاتا ہے۔ میں خود سوچتا ہوں کہ خلوت کی یہ سعادت جو مجھے باہر کسی قیمت پر بھی نہیں ملتی تھی۔ بارہا اس کے لئے آرزوؤں کا خون ہوا۔ بلکہ عرصہ اسی تگ و دو میں جگر خوں ہوا۔ یکایک کیسے نصیب ہوئی؟۔ اس کی لذتوں اور پرکیف لطف اندوزیوں کی کیا پوچھتے ہو۔ زبان میں اس کے لئے یارائے سخن نہیں اور قلم میں اس کی تاب نہیں۔ سچ کہہ دوں۔ کیفیات ہیں، جذبات ہیں، میرے پاس تعبیر کے لئے الفاظ نہیں۔ بیداری اور خواب دونوں یہاں یکساں ہیں۔ جاگتے ہوئے تو جاگتا ہی ہوں مگر سوتے ہوئے بھی الحمد للہ بیدار رہتا ہوں۔ یہ وہ جنت

ہے کہ اس پر دنیا کی کروڑ ہا اور بے بہا لذتیں قربان ہیں۔ اللہ جل شانہٗ کی بڑی ہی عنایات ہیں۔ مختصر سے مختصر الفاظ ہیں۔ یہ کہ بس اللہ کی یاد کی توفیق ملی ہوئی ہے اور یہ وہ نعمت ہے کہ اس سے آگے کسی نعمت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ تصور ہو بھی کیسے؟ انسان کی انسان ہوتے ہوئے اس کے آگے پرواز نہیں ہے ؎

ذالك موهب الرحمن ليست

تحصل باجتهاد اوبكسب

شاید مسند احمد کی حدیث ہے حضرت ابو الدرداءؓ کے حوالے سے مدارج میں لکھی ہے۔

الا انبئكم بخير اعمالكم وازكاها عند مليككم وارفعها فی درجاتكم وخير لكم من اعطاء الذهب والفضة وان تلقوا عدوكم فتضربوا اعناقهم ويضربوا اعناقكم قالوا وما ذاك يا رسول الله قال ذكر الله عز وجل

میں کہہ نہیں سکتا کہ ساعات کیسی لطیف ہیں لم یذق من لم یذق والی بات ہے۔ ارباب اقتدار تو اسے تعزیر، عقوبت اور تعذیب سمجھے ہوئے ہیں ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی

جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

اگر ان کو میری لذت گیریوں کا پتہ چل جائے اور خدا نہ کرے کہ پتہ ہو تو یقیناً اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کے لئے مجبور ہو جائیں۔ انہوں نے پتہ نہیں کس جرم کی پاداش میں میرے لئے یہ مقام تجویز کیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں

اس کے سوا کچھ نہیں کہ ختم نبوت کی حمایت پر میرے منہ سے نکلے ہوئے چند بول یہ رنگ لائے ہیں۔ ذوالنون مصری نے کیا خوب کہا ہے ؎

لا انساک فی اکثر ذکراک

ولکن بذکراک یجری لسانی

اسے کچھ حسن اتفاق کہئے کہ آنے سے دو روز پہلے خواب میں ایک شخص نے بتایا کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں — میں سمجھ گیا کہ حالات خوش آیند ہیں — اب بھی جذبات میں وہی گرمی ہے۔ احساسات وہی ہیں۔ صاف صاف اور بلا خوف لومۃ لائم کہتا ہوں کہ اگر ارباب اقتدار کی نظر میں میرا جرم یہی ہے تو مجھے اس جرم کا کھلے بندوں اقرار ہے۔ یہ اقرار میرے ایمان کا جزو لاینفک اور میری اخروی نجات کی اساس ہے۔ یہ نظریہ نہیں جو بدل جائے۔ یہ عقیدہ ہے اور عقیدہ بھی وہ جس کی عمارت قرآن وسنت کے صاف اور صریح محکمات پر اٹھی ہے۔ تیرہ سو سال سے ہواؤں کے نہ معلوم کتنے طوفان اسے ختم کرنے کے لئے اٹھے ہیں اور نہ معلوم کتنے اٹھیں گے مگر آج تک اپنی جگہ سے نہ ہلا ہے نہ ہلے گا انشاءاللہ — اور اگر میرا جرم ارباب اقتدار کی نظر میں اس کے سوا کچھ اور ہے تو اولاً اس کی تعیین مطلوب ہے اور تعیین میں اگر یہ جرم ملت سے غداری یا ملک سے بے وفائی ظاہر ہو تو پھر حکومت کا فرض ہے کہ مجرم کو قانون کے مطابق جرم کی پوری پوری سزا دے — ختم نبوت پر منہ سے نکلے ہوئے بول اگر جرم ہیں تو معافی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں اور اس جرم کا میں خود اقراری ہوں۔

غداری کا الزام اگر ان کے علم میں پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو وہ خوشی سے سزا دیں اور زیادہ سے زیادہ دیں۔ میں اپنے علم میں مجرم نہیں ہوں۔ مجھے اپنے

اس جرم کا اقرار نہ ہو تو میری زبان پر معذرت کے لفظ کی غلط کروٹ بھی نہیں آسکتی ۔۔۔ الحمدللہ کہ میرا دامن غداری کے ناپاک دھبوں سے آج تک آلودہ نہیں اور خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ میں قوم کے لئے مرنا جانتا ہوں مگر بکنا نہیں جانتا۔ اس اخلاقی سطح کے آدمی دنیا میں سوسائٹی کے بدترین افراد ہوتے ہیں۔ بھلا جس شخص کے عقیدے میں ایک مسلمان کی بدخواہی ناجائز ہو۔ اسے پورے سات کروڑ کا بدخواہ بتانا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ اللہ معاف کرے۔ وقت بہت گذر چکا ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

پینٹر، مستری محمد نذیر محلہ صوفی پورہ سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۷ر دسمبر ۱۹۵۳ء

حکیم الامت شاہ ولی اللہ کی ذات صرف علمی نہیں بلکہ استدلالی شخصیت ہے۔ شاہ صاحب کے سینہ تجدید سے اُبلی ہوئی ہدایت علم الٰہی اور ربانی ہے۔ فکر و عمل کی دو قوتیں، افراط و تفریط، راہِ اعتدال، ایمان اور اس کے عناصر، توحید، توحید کے دامن پر دو دھبے، توحید کے مدارج، انسانیت کی تکمیل توحید پر موقوف، تسبیح و تحمید توحید میں معرفت کے پیمانے ہیں، توحید انسانی فطرت کا خمیر ہے۔

تلمیذی العزیز! وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ۔ السلام علیکم

اسلام سمجھنے میں مجھے جس قدر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے فائدہ ہُوا۔ زبانِ قلم میں اسے بیان کرنے کی تاب نہیں ہے۔ بلاریب اگر اسلام شناسی کی راہ نوردی میں یہ علمی شخصیت میری راہنما نہ ہوتی تو میں کہہ نہیں سکتا کہ میں کہاں ہوتا۔ حجۃ اللہ البالغہ، البدور البازغہ، الخیر الکثیر اور التفہیمات الالٰہیہ میرے شبانہ روز مطالعہ کا مرکز رہے ہیں یحب لاخیہ ما یحب لنفسہٖ کے دباؤ نے مجھے مجبور کر دیا کہ شاہ صاحب کو جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ میں پڑھ سکا ہوں۔ آپ کے سامنے بھی اس کی سوغات پیش کروں

دراصل شاہ صاحب کی گرامی قدر علمی شخصیت صرف پڑھنے کی نہیں بلکہ اعتبار و استدلال کی ہے۔ کیونکہ شاہ صاحب کے علوم خود شاہ صاحب کے لفظوں میں "علم الٰہی اور ربانی" ہیں۔

اسلامی زندگی آج جس افراط و تفریط کا شکار ہے اور جسے دیکھ دیکھ کر

ہر درد مند اندر اندر کڑھ رہا ہے۔ اسے دور کرنے اور اسلام کے جادۂ اعتدال پر لانے کا میرے خیال میں ایک طریق یہ ہے کہ حکیم الامت کے علوم کو زیادہ سے زیادہ شاہراہ عام پر لایا جائے۔

اسی یقین سے دب کر میں نے ارادہ کیا ہے کہ شاہ صاحب کے علوم میں سے مختلف عناوین کا انتخاب کروں۔ اس راہ میں میری نظر انتخاب سب سے پہلے توحید پر پڑی ہے۔ بیگانے تو بیگانے خود یگانے بھی توحید کے اس تصور سے خالی الذہن ہیں جس کی دعوت انبیائؑ لے کر آئے تھے۔

حق جلّ مجدہٗ نے انسان کو فکر و عمل کی دو قوتیں دی ہیں۔ اول الذکر کو عاقلہ اور آخر کو عاملہ کہتے ہیں۔ قوت عاملہ کی ساری سرگرمیاں کھانے کیلئے غذا، رہنے کیلئے مکان، پہننے کیلئے کپڑا، سکون کے لئے رفیقہ اور اپنے ہم چشموں میں برتری کے مقام کی تلاش میں لگی رہتی ہے۔ قوت عاقلہ محاورات، تخیلات، احساسات اور علمی ادراکات کی تگ و دو کرتی رہتی ہے (التفہیمات الالٰہیہ ص ۳۴ ج ۱)

جیسے عمل کے میدان کی وسعتیں زندگی کے ہر گوشے میں ناپیدا کنار ہیں ٹھیک اسی طرح فکر کی پہنائیوں کی بھی آخری سرحد کوئی نہیں ہے۔ عمل کی وسعتیں ہوں یا فکر کی پہنائیاں، دونوں افراط و تفریط کا شکار رہتی ہیں (التفہیمات ص ۳۴ ج ۱)

انبیاءؑ کی آمد کا مقصد وحید یہ ہے کہ انسان کو فکر و عمل کے میدان میں افراط و تفریط سے بچا کر اعتدال پر رکھا جائے۔ اسی جادۂ اعتدال کا نام دورہ ایمان ہے۔ اس کی سب نبی دعوت لے کر آئے اور اسی کی خاطر قرآن اترا ہے (التفہیمات ص ۵۳ ج ۲)

جو ایمان آخرت میں مفید اور انسانی زندگی کے لئے حیانت اور بچاؤ کا کام

دیتا ہے وہ ہے کہ جس کی عمارت توحید، محبت، فنا، توکل، عبادت، ذکر اور یقین کی بنیادوں پر قائم ہو۔ (التفہیمات صفحہ ۱۶۰ ج ۲)

توحید یہ ہے کہ دامانِ مومن شرک کی ساری آلودگیوں سے محفوظ ہو۔ محبت یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی ناراضگی کے مقابلے میں ذاتی میلان اس کی نگاہ میں ہیچ ہو۔ فنا یہ ہے کہ کبائر سے اجتناب اور صغائر پر اصرار سے بچا رہے۔ توکل یہ ہے کہ شگون، چھوت چھات، بھوت پریت، دیوی سب سے الگ تھلگ رہ کر اللہ جل شانہٗ پر بھروسہ رکھے۔ عبادت یہ ہے کہ فرائض کی پابندی کرے۔ ذکر یہ ہے کہ اوقات مختلفہ میں جو دعوات و اذکار شارع علیہ السلام سے ثابت ہوں، ان کو ادا کرے۔ (التفہیمات صفحہ ۱۶۰ ج ۲)

توحید تمام نیکیوں کی اصل اور اساس ہے کیونکہ انسان کے لئے خدائے ذوالجلال تک رسائی کی صرف یہی راہ ہے اور اسی کے ذریعے انسان پر عالم غیب منکشف ہوتا ہے، یہی انسان میں عالم قدس سے ملنے کی قابلیت پیدا کرتی ہے۔ توحید کی عظمت اور تمام نیکیوں کے لئے بس کی گنجائش ہونے کا اندازہ اس پیغام سے ہوتا ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ جل شانہٗ کی جانب سے بندوں تک پہنچایا ہے۔

من لقيني بقراب الارض خطيئة لا يشرك بالله شيئا لقيته بمثلها مغفرة (حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۵۹ ج ۱)

توحید کے متعلق غلطیوں، گمراہیوں اور خامیوں کا سرچشمہ صرف دو باتیں ہیں۔ ذات، صفات، عبادت میں ساری شورشوں کے برگ و باران سے نکلے ہیں۔

الف۔ خالق میں مخلوق کی صفات ماننا۔

ب ۔ مخلوق میں خالق کی صفات دیکھنا

پہلی راہ سرتاسر تشبیہ اور دوسری سرتاسر اشراک کی راہ ہے (حجۃ اللہ البالغہ ۱۹ ص ۵۴)
اگرچہ توحید سے گریز یا نظریات کی کڑیاں بے شمار ہو سکتی ہیں اور ہیں لیکن بنیادی نقطے ہمیشہ دو ہی رہے ہیں ۔

تشبیہ ۔ یعنی اللہ جل شانہٗ کے لئے ایسی صفات تجویز کرلی جائیں جو مخلوقات کی صفات سے مشابہ ہوں ۔

اشراک ۔ یعنی مخلوق کے لئے وہ صفات تجویز کی جائیں جو خالق کی صفات سے مشابہ ہوں ۔

توحید کی اگر تمام ارتقائی کڑیوں کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو اس میں صرف چار مدارج نمایاں ہونگے

الف ۔ توحیدِ وجودی ۔

ب ۔ توحیدِ خالقیت ۔ قرآن اور دوسری کتب الٰہیہ میں توحید کے یہ دونوں ابتدائی مراتب بحث و نظر کا موضوع نہیں ہیں کیونکہ قرآن کی تصریحات کے مطابق یہ دونوں مدارج اللہ جل شانہٗ کے وجود اور خالقیت میں یگانگت قرآن کے مخالفوں کے مسلمات میں سے ہیں ۔

ج ۔ توحید تدبیر و تصرّف

د ۔ توحید عبادت ۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ان میں باہم ایک طبعی ربط قائم ہے ۔

عرب کے اشراکی تصور نے خدا کے مقبول بندوں میں اولًا تدبیر و تصرف کی بالاستقلال طاقتیں تجویز کیں اور جب توحیدی تصور کے قیام سے وہ استقلال قائم نہ رہ سکا تو توسّل اور توسّط کا درجہ انہوں نے پیدا کیا ۔

یعنی اگرچہ خود خدا نہیں ہیں لیکن خدا تک پہنچنے کے لئے ان کی عبادت ضروری ہے ایک پرستار کی پرستش اگرچہ ہوگی خدا کیلئے مگر ہوگی ان ہی کے آستانوں سے۔ ہم براہِ راست خدا کے آستانے تک نہیں پہنچ سکتے۔ نجامین یعنی ستارہ پرستوں نے تصرف و تدبیر کا یہی خزانہ ستاروں میں دیکھ کر ان کی عبادت کے ہیکل قائم کئے عیسائیوں نے حضرت مسیح کے لئے علوم مرتبت اور قرب الٰہی کی وجہ سے ابن اللہ کی تمثیل اختیار کی اور کچھ نے حلول کی آڑ میں اللہ کہہ کر پکارا۔ اس کے نتیجے میں اقانیم ثلاثہ، کفارہ اور مسیح پرستی کے تصورات چھا گئے (حجۃ اللہ ص۵۹ ج۱)

انسان فکر و عمل کی دو قوتوں سے مالا مال ہے۔ یہی اس کی نوعی خصوصیت ہے۔ جس کے بل بوتے پر وہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے۔ اس کا یہی مزاج نوعی خود اپنی ان دو قوتوں کے لئے طبعاً غذا چاہتا ہے۔ اگر اس کو غذا سے محروم کر دیا جائے تو بلاشبہ اپنے اس نوعی کمال کو حاصل نہ کر سکے گا۔ جو شہنشاہِ کائنات جل مجدہٗ نے اس کے لئے مقرر کیا ہوا ہے۔ فکر کی اسی غذا کا نام زبان شریعت میں علم توحید ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ص۲۳ ج۱)

انسان کی قوتِ فکری کے لئے جو علمی غذا توحید کے ذریعے مہیا کی گئی ہے۔ اسی کی معرفت کو ذہن انسانی سے قریب تر کرنے کے لئے ناموس وحی میں تسبیح و تحمید کا پیمانہ آیا ہے۔ ذہن انسانی جن جن صفات کو جانتا اور پہچانتا ہے۔ ان سب کو حضرت حق جل مجدہٗ کے لئے بولا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ ان صفات کا موصوف جب حق جل مجدہٗ ہو تو کائنات کی کوئی چیز اس کی مثیل نہیں ہے۔ ہم بولتے ہیں کہ حق جل شانہ کی ذات ستودہ صفات حیات، علم، قدرت، بصارت، ارادہ، سماعت اور کلام کی صفات سے موصوف ہے لیکن وہ اپنی توصیف میں بھی یگانہ ہے۔ مثلاً وہ عالم ہے لیکن اس کا علم

علم حضوری ہے۔ وہ بیک آن بیک لمحہ بارش کے قطروں، تودہ ہائے ریگ کے ذروں، درختوں کے پتوں اور جانداروں کے سانسوں کی گنتی اور شمار سے کو جانتا ہے۔ بصیر ہے وہ اٹاٹوپ رات کی تاریکی میں چیونٹی کی چال اور بند کمروں کے اندر لحافوں میں لپٹے ہوئے انسانوں کی اندرونی دھڑکنوں کو دیکھ لیتا ہے (حجۃ اللہ ص۲۳ التفہیمات ص۲۳ ج۱)

ذاتِ اکبر جل شانہ، کو مثیلوں، عیبوں، کوتاہیوں اور کمزوریوں سے منزہ اور پاک یقین کرنا تسبیح ہے۔ اس کے لئے کمالات اور حسن و جمال پر مبنی اوصاف ثابت کرنے کا نام تحمید ہے۔ ان دونوں کا مجموعہ ہی اللہ جل شانہ، کی وہ صحیح معرفت ہے جو عناصر کی اس گود میں انسان کو ہو سکتی ہے۔ اس سے آگے اس دنیا میں خدائے ذوالجلال کی معرفت انسان کے بس سے باہر ہے۔
(حجۃ اللہ البالغہ ص۷۲ ج۲)

یہ بات انسان کے وجدانی اذعان کے خلاف ہے کہ وہ اپنا اور اردگرد پھیلی ہوئی پروردگاری کا مطالعہ کرے اور ایک پروردگار ہستی کا یقین نہ کرے۔ ایک شخص غفلتوں اور سرکشیوں کے نتیجے میں ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے۔ لیکن خود اپنا اور اپنے مشاہدات کا انکار نہیں کر سکتا۔ وہ جب اپنے چاروں طرف زندگی اور پروردگاری کا ایک عالمگیر، منظم اور باترتیب کارخانہ دیکھتا ہے تو اس کے دل کے ایک ایک ریشے سے آواز اٹھتی ہے کہ ایک پروردگار ہستی موجود ہے گویا پروردگار ہستی کا اعتقاد حضرت شاہ صاحب کے لفظوں میں مرکوز فی طبائع الانسان یعنی انسانی فطرت کا اندرونی تقاضا ہے۔ اختلاف ایک پروردگار ہستی کے ہونے میں نہیں ہے یہ تو فطرتِ انسانی کا ایک وجدانی احساس ہے لیکن فطرت کا یہی اندرونی جذبہ جب ایک بالاتر ہستی کو مان لیتا ہے تو مان لینے

کے بعد اسے جان لینے کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔ یہیں سے قدر شناسی کے فطری جذبے میں فکر و ذہن کی مداخلت شروع ہوتی ہے چونکہ انسانی معلومات محسوسات کے دائرے میں محدود ہیں اس لئے اس کا تصور اس دائرے سے باہر قدم نہیں نکالتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ انسانیت کا ہر قدم اس راہ میں درماندگیوں کا شکار رہا۔ کبھی موالید و عناصر، کبھی کواکب و سیارات اور کبھی صلحاء کی روحیں اس کے دامانِ فکر میں الجھ کر رہ گئیں۔ فکرِ انسانی کی سب سے پہلی درماندگی یا بقول حضرت شاہ صاحب حیرۃ حائرہ یہی ہے (البدور البازغہ ص۹۸)

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ
یکم جنوری ۱۹۵۴ء

دینداری ، فن دینداری اور پیشہ دینداری ، فن دینداری ، مجاراتِ علماء اور پیشہ دینداری دین فروشی کا ہم معنے ہے ، نبوت کا مطالبہ ان دونوں میں سے ایک نہیں ہے ، نبوت کا پیش نہاد اور علم کے موضوع پر اس کا مطالبہ ، نفس کو لذت دوسروں پر اپنی برتری جتانے میں آتی ہے کتابی معلومات انسان کے باطن کا تزکیہ نہیں کرتی ہیں ، اچھی صحبت اور اس کی ضرورت ، اخلاق کے مراحل کی پیچیدگی ، اخلاق حساب کے پہاڑے نہیں جن کو رٹ لیا جائے ، انسان گرنے کے بعد کب اٹھتا ہے۔

تلمیذی العزیز ! السلام علیکم

آج ایک خاص تقریب سے تم سے باتیں کرتا ہوں ---- دین و مذہب کو بہتوں نے صرف فنی طور پر حاصل کیا ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ اس کو برتیں اس سے اپنی زندگی بنائیں۔ اسے ایک مسلک حیات قرار دیں۔ محض دین کی باتیں جان لیتے ہیں۔ مقصود ان معلومات پر عمل کرنا نہیں ہوتا بلکہ اسے دوسروں کو بتانا اور اپنی قابلیت کا سکہ جمانا ہوتا ہے۔ یا پھر دوسروں کو لتاڑنا۔ اور بہت صرف اس لئے پڑھتے ہیں کہ یہ بھی منجملہ دوسرے مکاسب کے ایک اکتسابی ذریعہ ہے۔ وہ اس سے معاشی الجھنوں کو دور کرتے ہیں۔ پہلے کو علم برائے علم اور فن دینداری اور دوسرے کو علم برائے نان یا پیشہ دینداری کہتے ہیں۔

پہلا بیماری بہ العلماء او بیماری بہ السفہاء کا اور دوسرا دین فروشی کا مصداق ہے۔ علم کے موضوع پر نبوت کا مطالبہ نہ یہ ہے اور نہ وہ۔ قرآن نبوت

اور اسلام علم کی تحصیل کو صرف اس لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ لوگ اس کو برتیں، جزوِ زندگی بنائیں اور ایک اور کی ذمہ دار وجود ہونے کی وجہ سے جو فرائض ذاتی اور اجتماعی اس پر لاگو ہوتے ہیں۔ ان سے گریز پائی کسی درجے میں اختیار نہ کریں۔ لیکن آہ ظاہر بینوں کو عمل میں لذت کہاں نصیب ! نفس کو لذت ہے تو صرف اپنے کو دوسروں پر جتلانے میں آتی ہے۔ فضیلت کا لیبل چپکا لینے اور اصطلاحوں کے نام رٹ لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل چیز تو صرف ایمانیات میں توحید و رسالت، یقین مجازات، اور اعمال میں درستی اخلاق ہے۔ اگر یہ حاصل ہے تو سب کچھ حاصل ہے۔ اگر نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ باقی سب لفاظیاں اور اصطلاحی بولیاں ہیں ؎

وہی ہیں پاک طینت تو نگی ہے جن کی خالق سے
نہیں ہے شرک کی نجاست بس وہ طاہر ہیں

عارف نے کہا ہے ؎

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود

صرف کتابی معلومات انسان کے جوہر باطن کو صیقل نہیں کر سکتیں اس کیلئے اچھی صحبت کی ضرورت ہے۔ زندگی پر اثر زندہ شخصیت ہی کا پڑتا ہے۔ ایمان میں قوت، عمل میں رسوخ زندہ معلم ہی کے واسطے سے نصیب ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ کتابی معلومات کیلئے آسمانی کتابیں صرف چار ہی مشہور ہیں مگر اس کے برعکس نبیوں یعنی معلموں کی تعداد طبرانی کی ایک روایت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے۔ عالم بے عمل وہ ہی کہلاتا ہے جن کے دماغ کتابی معلومات سے لبریز ہیں۔ لیکن دل غفلت کی نیند سو رہے ہیں۔ گویا ؎

خشک مغز و خشک تار و خشک پوست
از کجا مے آید ایں آوازِ دوست

علم اگر عمل میں پیوست نہ ہو تو صرف یہی نہیں کہ انسان اخلاقی گناہوں، بدنگاہی، بدزبانی اور بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے بلکہ انسان کی نفسیاتی کیفیت، کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ اخلاق کے اکثر مرحلے بڑے ہی پیچیدہ ہیں۔ حساب کے پہاڑے نہیں کہ چھوٹا بچہ بھی آنکھ بند کرکے رٹ لے۔ جذبات کی کشمکش ایک طرف ہوتی ہے۔ عاقبت اندیشی کا فتوی دوسری جانب۔ اور پھر خود جذبات کے اندر ہی باہم آویزش اور کشمکش ۔۔۔ کیا خوب کہا ہے ؎

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بیقرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

گرنے کے بعد انسان گناہ سے ہاتھ اگر کھینچتا ہے تو عموماً اس وقت جب خود گناہ کی قوت جواب دے بیٹھتی ہے۔ ورنہ جب تک قوت و سامان موجود ہے نفس پرستیوں اور سیہ کاریوں کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ شباب کی بدمستیاں وبے احتیاطیاں کس کو معلوم نہیں ہیں؟ مانو یا نہ مانو مگر کہے دیتا ہوں۔ نیکی اور بدی پر آخرت میں جو ثواب و عذاب ملیگا وہ ملے گا ہی۔ اس دنیا میں بھی دونوں میں یہ بین فرق محسوس ہوتا ہے کہ طاعت کے بعد طبیعت میں شگفتگی، اطمینان، اور سکون پایا جاتا ہے اور معصیت کے بعد طبیعت کو اضطراب اور بے چینی لاحق ہو جاتی ہے۔ شاید سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں یہ اور صرف یہ کہ علم کو عمل میں برتو مسلک حیات بناؤ۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ ؎

مرغِ پر نارستہ چوں پراں شود ؛ طعمۂ ہر گربۂ دراں شود

وہ بصارت تھی یہ بصیرت ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

مبتلا، مولوی امیر علی مولوی فاضل رنگپورہ سیالکوٹ۔

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۴ر جنوری ۱۹۵۴ء

بہ خسرو شیخ نظام الدین بلخی کے مرید ، پیر اور مرید میں بے حد محبت ہے جیل بلحاظ صورت خانقاہ سے ملتا جلتا ادارہ ہے۔ تحلیہ اور تخلیہ تصوف کے دو رکن ہیں ، جیل کی زندگی سرتاسر تخلیہ ہے ، اگر یہاں تحلیہ کا بھی انتظام ہو جائے تو قیدی اولیاء اللہ بن کر واپس آئیں ۔ جیل میں جاسئے ۔ رہائش کا نقشہ اور روزمرہ کا پورا پورا پروگرام

جمی فی اللہ ! السلام علیکم

خدا تمہیں خوش رکھے تم اسوقت یاد آ گئے ؎

جگر خوں ہو تو درد دل میں ہوتی ہے لہر پیدا

اصل میں مصرعہ تو یوں تھا ؎

جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

یہ صوفیانہ مذاق ہے اور وہ ایک اجتماعی کا تاثر ہے ۔ یاد پڑتا ہے کہ ہمارے اقبال نے حالی کی یاد میں کہا ہے ۔ جہاں میں رہتا ہوں لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ چوروں ، راہزنوں اور قاتلوں کا یا زندوں کا گورستان ہے مگر مجھے اس سے اختلاف ہے ۔ میرے خیال میں ؎

ایں مکانیست منزلگہ جاناں بودہ است

یہ مصرعہ امیر خسرو کا ہے ۔ تم کبھی دہلی کے قیام کے دوران میں بستی نظام الدین گئے ہو گے وہیں ان کا مزار ہے ۔ خواجہ نظام الدین کے مرید ہیں ۔ پیر کو مرید سے اور مرید کو پیر سے بے پناہ محبت تھی ۔ پیر صاحب مرید کی شاعری کے بھی مداح تھے ۔ خواجہ صاحب کی رباعی کا ایک مصرعہ ہے ؎

خسرو کہ نظم و نثر مثلش کم خاست

اخیر عمر میں خسرو غیاث الدین تغلق کے ساتھ بنگال گئے وہیں کچھ قیام کیا۔ اسی قیام میں خبر ملی کہ پیر صاحب اس دارِ فانی سے رحلت کر گئے۔ خسرو روتے پیٹتے دہلی آئے اور مزار مقدس پر حاضر ہوئے۔ خانقاہ کے دروازے پر پہنچ کر شعر پڑھا جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے ؎

این مکا نیست منزلگہِ جاناں بودہ است

یہ مقام خانقاہ سے صورت کے اعتبار سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ خانقاہی لوازم کی روزانہ بجا آوری ہوتی ہے۔ ایک مرید کی تربیت کے لئے خانقاہ میں گھر سے علیحدہ ہونے کے بعد جو کچھ ہونا چاہیئے۔ وہ یہاں بکمالہ موجود ہے۔ تصوّف دو چیزوں سے مل کر بنتا ہے تخلیہ اور تحلیہ۔ بلکہ بعض اکابر سے تو تعریف یہی منقول ہے۔ تخلیہ کی حد تک تو سب کچھ یہاں ہوتا ہے یعنی کم خوردن، کم گفتن، کم خفتن اور کم با مردماں آمیختن، کا سارا کورس ہر قیدی کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ اس پر حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی خانقاہی اسکیم کا اضافہ کر دیا جائے تو وہ بھی یہاں پوری ہوتی ہے۔ نظم، ترتیب، توازن اور تناسب ۔ کسر ہے تو صرف تحلیہ کی۔ اے کاش! کوئی کامل کبھی ہوتا تو مقصود حاصل ہو جاتا۔ ہم جیسے تشنہ لب سیراب ہو کر جاتے مگر وائے ناکامی فیا للاسف ویا للحاز۔

اب یہاں کی سنو۔ جہاں رہتا ہوں۔ ایک احاطہ ہے۔ شاید یہاں کی اصطلاحی زبان میں اسے سیکورٹی وارڈ کہتے ہیں۔ اس میں رہائشی کمرے ہیں۔ میرا کمرہ ۸×۱۲ طول وعرض ہے۔ اونچائی بھی ۱۲ فٹ ہے۔ سامنے دروازہ ہے۔ کمرہ شرقاً غرباً ہے۔ مغرب کی جانب دیوار میں چھت کے قریب ایک چھوٹا سا جالی دار روشندان ہے جس سے ہوا اور روشنی کبھی آتی نہیں۔ البتہ چڑیوں کی بیٹ گر گر میرے سکون

کو پامال کرتی رہتی ہے۔ کمرے کے آگے دو صحن ہیں۔ ایک وسیع مربع ۲۰×۲۰ فٹ ہے۔ اور دوسرا مستطیل ۸×۵ کا ہے۔ دوسرے صحن میں ایک سائڈ پر پاخانہ اور غسل خانہ ہیں۔ غسل خانے میں پانی چوبیس گھنٹے رہتا ہے۔ کمیٹی کا پائپ لگا ہوا ہے۔ صحن میں شمالی طرف چولہا ہے۔ کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور صفائی کے لئے ایک شخص مقرر ہے۔ کھانا صبح آٹھ بجے اور شام کو پانچ بجے تیار ہو جاتا ہے۔ میں اسی وقت کھا لیتا ہوں۔ خوراک میں تین چھٹانک گوشت، دو چھٹانک دال، سیر بھر سبزی، ڈیڑھ چھٹانک گھی، ڈیڑھ پاؤ دودھ، تین ماشہ چائے، ایک چھٹانک چینی، چھ سیر لکڑی ہفتہ میں دو روز فروٹ، ہسپتال کی جانب سے آدھ سیر روزانہ دہی، ہفتہ میں ایک دفعہ جیل ساختہ صابن اور سرسوں کا آدھی چھٹانک تیل ملتا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ میرا اپنا سامان سب چائے اور پان کا ساتھ ہے۔ چائے میں اسٹوپ پر پکاتا ہوں۔ دوپہر کو بارہ بجے اور رات کو دو بجے میری چائے کا وقت ہے۔ کمرے میں دروازے کے سامنے مغربی دیوار کی طرف چاندنی لگا رکھی ہے۔ ایک جانب نماز پڑھنے کے لئے جانماز بچھا ہوا ہے۔ دوسری جانب چوبی سوٹ کیس، پان کا سامان، لالٹین رکھی ہے اس سے ذرا پرے چائے کے برتن اور کھانے کے برتن دو ٹوکریوں میں رکھے ہیں ۔۔۔ سوں اخبار سے کاغذ نکالے ہیں اور دیوار پر کیل سے اٹکا کر ڈریسنگ الماری کا کام لیا ہے۔ یہ ہے میری کل کائنات۔

اب پوچھو کہ میں چوبیس گھنٹے کن مشاغل میں گذارتا ہوں۔ تو یہ بھی سن لو۔ صبح ایک اور دو کے درمیان اٹھتا ہوں۔ چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد اذان تک تہجد پڑھتا ہوں۔ اذان سے نماز تک لا الہ الا اللہ کہتا ہوں۔ نیز دوسری تسبیحات۔ نماز کے بعد طلوع آفتاب تک۔ اسی طرح گذر جاتا ہے۔ دو رکعت اشراق کے بعد

منہ صاف کرکے کھانے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ کھانے سے فراغت کے بعد ساڑھے نو بجے تک تلاوتِ قرآن۔ ساڑھے نو سے دس بجے تک مطالعہ۔ دس سے ساڑھے گیارہ بجے تک قیلولہ۔ بارہ بجے چائے اور ایک بجے تک کچھ مطالعہ نماز کے بعد ذکر اور تلاوت قرآن۔ عصر کے بعد کھانا اور مغرب تک تسبیحات۔ بعد مغرب چھ نفلیں اور پھر اخبار بینی تا نماز عشاء ـــ اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ ملتا ہے۔ نماز کے بعد سو جاتا ہوں ـــ اچھا ملاقات ختم ـــ میں ہی بات کر رہا ہوں تم تو جواب دیتے ہی نہیں۔ کیا موق برتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر چپ کیوں ہو؟ بھائی ایک طرفہ بات میں مزہ نہیں آتا۔ اس لئے میں بھی ختم کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

بنام ڈاکٹر محمد خلیل صاحب بازار پنساریاں شہر سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۸ رجنوری ۱۹۵۴ء

سید سلیمان ندوی کی رحلت جماعتی زندگی کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے

سید صاحب بہت بڑا علمی سہارا اور تقدس وتقویٰ کا قومی سرمایہ تھے

قدیم راہوں کے ساتھ جدید تقاضوں سے آشنا تھے، قانون کے

خلاف قرآن وسنت نہ بننے کا مفہوم، قوم کی کایا کاغذی مسودوں، اور

دستوری سفارشوں سے نہیں بلکہ قلب قلب سے پلٹتی ہے۔ وزیر

قانون کا اطمینان ــــ

محبی فی اللہ وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ السلام علیکم

اس وقت یاد آئے۔ اس کی تلافی اس مکتوب سے کر رہا ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ میری زبانِ قلم سے نکلے ہوئے الفاظ کی آپ تک رسائی نہ ہوگی مگر میرے دل کی بھڑاس تو ضرور نکلے گی۔ آپ سے ملے دن بھی کافی ہو چلے۔ یاد کی تقریب بھی سن لیجئے۔ کل بارہ بجے اخبارات آئے۔ جمع اس لئے بول رہا ہوں کہ یہاں روزانہ تین چار اخبار ملتے ہیں دو انگریزی کے۔ سول اور پاکستان ٹائمز تو باقاعدہ اور اردو اخبار بے قاعدہ کبھی آثار، احسان، کبھی مغربی پاکستان، نوائے وقت، آج نوائے وقت اور امروز ملے۔ کل کے اخبار میں یہ خبر بڑی دردناک تھی۔ دیکھتے ہی کلیجہ ہل گیا کہ سید سلیمان ندوی رحلت فرمائے دارالبقا ہو گئے۔ ابھی شیخ الاسلام کی مفارقت کے داغ مندمل ہونے نہ پائے تھے کہ یہ سانحہ پیش آگیا۔ پرانے زخموں میں اس خبر نے تازگی پیدا کر دی۔ پاکستان میں ہماری جماعتی زندگی کا سید صاحب بہت بڑا علمی سہارا تھے اور ساتھ ہی تقدس اور تقویٰ کا بہت بڑا سرمایہ۔ مگر کیا کیجئے یہاں بس کسی کا نہیں۔ مولا کی مرضی انا للہ وانا الیہ راجعون

بلاشبہ سید صاحب کی وفات سے ہماری جماعتی زندگی کو بہت بڑا ناقابلِ تلافی

نقصان پہنچا ہے۔ دینی بھی اور سیاسی بھی۔ دینی اس لئے کہ حضرت تھانوی کے خلفاء میں اگرچہ بہت سی برگزیدہ ہستیاں ہیں مگر علم و عمل کا یہ مجموعہ کہاں؟ جو ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں مرحوم میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اسلاف کے علم و عمل میں پوری پوری کاپی ہونے کے باوجود وقت کے بدلتے ہوئے جدید تقاضوں سے بھی آشنا تھے۔ اب ہمارے پاس جو کچھ سرمایہ ہے وہ سب قدیم راہوں سے پورے پورے آشنا ہیں۔ مگر نئی راہوں سے نا آشنا۔

چاہے آپ برا مانیں مگر بات سچ کی ہے کہے بغیر رہا نہیں جاتا۔ مانئے یا نہ مانئے مگر سچ یہ ہے کہ مودودی صاحب میں یہ خوبی سوا لاکھ روپے کی ہے۔ یہ افسوس ضرور ہے کہ ہم نے ان کو تف تف کر کے اپنے سے بہت دور کر دیا ہے فالی اللہ المشتکیٰ۔

سیاسی نقصان اس لئے کہ شیخ الاسلام کے بعد پاکستان کا اقتدار اعلیٰ علمی طور پر ان سے کچھ لچک کھاتا تھا۔ ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی۔ میری نگاہ میں تو کوئی جچتا نہیں آپ کا مجھے پتہ نہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنی جماعتی زندگی کے بارے میں کچھ مایوس ہو گیا ہوں۔ نہیں صاحب الحمدللہ اب بھی ہم ہی ہم ہیں۔ اقتدار کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے والے ہم، اقتدار کو جھک کر سلام کرنے والے ہم، مغرب میں ہم، مشرق میں ہم، مدارس میں ہم، مساجد میں ہم، پلیٹ فارم پر ہم۔ پریس میں ہم۔

لیجئے اب تو پاکستان اسلامی جمہوریہ بن گیا ہے، اور تو اور باہر سے آنے والے خطوط کے سرناموں پر بھی یہی لکھا ہوتا ہے اور اب تو یہاں کوئی قانون خلاف قرآن و سنت نہ بنے گا اور اس پر طرہ یہ کہ ہر قانون کو خلاف قرآن و سنت کے بہانے فیڈرل کورٹ میں چیلنج بھی کیا جا سکے گا۔ سادے ہیں بیچارے مولوی۔

اور بھول بھلیوں میں ہے۔ بچاری اسلام اور قرآن کے نام پر خون دینے والی امت مگر بڑے شاطر ہیں ارباب اقتدار اور بہت دور رس ہیں ان کی چیرہ دستیاں۔

لوگ خوش ہیں کہ اسلام کی زندگی کی کچھ نشانیاں نظر آنے لگی ہیں، اور اقتدار نفیں بجا رہا ہے کہ قوم نامعلوں سے بچ نکلی ہے۔ خدارا ساری جد و جہد کا عقلی اور سیاسی تجزیہ تو کیجئے اور ان نتائج پر نگاہ تو ڈالئے جو آگے چل کر رونما ہونے والے ہیں اس حد تک میں بھی مانتا ہوں کہ ـــــ اگر بالادستی کسی صالح قیادت کے ہاتھ میں چلی گئی۔ تو وہ اس سے کچھ اچھا فائدہ اٹھا سکتی ہے اور بس۔ لیکن اگر باگ دوڑ انہیں کے ہاتھ میں رہی جو .... پھر اس مملکت کی موجودہ اسلامیت کے مٹ جانے کا یقین ہے اور بالآخر مصر اور عراق جیسی حالت رونما ہو جائے گی۔ آخر وہاں بھی تو دستوری پوزیشن یہی ہے۔

دنیا پر ایک نگاہ ڈالئے۔ دنیا کو چھوڑیئے کامن ویلتھ کو دیکھ لیجئے۔ ان سب ممالک کی تقریباً دستوری پوزیشن پاکستان کی دستوری پوزیشن سے مختلف نہیں ہے۔ ان میں کتنے ملک ہیں جن کے دستور میں مملکت کے مذہب اور سربراہِ مملکت کا مذہبی مقام مقرر ہے۔ ایران ہو یا عراق افغانستان ہو یا مصر۔ سب کا حال یہی ہے۔ عراق کے دستور میں تو یہاں تک ہے کہ کوئی قدم خلافِ اسلام نہ اٹھایا جائے گا۔ ہندوستانی دستور میں لامذہبیت کیسی بڑی چیز ہے مگر سب جگہ عمل کی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب جانتے ہیں ـــ صرف کاغذی دستاویز کسی انقلابی اور اصلاحی حالت کی ہرگز ہرگز گارنٹی نہیں ہے۔ اگر صرف کاغذی مسودوں اور دستوری سفارشوں سے کام چلتا ہوتا اور بگڑی حالتیں ٹھیک ہو جاتیں تو خدا کی مرضی کے نمائندے ایک لاکھ چوبیس ہزار اور کتابیں چار نہ ہوتیں۔ معاملہ برعکس ہوتا ـــ بگڑی ہوئی امتیں دفعات اور قراردادوں سے نہیں ملکہ ملکہ بانفسہم کو

تبدیل کرنے سے سنورتی ہیں۔ ما بانفسھم پر نظر ڈالیئے اور پھر ما بقوم کو دیکھئے۔ غور تو کیجئے کہ ـــ جس قرارداد کو خالصتہً مستقبل میں اسلامی حیات کا پیغام سمجھا جا رہا ہے۔ وہ ہے کیا؟ یہی تھا کہ ـــ کوئی قانون ساز ادارہ قرآن و سنت کے خلاف قانون نہ بنائے گا۔

برادر! اس کا تعلق صوبائی قانون ساز اداروں کے مستقبل سے ہے حال کے متعلق خاموش ہے۔ نہ بنائے گا۔ ٹھیک ہے۔ مگر جو بنی ہوئی چیز فی الوقت رائج ہے۔ اس کا مقام کیا ہے؟ کیا اس وقت صوبائی قانون ساز اداروں کی راہ سے جو کچھ قوانین رائج ہیں وہ کسی وقت کالعدم ہو جائیں گے؟ ہرگز نہیں۔ اور کیا ان کو بھی قرآن وسنت کی مخالفت کے نام پر فیڈرل کورٹ میں چیلنج کیا جا سکے گا؟ ہرگز نہیں۔ شائد اسی لئے وزیر قانون مطمئن ہیں اور بڑے اطمینان سے فرماتے ہیں کہ ایسی صورت بہت ہی کم پیش آئے گی۔ مگر میں کہتا ہوں بہت کم کیا شائد پیش ہی نہ آئے گی۔ اچھا ختم کرتا ہوں۔ لیجئے۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

بنام جناب علامہ خالد محمود صاحب پروفیسر سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۵ر جنوری ۱۹۵۴ء

انبیاء کی ہدایت میں عقائد، اعمال اور اخلاق کی اصلاح اور اسلام میں ان کے مدارس، اسلام ایک جاندار وجود ہے عقائد اس کا دماغ، اعمال اس کے اعضاء و جوارح، اور اخلاق اس کا قلب ہیں۔ پورے جسم میں شارع کی نظر اہمیت قلب کو حاصل ہے۔ قلب اگر صحیح ہو تو کٹے ہوئے اعضاء سے بھی کام ہو جاتا ہے۔ جیسے جسم کی تندرستی کے لئے صحیح خوراک ضروری ہے۔ ایسے ہی اسلام کے جسم کے لئے بھی امر بالمعروف اور دعوت الی اللہ کی غذا ضروری ہے، اسلام کی صحت کی خاطر جو کام انبیاء کرتے تھے۔ قرآن میں اسی کو امت کا فریضہ قرار دیا ہے یہ امت کے فرائض بھی ہیں، خصائص بھی ہیں اور اسی کے نتیجے میں یہ امت خیر امت ہے۔ نبوت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی عظمت شان، سینۂ قرآن سے ابلا ہوا چشمۂ ہدایت ہے۔

حبی فی اللہ ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم!

جی چاہتا ہے کہ اس وقت آپ سے کچھ کہوں۔ لیجئے سنئے!

انبیاء ترجمانِ غیب ہوتے ہیں۔ جو کاسۂ ہدایت لے کر آتے ہیں اس میں تین چیزیں اصلی اور بنیادی ہیں۔

۱۔ مبدء و معاد اور مجازات سے متعلق عقائد کی درستگی۔

۲۔ طاعات میں سنت کے موافق عمل کی درستگی

۳۔ اخلاق اور ملکات میں اخلاص و احسان کی نشو و نما

پہلے مقصد کی جن لوگوں نے بطور فن خدمت کی ہے ان کو متکلمین کہتے

ہیں اور فن کا نام الٰہیات یا کلام ہے۔ اشاعرہ، ماتریدیہ، اہل السنت میں اسی فن پر فکر ونظر کے مکاتب ہیں۔ اور ان کے امام ابوالحسن اشعری اور امام منصور ماتریدی ہیں۔

دوسرے مقصد کو جن لوگوں نے بطورِ فن اپنایا ہے ان کو فقہاء کہتے ہیں اور فن کا نام فقہ ہے۔ شوافع، احناف، موالک اور حنابلہ وغیرہ اسی فن میں مدارس کے نام ہیں۔

تیسرے مقصد کی جن لوگوں نے خدمات انجام دی ہیں ان کو عرفاء اور صوفیاء کہتے ہیں اور جس فن میں یہ خدمات انجام دی گئی ہیں اس کا نام اخلاق وتصوف ہے۔ قادری، چشتی، سہروردی اور نقشبندی اس کے مدارس ہیں۔

اس طرح اسلام صرف ایک عقیدہ نہیں ہے۔ نہ وہ چند اعمال اور رسوم کا مجموعہ ہے بلکہ وہ انسان کی پوری زندگی کے لئے ایک مفصل اسکیم ہے۔ اس میں عقائد، اعمال اور اخلاق الگ الگ چیزیں نہیں، تینوں مل کر ایک ناقابلِ تقسیم مجموعہ بنتے ہیں جس کے اجزاء میں باہم اسی طرح پیوند ہے جیسا کہ زندہ جسم کے اعضاء میں ہوتا ہے۔

عقائد اس کا دماغ، عبادات و اعمال اس کے جوارح اور قوائم ہیں۔ جن کے بل بوتے پر وہ کھڑا ہوتا ہے اور کام کرتا ہے۔ معیشت، معاشرت، سیاست اور نظم کے وہ تمام اصول جو زندگی کے لئے اسلام نے پیش کئے ہیں۔ اسکے لئے معدے اور جگر کا کام دیتے ہیں۔ اس کو صحیح و سالم آنکھوں اور بے عیب کانوں کی ضرورت ہے۔ اخلاق و ملکات اس کا قلب ہیں۔

اس پورے نظام میں اصلی اہمیت قلب کی ہے۔ اس کی ہمت تمام اعضاء و جوارح کو طاقت بخشتی ہے۔ اعضاء وجوارح اکثر وبیشتر کٹ بھی جائیں یا خراب ہو جائیں تو اکیلا قلب تھوڑے بچے کھچے حستہ و بیمار اعضاء کے ساتھ ہی زندگی کے کچھ سانس لے لیتا

ہے۔ لیکن دل کی اگر حرکت بند ہو جائے تو دماغ اور جوارح اچھے بھلے ہونے کے باوجود کالعدم ہیں۔ زندگی کا بقا دل سے وابستہ ہے۔ جسم کی تندرستی کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ ذاتی طور پر اس میں کہیں کمی نہ ہو ایسے ہی اس کی تندرستی کی نشوونما اور بقا کے لئے یہ بھی ناگزیر ہے کہ اسے خوراک صحیح ملتی رہے، آب و ہوا موافق ہو خوراک اگر غلط ہو تو کوئی جسم بھی اعضاء کی تندرستیوں کے باوجود بقائے صحت کی مہم میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اسلامی جسم کی اسی ضرورت کو وحی نے امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اور دعوت کہہ کر پکارا ہے۔ فضائیں پیدا کرنے، ہواؤں کا رخ ٹھیک کرنے، پودوں میں بقدر ضرورت پانی دینے، نولائی کرنے، غذائی مواد تلاش کرنے، وقت کی مزاجی موافقت سے اس میں ترکیبی عمل قائم کرنے اور اس کی خاطر جان کو جوکھوں میں ڈالنے اور تج کرنے کا نام ہی امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور دعوت ہے۔ فضائیں اگر گندی ہوں اور ہواؤں میں جراثیم پھیلے ہوئے ہوں تو نہ صرف ایک آدمی کو جان کا خطرہ ہوتا ہے بلکہ یہی کبھی وباؤں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

پہلے اسلام کی صحت کی خاطر یہ کام انبیاء کرتے تھے۔ سب انبیاء نے تکلیفیں اٹھا اٹھا کر، بھوکوں رہ رہ کر، فضاؤں کو ٹھیک کرنے اور ہواؤں کا رخ بدلنے کی جان توڑ کوششیں کی ہیں۔

قرآن میں جو نبیوں کے تذکرے ہیں، قصے ہیں اور واقعات ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے لیکن اللہ جل شانہ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و سلم کی امت کو یہ بزرگی دی ہے کہ نبیوں کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ صرف سپرد نہیں بلکہ اس کو امت کی خیریت کا مبنیٰ قرار دیا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

تم ہو بہتر سب امتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔

اور کارِ نبوت جس امت کے سپرد ہوا ہے اس امت کے خصائص کا جو نقشہ قرآن میں ہے وہ انبیاء سے ملتا جلتا ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ صرف کام ہی سپرد نہیں ہوا ہے۔ بلکہ خصائص بھی اس امت کو نبیوں والے ارزاں ہوئے ہیں۔ اور ترقی کر کے کہتا ہوں — کہ صرف خصائص ہی نہیں بلکہ اس امت کے فرائض بھی نبیوں جیسے بتائے گئے ہیں — کیا کہنے ہیں اس نبی کی عظمتِ شان کے جس کی نبوت دنیا میں اجتماعی بعثت کا سامان بن کر آئی ہو۔ نبی تو مبعوث ہی ہوتے ہیں لیکن یہاں تو پوری امت مبعوث ہوئی ہے اور اس شان سے مبعوث ہوئی کہ وہ تمام صفات تھی اور فرائض جو نبی انفرادی طور پر لیکر آتے رہے ہیں یہ امت اجتماعی طور پر لیکر آئی ہے۔ بات لمبی ہو جائے گی ورنہ کھول کر بتاتا کہ اس موضوع پر سفینۂ قرآن سے ابلا ہوا چشمہ ہدایت کیا ہے۔

مجملاً یہ کہ قرآن نے ہدایت، شہادت، دعوت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر تلاوت، تبلیغ، تعلیم جو باتیں نبوت سے متعلق فرمائی ہیں۔ وہ سب کی سب وصف اور فرض کے درجے میں اس امت کے لئے بھی بولی ہیں۔ قرآن نے امت کو ان فرائض کی پابجائی کے لئے جو واضح پالیسی دی تھی وہ قرآن ہی کے لفظوں میں یہ تھی۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

اور چاہیئے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک
کام کی طرف۔ اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں برائی
سے اور وہی پہنچے اپنی مراد کو۔

یعنی اسلامی نظام، اسلامی حیات، اسلامی معاشرت، اسلامی تمدن اسلامی تہذیب، اسلامی مواخات اور اعتصام بحبل اللہ اس وقت قائم رہ سکتا ہے، اس وقت نشوونما پاسکتا ہے جبکہ مسلمانوں میں ایک جماعت خاص دعوت اور امر بالمعروف کا کام کررہی ہو۔ قرنِ اوّل ہی سے مسلمانوں نے اللہ جل شانہ، کے حکم کو سن کر پلے گرہ لگالی تھی۔ صحابہ نے خود یہ کام ذاتِ نبوت کو کرتے دیکھا تھا۔ دین اسی سے پھیلا اور پھولا تھا۔ اسی کیخاطر خلافت قائم ہوئی تھی اور اسی کے لئے دعاۃ روانہ ہوتے تھے۔ مقصد تو یہی تھا کہ اسلام کو مزاج کے موافق خوراک اور اچھی آب و ہوا ملتی رہے۔ تاکہ دیر تک اس کی تندرستی قائم رہے۔ پہلے پہل تو یہ کام ایک ہی جگہ چلا لیکن کچھ دنوں بعد یہ کام تقسیم ہوگیا —— کچھ نے جہاد، عدالت اور شہری انتظام کیا۔ یہ خلافت ظاہرہ کہلاتی ہے اور کچھ نے کتاب الٰہی اور سنت کی تعلیم، انوارِ باطن کے ذریعے لوگوں کے اخلاق کا تزکیہ شروع کر دیا۔ یہ خلافتِ باطنہ ہوئی۔ خلافتِ ظاہرہ والوں کو "ملوک" اور خلافتِ باطنہ والوں کو "علماء" کہا گیا۔ آگے چل کر پھر تقسیم کا پرچا چلا۔ کچھ لوگوں نے صرف کتاب و سنت کی تعلیمی سرگرمیاں قائم رکھیں اور کچھ نے صرف انوارِ باطن کے ذریعہ اخلاقی تزکیہ کا کام کیا۔ پہلے علماء اور موالی کے نام سے مشہور ہوتے اور دوسروں نے صوفیاء کا لقب پایا۔

اچھا لیجئے رخصت ہوتا ہوں۔ اب کافی وقت ہوچلا ہے۔ اگرچہ

بلت ناتمام ہے۔ اور کیا کہوں اور آہ کیا کہوں۔ خوش نصیب ہیں
آپ۔ شعر

دو عالم ہیں تڑپنے میں جنہیں ملتی ہے لذت
یوں آپ کی شمشیر کے بسمل تو بہت ہیں

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بنام ڈاکٹر محمد ادریس صاحب محلہ کالج روڈ سیالکوٹ۔

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۷ر جنوری ۱۹۵۴ء

دنیا میں مسلمان کی حیثیت ایک نسب یا وطن کے نام پر بنی ہوئی قوم کی نہیں ہے۔ ماننے کو اسلام، نہ ماننے کو کفر اور مان کر چھوڑ دینے کو ارتداد کہتے ہیں۔ قرآن کی چند اصولی اور قانونی ہدایات۔ انفرادی اور اجتماعی ارتداد کا قرآن میں ذکر۔ ایمان کے بعد ایمان سے گریز پائی اختیار کرنے والا ظالم اور ملعون ہے۔ قرآن میں ملعون کی سزا۔ مرتد کے حربی ہونے کا فیصلہ فقہا نے کیا دبون اللہ و رسول سے استنباط کیا ہے۔ اسلام کی بنیادی خصوصیت۔ جیسے ایک نبی کا نبی ہونے سے انکار کفر ہے، ایسے ہی کسی غیر نبی کو نبی ماننا بھی کفر ہے۔ حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کی مرضی کے آخری نمائندے ہیں۔ اس کا انکار قرآن وسنت کی کھلم کھلا بغاوت ہے

خواجہ صاحب! السلام علیکم

اسلام صرف چند سطحی رسموں کا نام نہیں۔ بلکہ اسلام نام ہے ایک جامع تہذیب، کامل تمدن اور مکمل نظام زندگی کا۔ اس کی حیثیت نہ اوطان کے نام پر پیدا شدہ نسبتوں کی ہے جیسے کہ ایک لاہوری، ایک پنجابی اور ایک پاکستانی۔ بہر حال پاکستانی، پنجابی اور لاہوری ہے خواہ اس کی زندگی کچھ ہو اور نہ آباد اور خاندانوں کے نام پر نباہتے ہوئے دائروں کی ہے جیسے شیخ، سید، فاروقی، راجپوت وغیرہ۔ شیخ بہر حال شیخزادہ ہے چاہے وہ اپنے کردار، اور اپنی گفتار میں اخلاق کے معیار سے کتنا ہی گرا ہوا ہو۔ نہ زنا اس کی پنجابیت، اور شیخی پر بٹہ لگاتا ہے اور نہ شراب نوشی اس کے لئے عیب ہے،

شرک، کفر، فسق، فجور اور اخلاق کی ساری آلائشوں کے باوجود وہ پنجابی، پاکستانی اور شیخ زادہ ہے۔

مسلمان کی حیثیت یہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اصلی اعتباری اور اضافی مقام ان نسبتوں سے ملتا جلتا ہے جن کی عمارتیں ناموں کی بنیاد پر نہیں بلکہ کاموں کی بنیاد پر اٹھتی ہیں۔ جیسے ڈاکٹر، حکیم، حلوائی ۔۔۔ ڈاکٹر اس وقت تک ڈاکٹر ہے اور حلوائی اس وقت تک حلوائی ہے جب تک وہ ڈاکٹر اور حلوائی کا کام جانتا اور کرتا ہے۔ ڈاکٹر کا بیٹا ڈاکٹر اور حلوائی کا بیٹا حلوائی نہیں ہے یہی حال مسلمان کا ہے اگر اسلام کو مانتا اور جانتا ہے تو مسلمان ہے، اور اگر نہ جانتا اور نہ مانتا ہے تو مسلمان نہیں ہے۔ جیسے ایک نیشنلسٹ اور سوشلسٹ اس وقت تک نیشنلسٹ اور سوشلسٹ ہے جب تک کہ نیشنلزم اور سوشلزم کو مانتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان اس وقت مسلمان ہے جب کہ اسلام کو مانتا ہے نہ ماننے والوں کو مسلمان نہیں بلکہ کافر کہتے ہیں اور اسلام کو مان کر چھوڑ دینے والوں کو مرتد اور اس کے عمل کو ارتداد کہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ارتداد کا بھی اسی جگہ تذکرہ ہے جہاں اس نے اسلام کا پیمانہ بتایا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

کیونکر راہ دے گا اللہ ایسے لوگوں کو کہ کافر ہو گئے ایمان لا کر اور

گواہی دے کر کہ بے شک رسول سچا ہے اور آئیں ان کے پاس نشانیاں روشن اور اللہ نہیں راہ دیتا ظالم لوگوں کو۔ ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی، ہمیشہ رہیں گے اس میں، نہ ہلکا ہو گا ان سے عذاب اور نہ ان کو فرصت ملے۔ مگر جنہوں نے توبہ کی اس کے بعد اور نیک کام کئے تو بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔

ان آیات سے چند اصولی اور قانونی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

الف۔ ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا ظلم اور اختیار کرنے والا ظالم ہے۔

ب۔ ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والا نہ صرف اللہ اور اس کے فرشتوں کی رحمت سے دور ہوتا ہے بلکہ وہ انسانی سوسائٹی میں انسانی رحم و کرم سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

ج۔ اس کے لئے توبہ اور واپسی کا دروازہ کھلا ہوا ہے اصلاح حال کرے تو ماضی کی فروگذاشتیں اللہ کے یہاں کالعدم ہو سکتی ہیں۔

ایک اور جگہ ارتداد کے تذکرے میں ہے۔

وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

اور جو کوئی پھرے تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جاوے

حالت کفر ہی میں تو ایسوں کے ضائع ہوئے عمل دنیا اور آخرت میں۔ اور وہ لوگ رہنے والے ہیں دوزخ میں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا ہے کہ۔

الف :۔ ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے سے نہ صرف آخرت میں بلکہ اس دنیا میں حبط اعمال ہو جاتا ہے۔

ب :۔ آخرت میں یہ شخص نہ صرف اصحاب النار میں سے ہے بلکہ وہاں اس کا مقام خلود ہے۔

ج :۔ حبط اعمال یعنی ایک مسلم ہونے کی حیثیت میں اس کے کئے ہوئے سارے اعمال حرف غلط ہو گئے۔ نہ مسلمان عورت سے اس کا نکاح باقی ہے نہ مسلمانوں کی وراثت میں اس کا کوئی حصہ ہے۔

ایک اور مقام پر اجتماعی ارتداد کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

اے ایمان والو! جو کوئی تم میں پھرے گا اپنے دین سے تو اللہ عنقریب لاوے گا ایسی قوم کو کہ اللہ ان کو چاہتا ہے اور وہ اس کو چاہتے ہیں۔ نرم دل ہیں مسلمانوں پر زبردست ہیں کافروں پر لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور ڈرتے نہیں کسی کے الزام سے۔ یہ فضل ہے اللہ کا دے گا جس کو چاہے اور اللہ کشائش

والا ہے خبردار!

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ارتداد کے دائرے میں مسلمان کے فرائض یہ ہیں کہ۔

الف:۔ مرتد ہونے والے شخص سے نہیں بلکہ خود دین سے پیار کرے۔

ب۔ اس کا مقابلہ تن کر کرے اور اس معاملے میں کسی رحم و کرم کو درمیان میں نہ آنے دے۔

ج۔ اس سے مقابلہ میں سر توڑ سر تن کی بازی لگا دے اپنے کو تج کر دے۔

د۔ ملامت گروں کی کوئی ملامت اور طعنہ زنوں کا کوئی طعنہ اس راہ میں مزاحم نہ ہو۔

ھ۔ سب اس سے رفاقت کے انفرادی اور اجتماعی تعلقات توڑ لیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۔

تحقیق جو لوگ بیعت کرتے ہیں تجھ سے وہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے۔ اللہ کا ہاتھ ہے اوپر ان کے ہاتھ کے پھر جو کوئی قول توڑے سو توڑتا ہے اپنے نقصان کو اور جو کوئی پورا کرے اس چیز کو جس پر اقرار کیا اللہ سے تو وہ اس کو دے گا بدلہ بہت بڑا۔

یعنی بیعت ایمان کے وقت جو قول و اقرار کیا گیا اگر اسے توڑے گا۔ تو اس کے نقصان کا خود ذمہ دار ہے۔ اسی موضوع پر ایک اور مقام

پر ہے :-

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ وَنُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ وَاِنْ نَّکَثُوْٓا اَیْمَانَھُمْ مِّنْ بَعْدِ عَھْدِھِمْ وَطَعَنُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّۃَ الْکُفْرِ اِنَّھُمْ لَآ اَیْمَانَ لَھُمْ لَعَلَّھُمْ یَنْتَھُوْنَ - اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّکَثُوْٓا اَیْمَانَھُمْ وَھَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَھُمْ بَدَءُوْکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ اَتَخْشَوْنَھُمْ فَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْہُ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ - قَاتِلُوْھُمْ یُعَذِّبْھُمُ اللّٰہُ بِاَیْدِیْکُمْ وَیُخْزِھِمْ وَیَنْصُرْکُمْ عَلَیْھِمْ وَیَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ وَیُذْھِبْ غَیْظَ قُلُوْبِھِمْ وَیَتُوْبُ اللّٰہُ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ -

سو اگر توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیتے رہیں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں حکم شریعت میں اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں حکموں کو جاننے والے لوگوں کے واسطے - اور اگر وہ توڑ دیں اپنی قسمیں عہد کرنے کے بعد اور عیب لگائیں تمہارے دین میں تو لڑو کفر کے سرداروں سے بیشک ان کی قسمیں کچھ نہیں تاکہ وہ باز آئیں - کیا نہیں لڑتے ایسے لوگوں سے جو توڑیں اپنی قسمیں اور فکر میں رہیں کہ رسول کو نکال دیں اور انہوں نے پہلے چھیڑ کی تم سے - کیا ان سے ڈرتے ہو سو اللہ کا ڈر چاہیئے تم کو زیادہ اگر تم ایمان رکھتے ہو - لڑو ان سے تا عذاب دے اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں اور رسوا کرے اور تم کو ان پر غالب کرے اور ٹھنڈے کرے دل مسلمان لوگوں کے اور نکالے ان کے دل کی جلن اور

اللہ توبہ نصیب کرے گا جس کو چاہے گا اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

ان گرامی قدر آیات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دینی اخوت کا اصل اور بنیادی معیار اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ غیر اسلام سے توبہ کر کے اسلامی زندگی کے دو محسوس اور مرئی عمل کے پیمانوں کو اپنا لیں یعنی نماز اور زکوٰۃ۔ اور عہد کے بعد نکث کریں اور دین پر عیبوں کے دھبے لگائیں تو یہ ائمۂ کفر و ضلالت ہیں۔ ان سے قتال ناگزیر ہے۔

مجموعی حیثیت سے ان سب آیات پر ذہن کو خالی کر کے غور فرمائیے اور دیکھئے کہ روح قرآن کیا ہے؟ اور ناموس وحی سراب ضلالت میں بھٹکتی ہوئی دنیا کو کس طرف لے جا رہا ہے؟ دوسروں کا پتہ نہیں مگر میں اپنی جگہ جو کچھ محسوس کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ

> ایمان کو اپنا لینے کے بعد ایمان سے گریز پائی اختیار کرنے والوں کے متعلق قرآن حکیم کی راہنمائی یہ ہے کہ وہ ظالم ہے، ملعون ہے، دنیا اور آخرت میں اس کی ساری عملی زندگی حرف غلط ہے۔ اس کے مقابلے میں تنہا جان کو جوکھوں میں ڈال کر اس کا مقابلہ کرنا ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے۔ ناکث اور اس نکث کے نقصان کا ذمہ دار ہے۔ ناکثین اگر اجتماعی صورت میں ہوں تو قتال واجب ہے۔

اور ارتداد ہی کی ایک قسم وہ ہے کہ اللہ اور رسول کی ایذا جس کے عناصر ترکیبی ہوتے ہیں۔ قرآن ہی میں سورۂ احزاب میں ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنۡیَا وَ

الْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا

جو لوگ ستاتے ہیں اللہ کو اور اس کے رسول کو۔ ان کو پھٹکارا اللہ نے دنیا میں اور آخرت میں اور تیار رکھا ہے ان کے واسطے ذلت کا عذاب۔

رحمت حق سے دوری اور اس دنیا میں انسانی رحم وکرم سے محرومی کو قرآن میں کہیں لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ سے اور کسی جگہ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ سے تعبیر فرمایا ہے۔ بات ایک ہے مگر انداز بیان مختلف ہے۔

ملعون کے بارے میں قرآن نے جو ضابطہ بیان کیا ہے بلا شبہ مرتد اس میں داخل ہے۔ مرتد کی ملعونیت پر قرآن کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے۔

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ

ان ہی پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی

لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا

پھٹکارا ہے ان کو اللہ نے دنیا میں اور آخرت میں اور تیار رکھا ہے ان کے واسطے ذلت کا عذاب

اور ملعون کے متعلق قرآن نے جو ضابطہ بتایا ہے

مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا

پھٹکارے ہوئے جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور مارے گئے جان سے۔

قرآن ملعون کو سوسائٹی کے لئے جس قدر خطرناک سمجھتا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہ ملعون کے لئے صرف قتل ہی کو نہیں کہتا بلکہ اس کا مطالبہ بوٹیاں کر دینے کا ہے۔ جن لوگوں کو عربی زبان کے اسالیب سے تھوڑی سی واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ قتل اور تقتیل میں کیا فرق ہے؟

قاتل مومن کے لئے صرف یہ الفاظ بولے جاتے ہیں:۔

مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا

اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان کر تو اس کی سزا دوزخ ہے پڑا رہے گا اسی میں اور اللہ کا اس پر غضب ہوا اور اس کو لعنت کی اور اس کے واسطے تیار کیا بڑا عذاب۔

شرعاً اسی ملعونیت کی بنا پر اس کا قتل واجب ہے اور مقتول کے ولی کا قرآن نے یہ قانونی حق بیان کیا ہے۔

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ

اور جو مارا گیا ظلم سے تو دیا ہم نے اس کے وارث کو زور سو حد سے نہ نکل جائے قتل کرنے میں۔

اس کے علاوہ قرآن حکیم کا پڑھنے والا طالب علم یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ ارتداد کی چادر اوڑھنے والا شخص اپنے عقائد، گفتار اور کردار سے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ اسی معنوی حالت کو قرآن کی زبان میں مشاقہ اور محادہ کہتے ہیں اور یہی میدانِ

عمل میں جب رونما ہو تو محاربہ کہلاتی ہے۔ قرآن نے اللہ اور رسول سے محاربہ کرنے والوں کی جو سزا تجویز کی ہے وہ سورۂ مائدہ میں موجود ہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

یہی سزا ہے ان کی جو لڑائی کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور دوڑتے ہیں ملک میں فساد کرنے کو کہ ان کو قتل کیا جائے یا سولی چڑھائے جاویں یا کاٹے جاویں ان کے ہاتھ، اور پاؤں مخالف جانب سے یا دور کر دیئے جاویں اس جگہ سے یہ ان کی رسوائی ہے دنیا میں اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ مگر جنہوں نے توبہ کی تمہارے قابو پانے سے پہلے تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

بدامنی پھیلانا، فساد کرنا ایسے الفاظ ہیں جن سے کفار کے حملے رہزنی، ڈکیتی، ناحق قتل، لوٹ مار، شہری زندگی کی سب مجرمانہ سازشیں داخل ہوسکتی ہیں۔ لیکن اللہ اور رسول سے محاربہ کا مدلول ارتداد کے سوا کوئی نہیں ہے اس لئے اس آیت کے نہ صرف عموم میں مرتد کی سزا کا ذکر ہے بلکہ یحاربون اللہ ورسولہ کا منطوق ہی ارتداد ہے اور اس کے معنی میں مرتد کے سوا کسی اور چیز کو رکھنا منہ کے مزے کو بگاڑ دینے کے مترادف ہے۔ شائد فقہاء نے جو مرتد کے حربی ہونے کا فیصلہ کیا ہے

اس کا پس منظر قرآن حکیم کی یہی آیت ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ قرآن حکیم سوسائٹی میں مومن ہونے کے بعد ایمان سے گریز پائی کو کسی درجے اور کسی مرحلے پر بھی برداشت نہیں کرتا۔ غضب اور عذاب عظیم کو اس ناپاک طرزِ عمل کا ناگزیر نتیجہ قرار دیتا ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ

جو کوئی منکر ہوا اللہ سے یقین لانے کے پیچھے مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا دل برقرار ہے ایمان پر اور لیکن جو کوئی دل کھول کر منکر ہوا سو ان پر غضب ہے اللہ کا اور ان کو بڑا عذاب ہے۔

قاتلِ مومن کے قرآن نے جو اوصاف ذکر کیے ہیں۔ غضب، لعنت، اور عذاب عظیم۔ اور ان اوصاف کی بنیاد پر اس کی سزا اگر قتل ہی تجویز کی گئی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مرتد کی سزا قتل نہ ہو جبکہ مرتد کے متعلق قرآن کے منہ بولے اوصاف وہی ہیں جو قاتلِ مومن کے یعنی غضب، لعنت اور عذاب عظیم —— اور پھر جس طرح قاتلِ مومن کی سزا قرآن میں الگ بیان نہیں کی گئی بلکہ اسے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى کے عموم میں داخل کیا گیا ہے۔ اسی طرح کیوں نہیں مانا جاتا کہ مرتد کی سزا اگرچہ خصوصًا نام لے کر بیان نہیں ہوتی بلکہ اسے بھی یحاربون اللہ و رسولہ کے عموم میں داخل کر لیا گیا ہے۔

اصول کا طالب علم جانتا ہے کہ اوصاف علت کے درجے میں ہونے

ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جگہ تو لعنت، غضب اور عذاب عظیم سے قاتل مومن کے لئے قتل کی سزا مقرر ہو جائے اور دوسری جگہ وہ ہی اوصاف موجود ہوں مگر ان کو علت بنا کر معلول مقرر کرتے ہوئے بدن پر کپکپی طاری ہو جائے۔

یہ تو قرآن کی ان دستوری سفارشات میں سے ہے جس کو ہر مکتب فکر کے اساتذہ آغازِ اسلام سے اب تک مانتے آئے ہیں۔ کیا آپ جرأت سے خلافِ قرآن یہ کہنے کو تیار ہیں کہ ایمان سے گریز پائی اختیار کرنے والا ملعون، مغضوب علیہ اور معذّب بعذابِ عظیم نہیں ہے؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر اس سے پیدا شدہ نتائج کا انکار کیوں کیا جاتا ہے۔ کیا معانی وحقائق کی پامالی کے وقت میں الفاظ قابلِ اعتنا ہیں اور اللہ کے دین کے مقابلے میں اشخاص قابلِ رحم ہیں؟ قرآن نے تو زنا جیسی اخلاقی شناعت میں ایمان والوں سے مطالبہ کیا تھا اور امید باندھی تھی کہ اللہ پر یقین ہے تو اس کے حدود و احکام جاری کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ مجرم پر ترس کھا کر سزا روک لو یا اس میں کمی کر لو یا سزا دینے کا ایسا غیر مؤثر طرز اختیار کرو کہ سزا سزا نہ رہے۔ قرآن میں ہے :۔

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔

اور نہ آوے تم کو ان پر ترس اللہ کے حکم چلانے میں اگر تم یقین رکھتے ہو اللہ پر اور پچھلے دن پر۔

سزا کے اعتبار سے ارتداد بہر حال ارتداد ہے مگر ذات کے لحاظ سے اس میں کچھ درجات ہیں

اسلام کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ کسی بھی نبوت کا انکار نہ کیا جائے۔ بلا تفریق مکان و زمان حق کی روشنی کا جہاں بھی اور جس جگہ بھی چمکارا پڑا ہے اسے مانا جائے۔ کسی ایک پیغمبر کا انکار بھی سب نبوتوں کا انکار ہے اور یہ خدا اور رسول کے درمیان ناقابل معافی تفریق ہے۔ قرآن نے جس قوت کے ساتھ اس پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے وہ قرآن ماننے والوں کے سامنے ہے ۔ وہ کہتا ہے۔

اولٰئك هم الكافرون حقاً

ایسے لوگ ہی ہیں اصل کافر۔

اسلام کی یہی خصوصیت ہے جس سے قوموں، وطنوں، طبقوں، خاندانوں، اور شخصوں سے نکل کر اسے بین الاقوامی مقام حاصل ہوا ہے۔ ذرا غور فرمائیے۔ کہ یہودی بننے کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ حضرت موسےٰ کی نبوت کا اقرار کرے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ حضرت عیسےٰ کا انکار کرے ۔ عیسائی ہونے کے لئے صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ حضرت عیسےٰ کو مانے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کا انکار کرے۔ برخلاف ایک مسلمان کے کہ اس کی روح نبوت کے باب میں انکار سے آشنا نہیں ہے اس کا نیشنل ماٹو یہ ہے کہ

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ

ہم جدائی نہیں کرتے کسی کے درمیان اسکے پیغمبروں میں سے ۔

بالفاظ دیگر قرآن کے نزدیک ہر نبوت کا اقرار اسلام اور کسی ایک نبی کا انکار بھی پورے اسلام سے انحراف ہے۔ تصویر کا دوسرا رُخ بھی سن لیجئے۔ کہ جیسے ایک نبی کا نبی ہوتے ہوئے انکار کفر ہے ٹھیک اسی طرح کسی غیر نبی کو نبی ماننا بھی کفر ہے۔ نبی نہ ہوتے ہوئے نبی کی ڈینگ مارنا سب سے بڑا ظلم ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ

اور اس سے زیادہ ظالم کون جو باندھے اللہ پر بہتان یا کہے مجھ پر وحی اتری اور اس پر وحی نہیں اتری کچھ بھی اور جو کہے کہ میں بھی اتارتا ہوں مثل اس کے جو اللہ نے اتارا۔

اگر اسلام یہی ہے کہ کسی ایک نبی کا بھی انکار نہ کیا جائے تو فطرتاً یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر نبوت کا سلسلہ قائم رہے تو قرآن کا ایک مکمل ضابطہ حیات ہونے کی حیثیت میں اولین فرض یہ ہے کہ وہ اجرائے نبوت کے متعلق ایک واضح پالیسی کا اعلان کرے مگر قرآن پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اس نے اس ادعاء کے باوجود کہ وہ حیات کا تکمیلی ضابطہ ہے اور اس اعلان کے باوجود کہ ایک نبی کا انکار بھی اسلام سے علیحدگی ہے سارے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی یہ بات کہ جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت باقی ہے صراحتہً یا اشارۃً بیان نہیں کی۔ بلکہ اس کے برعکس توحید کے بعد پوری وضاحت اور پوری صفائی کے ساتھ دو باتوں کو پیش کیا ہے اور وہ یہ ہیں کہ۔

الف:- محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کافۃ للناس ہے۔ اور

ب:- محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وجود کی گود میں خدا کی مرضی کے آخری نمائندے ہیں۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور نبی کو ماننے کی گنجائش نہیں اور یہ ان ضروریات دین میں سے ہے جن کا انکار کفر اور قطعاً کفر ہے۔ اس کا انکار قرآن وسنت

کی کھلم کھلا بغاوت ہے اور پورے اسلام سے ارتداد ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلام کو سب سے پہلے جس ارتداد سے سابقہ پڑا اور جس کے بند و بست کے لئے فوراً بنوت کے شیدا جناب ابوبکر صدیق رضؓ کو خود میدان میں آنا پڑا۔ وہ اسی بنیاد پر اٹھا ہوا ارتداد تھا۔

خیر یہ تو ضمنی بات تھی، بتانا یہ چاہتا ہوں کہ ارتداد کی سزا قتل قرآن کا مطالبہ ہے، سنت کی پکار ہے اور صحابہ کرام کا اس پر عمل ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

بنام جناب خواجہ محمد مسیح صاحب، سیالکوٹ

اس تحریر کی تقریب یہ ہے کہ ایک روز صبح تقریباً گیارہ بجے خواجہ محمد مسیح صاحب اپنے دوسرے رفقاء کی معیت میں جیل وزیٹر کی حیثیت سے تشریف لائے۔ پاس بیٹھ گئے اور مجھ سے یوں مخاطب ہوئے کہ مولانا! قرآن میں تو مرتد کی سزا کا ذکر نہیں ہے اس وقت کی گفتگو تو آئی گئی ہوگئی مگر رات کو سوتے وقت نہا نخانۂ دماغ میں خواجہ صاحب کی بات چٹکیاں لیتی رہی۔ اٹھا اور سب اچھا کی فضا میں بیٹھا تنہا لکھتا رہا۔

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۲ر جنوری ۱۹۵۴ء

معجزہ اگر دلیلِ نبوت ہے تو دلیل اور مدلول میں مطابقت۔ علمائے کرام کی بتائی ہوئی ایک سے زیادہ راہیں، معجزہ کے دلیل نبوت ہونے پر ایک مثال، معجزہ کے دلیلِ نبوت ہونے پر مشہور اہلِ حدیث مولانا محمد حسین بٹالوی کے نام شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا خط۔ اثباتِ نبوت کے لئے صرف معجزہ ہی نہیں بلکہ اور بھی پیمانے ہیں، صحیح بخاری کے آغاز میں ان پیمانوں کا تذکرہ۔ نبی کی تعریف اور حدیث انما الاعمال کے آغازِ کتاب میں لانے کی توجیہ۔ مصادر اور مظاہر کی حقیقت، جیسے نبی افضلِ خلق ہوتا ہے ویسے ہی متنبی ارذلِ خلق ہوتا ہے۔ ہر جھوٹ نمایاں ہوتا ہے، جھوٹی دیانت جھوٹی امانت، جھوٹی نصیحت اور جھوٹی محبت کون سی چیز ہے، جسے جاننے والے نہیں جانتے۔ نبی شناسی کا ایک ذریعہ خود انبیاء کی ترازو ہے، صرف خبر نہیں بلکہ قرائن بھی علم کے لئے کافی ہیں۔

عزیزی العزیز! السلام علیکم

تم نے بارہا معجزے کے دلیل نبوت ہونے کے بارے میں دریافت کیا۔ آج بیٹھے بیٹھے تم یاد آئے اور ساتھ ہی تمہاری باتیں بھی یاد آگئیں۔ جی چاہا کہ تم سے باتیں کروں ـــ مشہور یہی ہے اور کلام کی کتابوں میں لکھا بھی ایسا ہی ہے کہ ـــ الدلیل علی نبوۃ الانبیاء المعجزات ـــ علماءِ علم کلام نبوت کو ثابت بھی اسی راہ سے کرتے ہیں اور ہے بھی یہ پکی بات۔ یہ امر آخر ہے کہ اگر معجزہ

دلیل نبوت ہے تو دلیل اور مدلول میں یا دعویٰ اور شہادت میں مطابقت کیا ہے؟ علمائے کلام نے اس گتھی کو سلجھانے کی مختلف راہیں بتائی ہیں۔ مثلاً یہ کہ معجزہ ہے تو بظاہر ایک مظاہرہ عمل مگر درحقیقت یہ گفتار کے قائمقام ہے کیوں کہ اس راہ سے نبوت کے بارے میں جو علم حاصل ہوتا ہے اس کا زیادہ تعلق ماحول، گرد و پیش اور ان حالات و واقعات سے ہے جن میں معجزے کا ظہور ہوتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے شرمندگی شرمندہ کیلئے، غصہ غصے والے کیلئے کہ دونوں کا وجود لفظوں میں کچھ نہیں ہوتا۔ مگر کیفیت اور حالت جو ان کو پیش آتی ہے وہ اس کے وجود کی شہادت ہے۔ اسی طرح معجزے کا عمل وجود پذیر ہوتا ہے اور یہ عمل اللہ جل شانہٗ کی جانب سے ہوتا ہے۔ ہوتا ہی ہے عادت الٰہیہ کے خلاف اور دعوٰے نبوت کی خاطر ہوتا ہے۔ مدعی نبوت کو معجزے کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ یہ میرا عمل ہے بلکہ وہ تو کھلے لفظوں میں مطالبہ پر بھی کہتا ہے

إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ

جن حالات و کوائف میں یہ مظاہرہ عمل ہوتا ہے دراصل وہ ہی معجزے کو دلیل نبوت بناتے ہیں۔ ان حالات و واقعات کا دباؤ ہی ماننے والوں کو ماننے پر مجبور کرتا ہے۔ علمائے کلام نے اسے ایک مثال کے ذریعے یوں سمجھایا ہے کہ — بادشاہ نے دربار لگایا ہے۔ دربار لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے ہر شخص اپنی اپنی جگہ بیٹھا ہے۔ اچانک بادشاہ کے خواص میں سے ایک شخص درباریوں کے سامنے آ کر حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ شروع کرتا ہے اور لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ میں بادشاہ کا قاصد ہوں اور معتمد ہوں۔ بادشاہ ہی کی موجودگی میں بادشاہ کی طرف رُخ کر کے

کہتا ہے۔ عالیجاہ! اگر میں درست کہہ رہا ہوں تو ان کے سامنے میرے کہنے کے مطابق ذرا عادت کے خلاف کیجئے اور نیچے تشریف لے آئیے۔ بادشاہ اپنے کردار سے اس کی تصدیق کرتا ہے۔ الفاظ کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ مگر بادشاہ کے عمل کا مظاہرہ مقرر کے قاصد ہونے کا حاضرین کو یقین دلاتا ہے اور وہ کھلے بندوں اقرار کر لیتے ہیں کہ ہاں یہ بادشاہ کا قاصد ہے اور اس کا فرمودہ بادشاہ ہی کا فرمودہ ہے۔ دعویٰ و شہادت یا دلیل و مدلول میں مطابقت پیدا کرنے کی یہ راہ علامہ ابوالمعالی نے بتائی ہے۔ قاضی ابوبکر الباقلانی نے اسے الطریقۃ الہرضیۃ کہا ہے۔ اور بقول حافظ ابن تیمیہؒ "امالی" میں ابوالحسن کا میلان بھی یہی ہے۔ احناف میں سے ابومحمد صابونی بھی ان کے ہمنوا ہیں یہ ایک نہیں بلکہ متعدد راہیں سوچی گئی ہیں۔ چند در چند تجاویز ہیں۔ تفصیل دیکھنی ہو تو حافظ ابن تیمیہؒ کی "النبوات" دیکھو اور اجمال چاہتے ہو تو "شرح العقیدۃ الاصفہانیہ" کا مطالعہ کرو۔ اور اگر دل کے ساتھ ذہن و دماغ کا بھی سکون درکار ہو تو اس موضوع پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا وہ گرامی قدر مکتوب دیکھو جو اسی موضوع پر مولانا محمد حسین بٹالوی مدیر رسالہ "اشاعۃ السنۃ" کے نام لکھا گیا ہے۔ بڑی معلومات ہیں۔ مسائل۔ دلائل اور لطائف کا اچھا ذخیرہ ہے۔ میں اس وقت تم سے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ دلیل و مدلول کی مطابقت کی کہانی نہیں اور نہ یہ کہ معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں۔ یہ تو سب ہی جانتے اور مانتے ہیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ صرف معجزہ ہی پیمانہ نہیں ہے یہاں اور بھی پیمانے ہیں جن کی مدد سے نبی کا نبی ہونا معلوم ہوتا ہے جو کہتے ہیں

کہ ــ لا یحصل العلم بالنبوۃ الا بطریق المعجزات دون غیرھا

یہ ان کا ذاتی خیال ہے اور اپنا تجربہ۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ العلم بالنبوۃ یحصل بطرق متعددۃ۔ تم نے "الجامع الصحیح المسند الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ایامہ وسننہ" کا بارہا مطالعہ کیا ہوگا اور کتاب الایمان سے پہلے بڑی لمبی لمبی بحثیں پڑھی ہوں گی مگر کبھی خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ امام صاحب کتاب الایمان سے پہلے بدء الوحی کے عنوان کے تحت مختلف احادیث کیوں لائے ہیں؟ اور اپنے مخاطبوں کے ذہن میں کیا بات اتارنا چاہتے ہیں۔ افسوس کہ خط کا محدود دائرہ تفصیل سے مانع ہے۔ ورنہ جی چاہتا ہے کہ سینۂ بخاری سے ابلی ہوئی علمی طاقت کو ان سینہ چاک دریوزہ گروں کے سامنے رکھوں جو اب سے محروم اپنی خلوتوں میں حضرت امام بخاری پر زبان درازیاں کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ارشادات نبوت کی نگرانی میں ان کی جلالت شان کیا ہے؟ مگر کیا کروں اپنی جہل بضاعتی، علم کی کمی اس راہ میں سنگ گراں ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ امام بخاری نے بدء الوحی کے عنوان میں "رسول اللہ کے اضافہ سے نبوت و رسالت کی تعریف کی ہے۔ تعریف کو مدلل کرنے کے لئے آیات وحی میں سے سورۂ مائدہ کی آیت — انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح و النبیین من بعدہ الخ کا انتخاب کیا صرف یہ بتانے کے لئے نہیں کہ وحی ایک مشترک المعانی لفظ ہے بلکہ یہ سمجھانے کے لئے کہ انبیاء دو طرح کے ہوتے ہیں — مؤسسین۔ مجددین۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تعلق اول الذکر قسم سے ہے۔ نبوت کی تعریف کے بعد ضرورت نبوت بتانے کے لئے مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات لاتے ہیں سمجھایا ہے کہ اقدار ہوں یا اخلاق، اعمال ہوں یا اقوال ان کی قدر و قیمت اور افادیت کا دارومدار صرف دو چیزوں پر ہے ایک روح دوسرے ڈھانچہ۔ روح عمل کو

مصلحۃً اور عمل کے ڈھانچے کو مظاہر کہتے ہیں۔ لہٰذا جیسے اعمال و اخلاق کیلئے مصادر ہیں اللہ کی رضا منظرِ ہے ایسے ہی مظاہر ہیں۔ اللہ جل شانہ کی وحی سے موافقت ہونی چاہیئے اور بس۔ یہ متعین ہو جانے کے بعد کہ رسول وہ ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آئے۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیغمبر ہیں پیغمبر بھی نبیٔ مؤسس۔ اعمال کے مصادر ہیں اللہ کی رضا اور مظاہر میں اللہ کی وحی پیش نظر ہونی چاہیئے۔ اب سمجھانا یہ چاہتے ہیں کہ وحی کیا ہوتی ہے؟ مگر امام تا اسے چھوڑ کر کیفیت والی حدیث لے کر آئے ہیں۔ صرف یہ بتانے کے لئے کہ وحی وہ معلوماتی ذریعہ ہے جو ہمارے ادراک کی گرفت میں نہیں آسکتا ہے۔ یہ اللہ کی دین ہے۔ محنت اور ریاضت سے حاصل نہیں ہوتا۔ ہم کچھ جان سکتے ہیں تو وہ وحی نہیں بلکہ وحی کی آمدی کیفیت ہے اور وہ بھی صرف تمثیل کے درجے میں۔ حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث سے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد آغازِ وحی میں نبوت سے پہلی زندگی ، نبی شناسی کا اخلاقی اور نوعی پیمانہ بتانے کے لئے حدیث عائشہ رضؓ اور شخصی پیمانہ بتانے کے لئے دربارِ ہرقل کی لمبی داستان لاکر کتاب کے دیباچہ کو ختم کیا ہے۔ درمیان میں یہ بتانے کے لئے کہ نبی بننے میں خود نبی کی ریاضت اور محنت کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضؓ کی حدیث لے کر آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی لانا اور وحی کے ذریعہ نبی بننا تو بڑی بات ہے۔ نبوت ملنے اور وحی آنے کے بعد بھی خود وحی کو حافظہ میں اپنی قوت سے محفوظ رکھنا بھی نبی کی دسترس سے باہر ہے۔ میں صرف اشارات کر رہا ہوں اور جان کر کر رہا ہوں۔ کہ خط کا محدود پیمانہ تفصیلات کا متحمل نہیں ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نبی شناسی

کا صرف معجزہ ہی پیمانہ نہیں ہے اور بھی ذرائع ہیں۔ میرے خیال ناقص میں امام بخاری رح نے کتاب کے دیباچہ میں انہی ذرائع اور وسائل کی طرف اشارات کئے ہیں۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں اوروں کا پتہ نہیں ـــ حافظ ابن تیمیہؒ بھی ان اکابر میں سے ہیں جو صرف معجزے ہی کو نبی شناسی کا پیمانہ نہیں مانتے بلکہ اس کے علاوہ دوسرے ذرائع کو بھی پیمانوں کے درجے میں بتاتے ہیں۔ شرح العقیدۃ الاصفہانیہ میں بڑے زور شور سے تفصیلی بحث کی ہے۔ امام غزالی "المنقذ من الضلال" میں اس خیال کے علمبردار ہیں مگر تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جیسے عقل آدمی میں منجملہ دیگر انعامات کے ایک انعام الٰہی ہے۔ جس کے ذریعے ان معقولات کا ادراک کر لیتا ہے جو حواس کی گرفت سے باہر ہیں۔ ایسے ہی نبوت بھی ایک انعام ہے جس کے ذریعے صاحب نبوت ان غیبی حالات کا پتہ لے لیتا ہے جو عقل کی دسترس سے باہر ہیں، فرماتے ہیں۔

فالنبوۃ ایضاً عبارۃ عن طور یحصل فیہ عین لہا نور یظہر

فی نورہا الغیب وامور لا یدرکہا العقل

یہ بتانے کے بعد شخص مقرر کے نبی معلوم کرنے کے لئے احوال و کوائف مشاہدہ، تواتر اور تسامع کو سامنے رکھ کر بتایا ہے کہ ہیں تو یہ ذرائع مگر ان ذرائع سے صرف وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو جانتا ہو کہ نبوت کیا ہے، اگر نبوت معلوم ہو تو ان ذرائع کی مدد سے نبی معلوم ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ۔

اذا عرفت الطب والفقہ یمکنک ان تعرف الفقہاء والاطباء

بمشاہدۃ احوالہم وسماع اقوالہم۔

بات تو بڑی سادی ہے مگر ہے یہ پیمانہ بڑا کٹھن۔ یہ تو ان ہی کے بس کا روگ ہے جو نبی سے پہلے خود نبوت کو جانتے اور پہچانتے ہوں۔ زیادہ سے زیادہ

کچھ خواص ہی ایسے ہونگے جو طریق تصوف کے مطابق امام غزالیؒ کی طرح ایک قسم کا ذوق حاصل کرکے نبوت کو جانیں۔ اور نبوت کی مدد سے نبی کو پہچانیں۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں واقعات کی چھان بین کے لئے سچا اور جھوٹا معلوم کرنے کے کچھ ذرائع رکھتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ نبی کو پہچاننے کا معجزے کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ ہو۔

جیسے یہ حقیقت ہے کہ نبی افضل خلق ہوتا ہے ایسے ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ متنبی ارذل خلق ہوتا ہے۔ عام نگاہیں افضل اور ارذل میں ضرور امتیاز کرتی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ کرنے والوں نے کیا ہے۔

قبیلہ ثقیف کے ایک لیڈر نے نبی شناسی کا یہی پیمانہ بنایا ہے۔ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ثقیف کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کی تو ان کے ایک لیڈر نے آپ کو مخاطب کرکے کہا کہ میں آپ سے کوئی بات نہ کروں گا۔ آپ کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں آپ سچے ہیں تو نبی افضل خلق ہوتا ہے۔ اس لئے آپ بہترین ہیں۔ آپ کے منہ آنا آپ کی توہین ہے۔ اور اگر معاذ اللہ اس کا عکس ہے تو متنبی ارذلِ خلق ہوتا ہے۔ اسے منہ لگانا میری توہین ہے۔ حسان بن ثابت نے کیسی پتے کی بات کہی ہے ؎

لو لم تکن فیہ آیات بینۃ کانت بدیھتہ تاتیک بالخبر

ہے بھی یہ واقعہ کہ جھوٹا بہر حال جھوٹا ہے۔ موٹی سی سمجھ والا آدمی جھوٹے کے جھوٹ، فریب، نادانی اور بدکاری کو تاڑ سکتا ہے اور سچا بہر حال سچا ہے سچائی، علم و دانائی، نیکی و پارسائی اور خیر و تقوے کی اس میں نشاندہی ہو سکتی ہے۔ جو رسالت کے مقام پر کھڑا ہوگا وہ بہر حال لوگوں سے خطاب

کرے گا ۔ کچھ باتوں کا پتہ دے گا ۔ کچھ احکام سنائے گا ۔ کسی ۔ کردار کا مظاہرہ کرے گا ۔ اس کا اپنی باتوں ، اپنے احکام ، اپنے کردار سے صادق ہونا معلوم ہو جائیگا ۔ کیونکہ راستی کا لازم نیکی اور جھوٹ کا خاصہ بدکرداری کے سوا کچھ نہیں ہوتا ۔ یہ خود قرآن ہی کا بیان کردہ پیمانہ ہے ۔

قل هل انبئكم على من تنزل الشياطين تنزل على كل افاك اثيم

يلقون السمع واكثرهم كاذبون

آیت بتاتی ہے کہ شیطانی وحی جھوٹوں پر ہوتی ہے ۔ بدمعاشوں پر آتی ہے راست گوئی ، امانت ، پاک بازی اور خدا ترسی وہ اوصاف اور خوبیاں ہیں ۔ جو بچپن ہی سے آپ کی ذات گرامی میں اس طرح پیوست تھے کہ یگانے ، اور بیگانے مانتے تھے ۔ حتیٰ کہ انہی خوبیوں کی وجہ سے آپ کا لقب ہی معاشرے میں الصادق الامین ہو گیا تھا ۔

نبوت ہی پر کیا موقوف ہے ہر شخص اپنے اپنے ماحول میں سچے اور جھوٹے کو پہچانتا ہے ۔ جھوٹی امانت ، جھوٹی نصیحت اور جھوٹی محبت کون سی چیز ہے جسے سمجھنے والے نہیں سمجھتے اور دیکھنے والے نہیں دیکھتے ۔ پر جھوٹی رسالت کو نہ سمجھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۔ صرف راستی ہی پیمانہ نہیں ہے بلکہ نبی کو پہچاننے کا ایک اور ذریعہ ہے یعنی یہ کہ نبوت جن علوم و اعمال کی دعوت لے کر اٹھتی ہے ۔ ضروری ہے کہ خود صاحب نبوت ان کا اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں علم بردار ہو ۔ ہر ایک شخص اسے اس کی دعوت کی ترازو میں رکھ کر تول سکتا ہے اور تولنے کے بعد فیصلہ کر سکتا ہے کہ اپنے دعویٰ نبوت میں مدعی کہاں تک سچا ہے ۔ نبوت کی تاریخ بتاتی ہے کہ نبوت زمانہ آدم سے آتی رہی ہے اور انسانیت میں خدا کی مرضی کی نمائندگی ہوتی رہی ہے ۔ ہر شخص نبوت اور اس کی دعوت سے واقف

ہے۔ ایسی حالت میں اگر بالفرض اگر ایک شخص نبوت کا دعوے لے کر اٹھا اور معاشرے کو اس نے ایسی دعوت دی جس میں شرک، کفر، فواحش، ظلم وکذب اور بدکاریوں کی ترغیب ہے تو کیا تاریخ نبوت کے کسی طالب علم کو اس کے جھوٹے ہونے میں کوئی شبہ ہوسکتا ہے؟ اور کیا کوئی بیوقوف ایسے شخص سے کسی معجزے کا مطالبہ کر سکتا ہے؟ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ خبر — صرف خبر کے درجے میں اگر اپنی پشت پر قرائن اور دلائل کی قوت رکھتی ہے تو نہ صرف قابل پذیرائی ہے بلکہ علم ویقین کا بھی فائدہ دیتی ہے۔ محققین کا مذہب یہی ہے کہ خبر ہی نہیں بلکہ صرف قرائن بھی علم کے لئے کافی ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

بنام مولوی حافظ محمد شریف قاسمی مالک مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۴ر جنوری ۱۹۵۴ء

داعی کی صدا یہ نہیں ہوتی کہ دے کوئی اللہ کا بندہ بلکہ یہ ہوتی ہے کہ لے کوئی اللہ کا بندہ، دعوت میں زبان کی شیرینی کا جواب عمل کی تلخی سے، موت کو سامنے دیکھکر اسلام کے داعی کا جواب، دعوت خدا کے روٹھے ہوئے بندوں کو منانے کا نام ہے۔ عروہ کی "صاحب یٰسین" سے تشبیہ، عقیدت کا بوجھ مشکل ہی سے اترتا ہے۔ قبیلہ ثقیف کا مسلمان ہونے کے باوجود لات سے پیار، ثقیف کا مطالبہ اور حضور انورؐ کی تردید، حبیب نجار کا دعوتی کارنامہ اور قرآن میں اس کا ذکر، نہ ماننے والوں کو پیغام پہنچانا تبلیغ اور ماننے والوں میں جاننے سمجھنے اور برتنے کے لئے تگ ودو کا نام تذکیر ہے، تبلیغ اور تذکیر دونوں کے لئے جان کھپانے، جان تج کرنے اور محنت ومشقت کرنے کا نام جہاد ہے، صحابہ میں پہلی خاص اور دوسری عام تھی، صحابہ میں تذکیر کا ایک تاریخی بصیرت افروز واقعہ، صحابہ میں فرض کا احساس۔

جی فی اللہ مرزا صاحب! السلام علیکم

ہم مولوی ہیں اور مولوی ہونے کا سادا سا مطلب یہ ہے کہ گویا ہم اسلام آشنا ہیں۔ عوام اس کشتی کے سوار ہیں۔ کہاں جانا ہے؟ یہ جاننا عوام کا کام نہیں ہے کہاں سے جانا ہے؟ یہ جاننا ہمارا کام ہے۔ صحابہ مولوی نہ تھے مگر اسلام کی کشتی کی نگرانی اور اس کی رکھوالی کا کام جس دل سوزی سے کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ اس آئینے میں جب اپنا چہرہ دیکھنا

ہوں تو ندامت سے سر جھک جاتا ہے۔ بوصیری نے شاید میرے ہی حالات کی نقاب کشائی کی ہے ؎

استغفر اللہ من قول بلا عمل ــــ لقد نسبت بہ نسلاً لذی عقم

میں بغیر عمل بات سے اللہ کی جناب میں بخشش مانگتا ہوں۔ تعلق پیدا کر چکا ہوں میں اس کے ساتھ ایک بانجھ سے۔

امرتك الخير لكن ما ائتمرت بہ ــــ وما استقمت فما قولی لك استقم

تجھے میں نے نیکی کا حکم دیا لیکن خود میں نے اس پر عمل نہیں کیا جب میں خود ٹھیک نہیں ہوں تو پھر کیا ہے تیرے لئے میرا کہنا کہ ٹھیک ہو جا۔

ہجرت کا نواں سال اور رمضان کا مہینہ تھا۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تبوک سے مدینے واپس تشریف لا رہے تھے۔ ابھی مدینے نہ پہنچے تھے راستہ ہی میں تھے۔ کہ اچانک پیچھے سے ایک شخص آیا۔ آنے والے کا نام عروہ ہے قبیلہ ثقیف کی وجہ سے ان کو ثقفی کہتے ہیں۔ باپ کا نام مسعود ہے۔ باپ اور خاندان کی نسبت سے عروہ ابن مسعود ثقفی ہیں۔ آئے اور آتے ہی مسلمان ہو گئے اور مسلمان ہوتے ہی مسلمانوں کی خاطر قربانی یا اپنی مسلمانی کی عمل کی دنیا میں شہادت پیش کرنے کے جوش میں جناب رسول اللہ سے درخواست کی کہ مجھے اسلام کے داعی کی حیثیت سے میرے خاندان میں روانہ کیجئے۔ ابن ہشام نے ابن اسحاق کے حوالہ سے درخواست کے الفاظ یہ بتائے ہیں :-

وسألہ ان یرجع الی قومہ بالاسلام

آپ سے درخواست کی کہ مجھے دعوت اسلام دے کر میری قوم میں روانہ کر دیجئے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ عروہ کو حالات کی ناخوشگواری کی

طرف متوجہ کیا اور بتایا کہ ان میں ابھی اس کے لئے فضا سازگار نہیں مگر محبت عقل کی عدالت سے نہیں پوچھتی۔ محبت کا سرجوش ہوش باختگی کا پیغام ہوتا ہے بولے اور بڑے درد سے بولے

انا احب الیھم من ابکارھم

یارسول اللہ میں قوم کے نوجوانوں میں بہت محبوب ہوں۔

ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ واقعی عروہ تھے بھی قوم کے چہیتے اور برگزیدہ — رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے دیوانہ کی منہ مانگی کرامت کو احترام کی نگاہوں سے دیکھ کر قبول کر لیا۔ چل دیئے۔ کچھ قوم میں اپنے مقام کی بلندی سے اُس یہی تھی کہ مخالفت نہ ہوگی۔ ابھی اس پر دعوت اسلام کا پیالہ ہاتھ میں لیکر لوگوں کو پکارنا شروع کر دیا۔ پکار یہ نہ تھی کہ دے کوئی اللہ کا بندہ۔ بلکہ آواز یہ تھی کہ لے کوئی اللہ کا بندہ۔ ایک روز بالاخانے پر کھڑے ہوئے جھروکے سے سینہ باہر کئے لوگوں کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔ کہ سننے والوں نے زبان کی شیرینی کا جواب عمل کی تلخی سے دینا شروع کیا اور ہر طرف سے تیراندازوں نے تیر برسائے قدرت کا کرنا کہ ایک تیر نے عروہ کو پہچان لیا اور ابلیس اپنی تمنا سے ہمدوش ہو گیا۔ خون سے غسل کی حالت اچھے اچھے دلیروں کیلئے ہوش ربا ہوتی ہے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں مگر عروہ کا نشہ اور تیز ہو رہا تھا۔ کسی سرپھرے نے پوچھ لیا۔

ما تری فی دمک؟ (تیرا اپنے خون کے بارے میں کیا خیال ہے)

پورے استقلال اور بھرپور متانت کے ساتھ اسلام کے اس داعی نے جو لوگوں کو جواب دیا۔ وہ سننے اور سمجھنے کے قابل ہے

کرامۃ اکرمنی اللہ بھا وشھادۃ ساقھا اللہ الی (ابن ہشام۔ زاد المعاد)

ایک عزت ہے جس کے ساتھ اللہ نے مجھے معزز بنایا اور شہادت

ہے جس کو اللہ نے میری طرف روانہ فرمایا۔

بتانے والوں نے بتایا ہے کہ اس حادثہ کی اطلاع جب جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو اپنے اسلام کے اس شیدائی کا مقام دنیا والوں کو بتایا اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ دعوت کا کام یعنی خدا کے روٹھے ہوئے بندوں کو خدا یاد کرانا اور خدا ہی کی یاد پر ان کو آمادہ کرنا اللہ جل شانہ کے یہاں بہت قیمتی ہے۔ اتنا قیمتی کہ اس کا اندازہ لگانا بھی دنیا والوں کے بس کا کام نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ —— عروہ نے اپنی قوم میں وہی کام کیا ہے جو "صاحب لیٰسین" نے اپنی قوم میں کیا تھا۔ "صاحب لیٰسین" کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دور کے اشارہ سے عروہ کا اونچا مقام بتایا ہے۔ یہی بات سمجھنے کی ہے۔ ابن ابی حاتم نے عبدالملک بن عمیر کے حوالہ سے واقعہ کے اس حصہ کی ابن اسحاق سے زیادہ تفصیل بتائی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عروہ نے نشۂ توحید سے مخمور ہو کر کس جرأت مندانہ عزیمت سے ماحول کو سر کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ عبدالملک کا بیان ہے، کہ عروہ دعوت کا پیمانہ لے کر چلے۔ راستہ میں لات دیوی تھے۔ آپ نے دونوں کو ابراہیمی اسوہ پر عمل کرتے ہوئے مخاطب کر کے کہا۔

لاصبحنك غداً بما يسوءك

کل کی صبح تیرے لئے میرے ہاتھوں غم کی صبح ہے۔

یہ بات خلوت میں نہیں بلکہ شاہراہِ عام پر ببانگِ دہل کہی تھی قبیلہ ثقیف کے بوڑھے جوان اور بچے موجود تھے۔ ان کے مجمع میں لات کے بارے میں منہ سے یہ بات نکالنی جان کو بیچ کرنے اور جوکھوں میں ڈالنے کے مترادف تھا کون نہیں جانتا کہ یہی ثقیف جب چند ماہ کے بعد مسلمان ہونے کے ارادے سے مدینے پہنچے اور مسلمان بھی ہو گئے۔ مسلمانی کے باوجود انہوں نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مطالبہ کیا تھا۔ ان میں بنیادی مطالبہ یہی تھا۔

ان ید عھم الطاغیۃ وھی اللات لا یھدمھا ثلاث سنین

تین سال تک ہمارے طاغیہ کو کچھ نہ کہا جائے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب سے انکار پاکر منت سے بولے۔ کہ اچھا ایک سال رہنے دیجئے۔ یہ بھی نا منظور ہُوا تو بڑی لجاجت سے بولے کہ اچھا ایک ہی مہینہ چھوڑ دیجئے۔ مگر نبوت نے اس مانگ کو بھی ٹھکرا دیا۔ اندازہ لگائیے کہ جو مسلمان کو قائم رکھتے ہیں لات سے یہ بستگی قائم رکھتے ہیں تو جو کفر کی گود میں پلے ہوئے ہیں انکی عقیدت کا کیا حال ہوگا۔ آہ قربان جائیے۔ عواقب سے بے نیاز عروہ کے ـــ عبد الملک ہی کا بیان ہے کہ عروہ ابن مسعود نے برسرعام دعوت شروع کردی اور اعلانیہ سب کو پکار پکار کر یہ کہتے جاتے۔

ان اللات لا لات وان العزی لا عزی اسلموا تسلموا

منہ سے یہ بات تین دفعہ نکلی کہ تیر اندازی میں تیر کا نشانہ بن گئے۔ واقعہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہُوا تو آپ نے فرمایا۔

ھذا مثلہ کمثل صاحب یٰسین قال یا لیت قومی یعلمون

بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین

اس کی مثال صاحب یٰسین جیسی ہے۔ جس نے اپنی قوم سے کہا تھا۔ اے کاش! میری قوم جانتی کہ میرے رب نے مجھے کیا بخشش عطا فرمائی ہے اور مجھے کیسے عزت والوں میں سے بنایا ہے۔

جن صاحب یٰسین کی طرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا۔ ان سے وہ بزرگ مراد ہیں جن کا قرآن نے سورہ یٰسین میں کار د بار

دعوت کے سلسلے میں ذکر کیا ہے۔ عبداللہ بن عباس نے ان کا نام حبیب اور پیشہ نجّاری بتایا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ کسی بستی میں لوگوں کو خدا کی طرف بلانے کیلئے خدا نے پہلے اپنی مرضی کے دو نمائندے روانہ کئے۔ بستی والوں نے دونوں کو جھٹلایا۔ تو ایک ان دونوں کی امداد کے لئے مقرر ہوا۔ تینوں نے مل کر اور جم کر یہ دعوت پیش کی۔

اِنَّآ اِلَیۡکُمۡ مُّرۡسَلُوۡنَ۔ یقیناً ہم تمہاری ہی طرف بھیجے گئے ہیں۔

لوگوں کا جواب یہ تھا۔ کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ خدا نے کچھ بھی نازل نہیں کیا۔ تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو۔ داعیوں نے خدا کا واسطہ دے کر اپنی صداقت کا یقین دلایا اور کہا کہ ہمارا کام کانوں تک پہنچانا ہے اور بس لوگوں نے ان کو جو جواب دیا یہ تھا کہ تمہارا وجود ہمارے لئے ایک پیغام نحوست بن کر آیا ہے۔ زندگی کا مزہ کرکرا ہو گیا۔ ہر طرف مصیبت ہی مصیبت ہے بستی کی بستی گرفتارِ بلا ہے۔ اگر تم باز نہ آؤ گے تو سنگسار کر دیئے جاؤ گے اور ہمارے ہاتھوں تمہیں دردناک تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔

دعوت دینے والوں نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ نحوست کے اسباب تو تمہاری ہی غلیظ زندگی کے پیدا کردہ ہیں۔ رہا قتل و سنگساری کی دھمکیاں۔ تو کیا یہ اس کا بدلہ ہے کہ تم میں تزکیہ و دعوت کا کام کیا گیا ہے اور تمہیں بتایا گیا ہے کہ ایک اللہ جل شانہ کو مانو۔ اور اپنی زندگی کے سارے نیازمندانہ کاموں میں صرف اسی کی لو لگاؤ۔ سچ یہ ہے کہ تمہاری قومی زندگی کے سارے ہی گوشے عدل و راستی سے ہٹے ہوئے ہیں۔ گفتگو ہی ایک اور ان داعیوں میں اسی مرحلہ پہ تھی۔ اور

پبلک آپے سے باہر ہو کر ان لوگوں کا کام تمام کرنا چاہتی تھی کہ اچانک ایک شخص آیا۔

جاء رجل من اقصا المدینۃ یسعی قال یاقوم اتبعوا المرسلین اتبعوا من لا یسئلکم اجراً و ھم مھتدون

آیا ایک شخص شہر کی طرف سے دوڑتا ہوا کہا لوگو! رسولوں کی پیروی کرو اور لوگو! پیروی کرو اس شخص کی جو تم سے مزدوری نہیں مانگتا۔ اور وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

یہی آنے والا شخص وہ "صاحب یٰسین" تھا جس کی طرف یہاں نبوت سے عروہ کا مقام بتانے کے لئے اشارہ کیا۔ قرآن میں یہاں سے ان کی پُرعزیمت اور جراَت مندانہ دعوت کو بیان کیا ہے۔ قوم کے سامنے جس وقت ان کی زبان پر یہ الفاظ آئے۔

اِنِّیْ اٰمَنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاسْمَعُوْنِ

بیشک میں ایمان لے آیا تمہارے پروردگار پر پس میری بات سنو!

لوگ ان پر حملہ آور ہو گئے۔ پتھر برسائے۔ اس پتھراؤ میں پتھر مارنے والوں کے حق میں ان کی زبان سے جو دعا نکل رہی تھی۔ یہ تھی

اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون

اے اللہ میری قوم کو راہ بتا ان کو پتہ نہیں ہے۔

عروہ کی طرح یہ بھی کرامتہ اکرمنی اللّٰہ بہا سے ہم دوش ہو گئے اور جام شہادت نوش کر گئے۔ اللہ کے یہاں دعوت کے عمل کی قیمت دیکھی۔ تو

بول پڑے

يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ ۔

اے کاش میری قوم جانتی کہ میرے رب نے مجھے کیا بخشش عطا فرمائی ہے اور مجھے کیسے عزت والوں میں سے بنایا ہے۔

عروہ نے بھی وہی فرض انجام دیا جو دعوت کی راہ میں صاحب یٰسین حبیب نے ادا کیا۔

اللہ کے دین کی خاطر مخلصانہ جدوجہد کرنے اور خدا کے بندوں تک خدا ہی کا پیغام پہنچانے اور اسے پھیلانے کیلئے مال، عزت اور جان کو تج کرنے اور بے قیمت بنا دینے کا رواج اسلام میں بہت پرانا ہے اسے ہی اسلام کی اصطلاحی زبان میں جہاد کہتے ہیں۔ اللہ نے اس دعوت کے پہلے ہی دن سے سرانجام دینے کا حکم دیا تھا۔ زاد المعاد میں حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے بتایا ہے

وامرہ اللہ تعالیٰ بالجھاد من حین بعثہ وقال لو شئنا لبعثنا فی کل قریۃ نذیراً فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھاداً کبیراً۔

آپ کی بعثت ہی کے وقت سے اللہ نے آپ کو جہاد کا حکم فرمایا اور فرمایا اگر ہم چاہتے تو البتہ روانہ کرتے ہر بستی میں پیغمبر پس مت کہا مان کافروں کا اور جہاد کر ان سے بڑا جہاد۔

نہیں مانتے، انہیں بتانا اور ماننے پر آمادہ کرنا اسی طرح جو مانتے

ہیں مگر جانتے نہیں انہیں سکھانا اور خدا سے لو لگانے کا ان میں ولولہ پیدا کرنا جہاد ہے۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ نہ ماننے والوں کی خاطر خود ماننے والوں نے کیسی کیسی محنتیں کی ہیں مگر یہ بات بہتوں کو معلوم نہیں کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ماننے والوں میں جاننے اور سمجھنے اور برتنے کا جوش پیدا کرنے کی خاطر کیسی ہمہ گیر اور زور دار کوشش کی ہے۔ اسکے لئے کتنی اچھی اچھی جانوں کو قربان کر دیا۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی سرفروشانہ زندگی میں آج یہ نشانات ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ اس لئے دین سیکھنے سکھانے، سمجھنے اور سمجھانے کے لئے قربانی کرنے۔ وقت نکالنے اور گھر سے بے گھر ہو کر اللہ جل شانہ کی رضا کیلئے در بدر پھرنے کا رواج مٹ گیا ہے۔ آج ہمارے یہاں یہ رواج نہیں ہے۔ اس لئے اسلام ماننے والوں میں اسلام جاننے والوں کی گنتی بھی نہیں۔ ماننے والے تو اس وقت ۷۲ کروڑ ہیں مگر جاننے والے ان میں فی ہزار ایک بھی نہیں۔ فانا للہ والی اللہ المشتکیٰ۔ صحابہ میں سب کے سب جاننے والے تھے۔ جو نہیں جانتے تھے وہ جاننے کے لئے بیتاب تھے اور جو جانتے تھے وہ بتلانے کے لئے بے قرار تھے۔ دین نہ جاننے والوں کو دین جاننے کی خاطر گھر سے بے گھر ہونے کا حکم دیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح دین جاننے والوں سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جو کچھ بھی سینوں میں امانت ہے اسے در بدر پھر کر پہنچا دو۔ یہ پہنچا دینے کا کام صحابہ میں عام تھا۔ اس پہنچا دینے کی قوت ہی سے انہوں نے سراب جہالت میں بھٹکتی ہوئی دنیا کو علم کی دولت سے مالا مال کر دیا ــــ ابن ہشام نے سیرت میں، ابن کثیر نے

البدایہ والنہایہ میں اور ابن القیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے صفر المظفر کا مہینہ تھا اور ۳ھ تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف فرما تھے کہ اسی مہینے میں عضل اور قارہ قبیلہ کے کچھ آدمی نیاز مندانہ انداز سے آئے، بات ہی بات میں آنے والوں نے یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ

ابعث معنا نفراً من اصحابک یفقھوننا فی الدین ویقرئوننا القرآن ویعلموننا شرائع الاسلام۔

ہمارے ساتھ اپنے صحابہ کی ایک جماعت بھیج دیجئے، وہ ہمیں دین کے مسائل سکھائیں گے۔ قرآن پڑھائیں گے اور اسلامی قوانین کی تعلیم دیں گے۔

پہلے یہ جتا دیا کہ اسلام کو تو ہم مانتے ہیں۔ ان فینا اسلاماً۔ جاننے کا کوئی بندھا ٹکا انتظام فرما دیجئے اور اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت ہمارے ساتھ ہمیں دین سمجھانے، قرآن پڑھانے اور اسلامی زندگی کی راہیں بتانے کیلئے روانہ کر دیجئے — یہ تو واقعہ ہے کہ بنانے والوں نے اسلام کی بات جھوٹ موٹ بنائی تھی، مگر سمجھنے اور سوچنے کی چیز یہ ہے کہ مسلمانوں ہی کو مسلمانی کا بھیس بدل کر دھوکہ دینے کی تدبیر انہیں کیسے سوجھی۔

بلا تامل کہا جاسکتا ہے اور ہے بھی یہ واقعہ کہ مسلمان ہونے کے بعد مسلمانوں کو مسلمانی کے تقاضے اور اسلام کی عملی زندگی کے سمجھانے اور بتانے کا چونکہ وہاں عام رواج تھا اور اس مقصد کی خاطر دیہات اور شہروں میں قبیلوں اور خاندانوں میں خاکر دبی کرنا اسلام کے بنیادی مقاصد میں داخل تھا۔ اس لئے اسلام کا چولا پہن کر فریب دینے والوں نے اسی

پاک مشن سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور جھٹ مطالبہ کر دیا کہ اپنے صحابہ کی ایک جماعت ہمارے ساتھ روانہ کر دیجئے اور پھر خود ہی جماعت کی روانگی کے بنیادی مقاصد بھی بتا دیئے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کام صحابہ کی زندگی میں اتنا عام تھا کہ خواص تو خواص بلکہ عوام ۔ نہیں مسلمان تو مسلمان غیر مسلموں کو بھی پتہ تھا کہ مسلمان ہونے کے بعد مسلمانوں کو اسلامی زندگی سمجھانے کے لئے جماعتیں روانہ کرنے کا بدھا ٹکا دستور ہے۔ اس دستور سے آشنا ہونے کے بعد انہوں نے یہ کہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مطالبہ منظور کر لیا اور امام بخاری کی رائے میں دس اور ابن اسحاق کی تصریح کے مطابق چھ آدمیوں کی جماعت روانہ فرما دی۔ اس جماعت میں روانہ ہونے والوں کے نام یہ ہیں۔ مرثد غنوی، خالد لیثی، عاصم، خبیب، زید بن الدثنہ اور عبداللہ بن طارق۔ قصہ تو تاریخ کی کتابوں میں پڑھیئے میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رجیع کے مقام پر پہنچ کر فریب کا پردہ چاک ہوا اور پتہ چلا کہ دھوکہ دیا گیا ہے اور مسلمانی کے نام پر اسلام اور قرآن کی آڑ میں خود اسلام سے کھیلا گیا ہے۔ چار وہیں قتل کر دیئے گئے۔ خبیب اور زید گرفتار ہوئے۔ مکہ کے بازاروں میں فروخت ہوئے۔ صفوان نے حضرت زید کو خریدا اور ان کو قتل کر دیا۔ بیان کرنے والوں نے بیان کیا ہے کہ تنعیم جو حضرت زید کی قتل گاہ ہے مکہ کے بڑے بڑے آدمی وہاں جمع ہوئے۔ ان میں ابوسفیان بھی تھے۔ زید قربان گاہ پر آئے۔ ابوسفیان نے زید کی جان لبوں پر کھیلتی دیکھ کر چاہا کہ زید کے ایمان سے کھیلوں۔ ابوسفیان بولے! زید کیا تم گوارا کرتے ہو کہ اس وقت ہم تمہاری جگہ رسول اللہ کو لے آئیں اور موت کا یہ پیالہ تمہارے لبوں پر نہیں بلکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لبوں پر ہو۔ اور تم اپنے گھر میں مزے سے رہو۔ سچ یہ ہے کہ یہ زید کی

جان کا نہیں بلکہ زید کے ایمان کا کھیل تھا۔ زید نے کیا جواب دیا، وہی جو ایسے موقعہ پر ایمان والے دیتے ہیں — فرمایا رسول اللہ کا یہاں آنا تو بڑی بات ہے۔ بخدا مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ رسول اللہ جہاں تشریف فرما ہیں وہاں ہی ان کے ایک کانٹا چبھے اور میں آرام سے رہوں۔ لوگ سن رہے تھے اور زید کا منہ تک رہے تھے۔ ابوسفیان سے نہ رہا گیا۔ بولا محبت کے متوالے بہت دیکھے ہیں مگر محمدؐ کی محبت کے دیوانوں کی کوئی نظیر نہیں دیکھی۔ حضرت خبیب کچھ عرصہ تو رہے بالآخر ان کیلئے بھی تختہ دار پر جانے کا فیصلہ ہوا۔ ان کو جب قتل گاہ میں لایا گیا تو انہوں نے لوگوں سے جو بات کہی یہ تھی کہ مجھے اتنا وقت دو کہ اپنے رب کی بارگاہ میں دنیا کی زندگی کا آخری اور حقیقی آداب بجا لاؤں۔ یعنی رخصتی کی نماز — اجازت مل گئی آپ نے دو رکعت نماز ادا کی اور فرمایا کہ

لولا ان تظنوا انی انما طولت جزعا من القتل لا
استكثرت من الصلوة (البدایہ)

اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم میری نماز کی لمبائی کو قتل سے گریز سمجھو گے تو میں نماز بہت لمبی کرتا۔

ابن اسحاق کا خیال ہے کہ قتل کے وقت نماز کا یہ طریق خبیب کا جاری کردہ ہے الروض الانف میں علامہ سہیلی نے جو حیرت ناک انکشاف کیا ہے۔ اس سے بھی اس نماز کا ایسے وقت میں مسنون ہونا معلوم ہوتا ہے۔ لیث ابن سعد کا بیان ہے کہ ایک بار حضرت زید ابن حارثہ نے طائف کے کسی شخص سے خچر کرایہ پر لیا اور چل دیئے خچر والا آپ کو لے کر ایک نامعلوم برباد مقام پر پہنچ گیا۔ وہاں مقتولوں

کے پشتنے تھے. بخر والا حضرت زید کو بھی اسی لئے لایا تھا. حضرت زید کے قتل کی تیاری ہوئی تو اس پر کہا۔

دَعنی حتی اصلی رکعتین - مجھے چھوڑو میں دو رکعتیں

پڑھ لوں۔

بولا، پڑھ لیجئے۔ ان سب نے بھی نمازیں پڑھی ہیں۔ جن کی کھوپریاں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کی نماز تو ان کے کام نہیں آئی. حضرت زید کا کہنا ہے میں نے پڑھ لی۔ قاتل میرے قتل کے ارادے سے آگے بڑھا۔ میں نے کہا یا ارحم الراحمین کہ اچانک کسی نے چیخ کر کہا لا تقتلہ (اسے نہ مارو) قاتل ڈرا اور اس نے نظر دوڑائی مگر کوئی نہ تھا. میری طرف پھر قاتل بڑھا۔ میں نے پھر کہا یا ارحم الراحمین۔ پھر وہی آواز آئی مگر آدمی کوئی نہ تھا۔ پھر قاتل بڑھا۔ پھر کہا یا ارحم الراحمین. پھر وہی آواز آئی مگر آدمی کوئی نہ تھا. پھر قاتل بڑھا۔ میں نے پھر کہا یا ارحم الراحمین۔ اچانک نیزہ بردار سوار نے قاتل کا سر تن سے جدا کر دیا اور مجھ سے یوں گویا ہُوا۔ کہ جب تو نے پہلی بار دعا کی تو میں آسمانِ ہفتم پر تھا۔ دوسری دعا میں میں آسمانِ دنیا پر تھا تیسری بار کی دعا میں مَیں یہاں موجود تھا۔

الغرض. زید نے اس موقعہ پر دعا مانگی تھی۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ جب حضرت خبیب کو تختہ دار پر پہنچایا گیا تو ان کے منہ سے جو دُعا نکلی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے نبوت کے زمانے کے مردوں اور عورتوں کے فرائض اسلام، ایمان، صدق، صبر، خشوع، تصدق، صوم، عفت اور ذکر گنا کر

الذین یبلغون رسالات اللہ و یخشونہ ولا یخشون

احدٌ احدٌ اللہ

وہ لوگ، جو اللہ کے پیغاموں کی تبلیغ کرتے ہیں اسی سے ڈرتے ہیں۔ اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

میں الگ کر کے نمایاں جو فرض بتایا تھا۔ اس کی بجاآوری کے لئے ان میں کس قدر سرشاری تھی کہ اس کی خاطر وہ موت سے کھیلنے اور تختہ دار پر پہنچ کر اسی فرض کے احساس میں دبے ہوئے اور ڈوبے ہوئے الفاظ کو اپنی دعاؤں کا سانچہ بناتے تھے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ، حضرت خبیب کی دعا یہ تھی:۔

اللھم انا قد بلغنا رسالۃ رسولک فبلغہ الغداۃ ما یصنع بنا

اے اللہ ہم نے تیرے رسول کا پیغام پہنچا دیا تو صبح کو اپنے رسول تک ہماری آپ بیتی پہنچا دے۔

مجھے اس واقعہ میں بتانا یہی مقصود ہے کہ ان میں فرض کا احساس کس درجہ کا تھا اور روزے، نماز، زکوٰۃ اور حج کرتے ہوئے اس فرض کی ادائیگی کو نہ صرف اپنی زندگی کا ناگزیر تقاضا سمجھتے تھے بلکہ دراصل وہ اس کے بغیر اپنے دین ہی کو ادھورا سمجھتے تھے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

بنام جناب مرزا محمد امین بیگ صاحب محلہ کالج روڈ شہر سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۵ جنوری ۱۹۵۵ء

حقوق اور فرائض کا فرق ۔ اسلام نے مسلمانوں کے سامنے فرائض رکھے ہیں ۔ فرائض کی تلاش ۔ ادائے فرض کا جذبہ ادائے فرض پر اللہ کا شکر ۔ سوچنے کی چیز صرف ادائے فرض ہے ۔

صدیقی ! السلام علیکم ورحمتہ اللہ

یاد آئے ہو ۔ خدا کرے تم اچھے ہو ۔ الحمد للہ ہر سانس بہتر سے بہتر ین گزر رہا ہے ۔ شائد تم تو اپنی جگہ حالات کی ناخوشگواریوں سے مایوس ہو گئے ہو گے ۔ مگر میں الحمد للہ خوش ہوں کہ ادائے فرض کی توفیق نصیب ہوئی ۔

دراصل رنج و غم صرف ان لوگوں کو ہوتا ہے جن کی نظریں عواقب اور نتائج پر لگی ہوتی ہیں ۔ آج ہمارے معاشرے کی سب سے بڑی بیماری یہی ہے ۔ فرد سے لے کر جماعت تک زندگی کا ہر گوشہ اسی کا شکار ہے ۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر شخص کی زبان پر حقوق کی تسبیح ہے حاکم محکوم سے ، محکوم حاکم سے ، باپ بیٹے سے ، بیٹا باپ سے ، شوہر بیوی سے ، بیوی شوہر سے ۔ طلبہ اساتذہ سے ، اساتذہ طلبہ سے مزدور کارخانہ دار سے ، کارخانہ دار مزدور سے ، زمیندار کاشتکار سے کاشتکار زمیندار سے اور زعمائے عوام سے اور عوام زعماء سے غرض کہ دفاتر ، بازار ، کارخانے ، مدارس سے لیکر ایوان حکومت تک ہر شخص

کی زبان پر حقوق حقوق کا نعرہ ہے اور اسی کے سانچے میں سب کے سب اپنے اپنے عقائد، اعمال اور اخلاق کو ڈھال رہے ہیں۔ نگاہوں میں روحانیت بے قیمت اور مادیت قیمتی ہوتی جارہی ہے۔

اسلام نے مسلمان کے نام سے جو سوسائٹی تیار کی تھی۔ وہ دنیا میں حقوق نہیں بلکہ فرائض لیکر آئے تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن ہی فرائض کی تحقیق تھا۔ وہ ہر وقت اس کے جویا تھے کہ ہمارے ذمہ اللہ کے فرائض اور اللہ کے رسول کے فرائض کیا ہیں حاکم محکوم، میاں بیوی، شاگرد استاد، زمیندار، کاشتکار، مزدور، کارخانہ دار، لیڈر اور عوام سب کے سب اپنے اپنے فرائض کی تلاش میں رہتے تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ فرائض معلوم ہو جانے کے بعد ہر شخص ادائے فرض کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ ادائے فرض ہی فخر نہیں بلکہ اپنے مولا کے سامنے اس توفیق پر سربسجود ہو جاتا۔ نتیجہ یہ کہ کمزوروں کی ہمدردی، غم گساری، ناداروں کی حاجت روائی، بیماروں کی بیمار پرسی، بھوکوں اور پیاسوں کی دلجوئی، ناتوانوں پر رحم معاشرے میں عام تھا۔ اولاد والدین کی خدمت، والدین اولاد کی تربیت کو، اساتذہ طلبہ کی تعلیم کو، طلبہ اساتذہ کی اطاعت کو، سربراہانِ مملکت شہریوں کی حیوانی اور انسانی ضرورتوں کی کفالت کو اور شہری سربراہوں کی فرماں برداری کو اپنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور اس کی ادائیگی میں اپنی جان تج کر دیتے تھے حسنِ ظن دلوں میں الفت، ہمدردی، طاعت، خیرات، کمتروں کی امداد بازار کی بے قیمت جنس تھی۔ جب چاہو جہاں سے چاہو، جتنی

چاہو لے لو۔

لیکن آہ آج معاشرے میں حقوق حقوق کی رٹ کے نتیجہ میں یہ تمام خوبیاں کہیں کسی قیمت پر نہیں ملتی ہیں، اور اس کی جگہ بدگمانی، بدکلامی، بدنگاہی جیسی گندی اور ناپاک جنس عام ہے۔ باپ بیٹے سے، بیٹا باپ سے، حاکم محکوم سے۔ محکوم حاکم سے، استاد شاگرد سے، شاگرد استاد سے، کارخانہ دار مزدور سے، مزدور کارخانہ دار سے، ڈاکٹر بیمار سے، بیمار ڈاکٹر سے، امام مقتدی سے، مقتدی امام سے اور بالآخر مرید شیخ سے اور شیخ مرید سے بدگمان ہے۔ اور صرف بدگمان نہیں بلکہ ایک دوسرے کے حق میں ہر ایک بدکلام ہے۔ سب ایک دوسرے کو بے محابا اور بے تحاشا برا بھلا کہہ رہے ہیں۔

آج بھی اگر ہم میں حقوق سے ہٹ کر فرائض کی لگن میں پیدا ہو جائے تو ہماری زندگی آج ہی بدل سکتی ہے۔

ختم نبوت کے نام پر جو کچھ ہم نے کیا یہ ہمارا فرض تھا۔ اب ہمارے سوچنے کی چیز صرف یہ ہے۔ کہ ادائے فرض کی ہم کو توفیق ملی یا نہ ملی۔ اگر مل گئی ہے تو اس پر ہمیں اپنے مولا کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور بس۔ یہ کوئی حق نہیں ہے جس کے نہ ملنے پر ہمیں کوئی شکایت ہو۔ جو کچھ ہمارا فرض تھا۔ اللہ کی توفیق سے وہ ادا ہو گیا۔ انہوں نے اگر ادائے فرض میں کوتاہی کی ہے۔ تو اس کی باز پرس ان سے ہو گی اور وقت آ رہا ہے کہ ان کو اس پر ندامت ہو گی۔ مگر

اس وقت یہ ندامت مفید نہ ہوگی۔ اس لئے نتائج سے ہٹا کر صرف فرائض پر نظر رکھیئے یہی ایک مسلمان کا کام ہے۔ لیجئے اب ملاقات ختم۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

بنام شیخ محمد حسین صاحب صندل ممبر یونین کونسل نمبر ۴ محلہ رنگپورہ سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۷ر جنوری ۱۹۵۴ء

الطفیل کی شخصیت ۔ دعوت کا پر آشوب زمانہ ۔ الطفیل کی مکہ میں آمد ۔ وفد قریش کی الطفیل سے ملاقات ۔ ملاقات کا پس منظر طفیل کا غیر ارادی طور پر قرآن سننا اور لٹو ہو جانا ۔ طفیل کی حضور انورؐ سے ملاقات ۔ دعوت اسلام ۔ معوذتین کی تلاوت اور طفیل کا اسلام کے لئے شرح صدر ۔ مسلمان ہوتے ہی اسلام کے داعی راہ دعوت کی تنگنائی ۔ ابوہریرہ طفیل کی دعوتی محنت کا پہلا نتیجہ ہے ۔ دعوت کی راہ میں رکاوٹیں اور داعی کی مایوسی ۔ نبوت کی تسلی بخیر کے داعی کو خود خیر الناس ہونا چاہیئے ۔ دعوت اور دعایت ۔

بکری ۔ زاد مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

دل بے چین ہو کر رہ جاتا ہے ۔ جب تاریخ میں اسلام کی خاطر صحابہ کی قربانیاں پڑھتا ہوں ۔ شخص نہیں بلکہ ایک عظیم المرتبت شخصیت ہے ۔ الطفیل نام ہے ۔ دوس قبیلہ سے نسبی تعلق ہے ۔ ذوالنور لقب ہے ۔ ابن اسحاق نے سیرۃ میں اور ابن سعد نے طبقات میں جو تفصیلات بتائی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ بہت با اخلاق ، ہوشیار اور بلند پایہ شاعر تھے ۔ نبی کریم سے ابھی ملاقات مکہ ہی میں ہوئی تھی ۔ جس سال یہ مکہ میں آئے وہ نبوت اور دعوت نبوت کا بڑا ہی پر آشوب سال تھا ۔ پر آشوبی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے ۔ کہ ان کی آمد پر قریش نے ان سے ملاقات کے لئے ایک وفد تیار کیا ۔ ملاقات کا پس منظر اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ طفیل کو کاشانۂ نبوت پر جانے سے

روکا جائے۔ وفد طفیل سے ملا اور بیٹھتے ہی یوں برسا۔

"جناب آپ یہاں تشریف لائے۔ آپ کو مقامی حالات کا پتہ نہیں ہے۔ دیکھئے اس آدمی نے ہمارا ناطقہ تنگ کر دیا ہے۔ ہم میں پھوٹ ڈال دی ہے۔ ہمارے نظم کو پامال کر دیا۔ منہ سے نکلی ہوئی بات جادو اثر ہے۔ باپ بیٹے کو، بھائی بھائی کو، شوہر بیوی کو چھوڑ رہا ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ آپ اور آپ کی قوم پر اثر نہ پڑ جائے۔ اس لئے نہ ان سے بات کیجئے اور نہ ان سے کچھ سنیئے۔"

خود طفیل کا بیان ہے کہ قریش نے میرے اتنے کان بھر دیئے۔ کہ میں اپنی جگہ طے کر چکا تھا کہ نہ آپ سے بات کروں گا اور نہ آپ سے کچھ سنوں گا۔ حد ہے کہ میں مسجد میں گیا۔ تو اس خطرہ کے پیش نظر کہ کہیں کان میں نبوت کی آواز نہ پڑ جائے۔ میں نے کان میں روئی رکھ دی۔ میں چاہتا تھا کہ دہانِ نبوت سے نکلی ہوئی بات کان میں نہ پڑ جائے۔ مگر قدرت کے کھیل عجیب ہیں۔ ایک روز صبح تڑکے مسجد میں گیا۔ دیکھتا ہوں کہ کعبہ کے پاس ذاتِ نبوت کھڑی نماز میں مشغول ہے۔ میں بھی آپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اللہ جل شانہ نے یونہی کچھ باتیں کان پر ڈالیں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ کیا ہوا۔ اب میرا فیصلہ یہ تھا کہ یہ بلند پایہ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ اپن بھی شاعر ہیں۔ سنیں تو سہی۔ کام کی بات ہو گی مان لیں گے ورنہ چھوڑ دیں گے۔

طفیل کہتے ہیں کہ میں مسجد میں ہی ٹھہرا رہا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے گئے۔ میں بھی پیچھے ہو لیا۔ آپ اندر تشریف لے گئے

میں بھی آپ کے ساتھ گھر پہنچ گیا سب سے پہلی بات جو طفیل نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر کہی یہ تھی۔ جناب عالی۔ آپ کی ذات اور آپ کی دعوت کے متعلق میرے سے بہت کچھ کہا گیا۔ لوگوں نے اتنا ڈرایا تھا کہ میں نے اپنے کانوں کو آپ کی آواز کیلئے بند کر لیا تھا۔ اب خدا نے مجھے آپ کی آواز سنا دی ہے فرمایئے کہ آپ کیا کہتے ہیں؟ رسول اللہ نے دعوت اسلام پیش کی اور کچھ قرآن سنایا۔ ابوالفرج اصفہانی نے بحوالہ ابن کلبی بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے سورہ اخلاص اور معوذتین کی تلاوت کی۔ سننے کے بعد طفیل سے نہ رہا گیا۔ ان کا تاثر خود ان کے الفاظ میں یہ تھا۔

فلا واللہ ما سمعت قولاً قط احسن منه ولا امراً اعدل منه

خدا کی قسم! میں نے اس سے بہتر اور اس سے زیادہ انصاف والی بات کبھی نہیں سُنی۔

اس کے بعد کیا ہوا خود کہتے ہیں کہ میں مسلمان ہو گیا۔ اور شہادت حق کا فرض انجام دیا۔ مسلمان تو آج بھی ہوتے ہیں۔ سننے کی چیز یہی ہے۔ اس عہد میں اسلام قبول کرتے ہی ایک مسلمان کو لا الٰہ الا اللہ کی عائد کردہ ذمہ داریوں کا احساس کتنا ہوتا ہے۔ وہ اس کہنے کے ساتھ ہی یہ سمجھتا ہے کہ بس اب میری زندگی میری نہیں ہے۔ طفیل نے بھی یہی سوچ لیا۔ بولے یا رسول اللہ۔ قوم میں میری چلتی کا زمانہ ہے۔ ان میں واپسی اب طفیل کی واپسی نہیں بلکہ داعی اسلام کی واپسی ہے۔ خدا سے دعا کیجئے کہ حق جل شانہ مجھے کوئی نشانی مرحمت کر دے جو میرے لئے دعوت کا کام آسان اور سازگار ہو جائے۔ رسول اللہ نے دعا دی اور فرمایا:-

اللھم اجعل لہ اٰیۃ   اے اللہ اس کیلئے کوئی نشانی بنا دے

طفیل دہان نبوت سے نکلی ہوئی دعا کی سوغات لے کر وہاں سے چل دیئے۔ اب ان کا رُخ داعی کی حیثیت سے قوم کی طرف تھا۔ آبادی کی طرف راستہ پر چل رہے تھے۔ راستہ کا کچھ محل وقوع ایسا تھا کہ دو پہاڑوں کے درمیان سے ہوتا ہوا بلندی سے نیچے جا کر دوس کی آبادی سے ملتا تھا۔ طفیل اپنی آبادی کی طرف چلنے کے لئے اس راستہ پر پہنچے تو پیغمبر کی دعا پیشانی کا نور بن کر چمک گئی۔ طفیل کا رُخ آبادی کی طرف تھا۔ ابن عبدالبر کا کہنا تھا۔ کہ طفیل کا جگمگاتا چہرہ رات کی تاریکی میں پوری آبادی دیکھ رہا تھا

یترائی الحاضر فی ظلمۃ اللیل

رات کی تاریکی میں آبادی دیکھ رہے تھے

طفیل کہتے ہیں میں نے فوراً اللہ جل شانہٗ سے دعا کی کہ:۔

اللھم فی غیر وجھی   یا اللہ چہرے پر نہیں کسی اور جگہ پر!

یہ بھی طفیل ہی نے بتایا ہے کہ دعا کیوں مانگی۔ فرماتے ہیں کہ اس اندیشہ سے دب کر کہ مبادا کہیں لوگوں کے منہ سے نکل جائے کہ دین سے نکل کر صورت بگڑ گئی۔ ادھر دعا ہوئی اور روشنی کا چمکارا کوڑے میں آگیا۔ اب طفیل جا رہے تھے کہ راستہ اتر رہے ہیں اور ان کے کوڑے کا چمکارا آبادی کے تماشائی دیکھ رہے تھے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ اونٹ پر سوار تھے اور کوڑا قندیل کا کام دے رہا تھا۔ اسی وجہ سے آپ کا لقب ذوالنور ہے گھر پہنچے رات گزر گئی۔ صبح اٹھتے ہی دعوت کا کام شروع کیا۔ مگر پہلے پرائے نہیں اپنے اپنوں میں بھی ماں باپ اور اہلیہ کے سامنے اسلام کی سوغات رکھ دی۔ سب سے پہلے ابا ملے۔ بولے۔ ابا ذرا پرے رہیئے۔ رشتۂ ایمان رشتۂ رحم سے زیادہ

پیارا ہے ۔باپ بولے بیٹا کیوں؟ بولے اس لئے کہ اسلمت وتابعت دین محمد۔

ابا نے کہا ۔بہت اچھا لیجئے فدینی و دینک ۔بولے جائیے غسل فرمائیے اور کپڑے پاک پہنئے ۔پھر تشریف لائیے ۔طفیل کے ابا نے غسل کیا ۔کپڑے صاف کئے ۔واپس آئے ۔طفیل نے اسلام کی سوغات پیش کی مسلمان ہو گئے ۔بیوی سے بھی یہی حالات پیش آئے ۔ان سے غسل کرنے کو کہا ۔مگر داعی حکیم ہوتا ہے اس لئے بولے ذی الشریٰ کے خطیرے میں نہا کر آؤ ۔ ابن ہشام کا کہنا ہے کہ دوس قبیلہ کے بت کا نام ہے ۔اسی کے نام سے خطیرہ تھا ۔خطیرے میں پانی کا ایک چشمہ تھا ۔بیوی بولی بچوں کا کیا بنے گا ۔طفیل نے موحدانہ بے باکی سے کہا ۔کچھ نہیں ۔اس کا میں ذمہ دار ہوں ۔گئیں ،غسل کیا ۔آئیں اور اسلام کی دولت سے مالا مال ہو گئیں ۔طفیل نے اس کے بعد قبیلہ دوس میں دعوت کا کام شروع کیا ۔مگر سوسائٹی نے طفیل کی دعوت کو دعوت نہیں للکار سمجھا ۔ناقدری کے ہتھیاروں سے طفیل کا مقابلہ کیا ۔ابن کلبی کا خیال ہے ایک شخص کو مستثنیٰ کر کے کسی نے بات نہ مانی ۔یہی مستثنیٰ شخص ... ابو ہریرہ کے نام سے پہچانی جاتی ہے (مگر) ترجیح نہیں ہے ۔مگر قیاس یہی چاہتا ہے ۔ طفیل ان ہی کو لے کر رسالت مآب کی خدمت میں پہنچے اور دوس قبیلہ کی شکایت کرتے ہوئے انکے لئے بد دعا کی درخواست کی ۔رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھائے اور بد دعا کی جگہ جو صدا زبان پر آئی یہ تھی ۔

اللھم اھد دوسًا ۔۔۔۔۔ اے اللہ دوس کیلئے ہدایت کے دروازے کھول دے

عمل سے بتا دیا کہ داعی کے ملنے کی چیز برائی نہیں بلکہ اچھائی ہے داعی جو الخیر کی دعوت لے کر آتا ہے اسے خود خیر الناس ہونا چاہئیے ۔فعل خیرات ہی

اس کا پیشہ ہونا چاہیئے اور اس کو خدا سے الخیر ہی مانگنی چاہیئے ۔ اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی ۔ اپنے لئے کہیئے :۔

اجعل الحیاۃ زیادۃ لی فی کل خیر (مسلم)

اے اللہ زندگی کو ہر خیر میں زیادتی کا ذریعہ بنا دے ۔

اور طفیل کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فہمائش کی ـــ جاؤ دعوت دو اور نرمی برتو ۔ بخاری میں جو بحوالہ ابوہریرہ طفیل کی آمد کے ساتھ اسی دعا کا تذکرہ ہے ۔ وہ شائد اسی وقت کی ہے ۔ ابوہریرہ ہی واقعہ بیان کرنے والے ہیں ۔ قیاس بھی کہتا ہے کہ ابوہریرہ طفیل کے ساتھ تھے ۔ طفیل نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دوس کے متعلق دعا سنی تو بول پڑے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو نہ چاہتا تھا ۔ نبوت بولی ، اے طفیل جہاں تو دعوت کا کام کر رہا ہے ۔ اس زمین پر تیرے جیسے بہت ہیں پھر دوس میں آئے اور ہدایات کی سرشاریوں کے ساتھ آئے کام کیا اور خوب کیا ۔ تصریح نہیں مگر واقعات کی ترتیب یہی کہتی ہے کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی دعا رنگ لائی ۔ بہت سے گھرانوں نے طفیل کی پکار پر لبیک کہی انہیں لبیک کہنے والوں میں حاکم دوس کے صاحبزادے حضرت جندب بھی تھے ۔ حضرت طفیل کہتے ہیں ۔ اب میں مدینے آیا ۔ تو دوس کے ۸۰ گھرانے میرے ساتھ تھے بدر احد اور خندق گذر چکا تھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خیبر میں تھے ۔ میں دعوت کی کمائی لیکر خیبر میں آپ سے جا ملا ۔ وقت گذر گیا حالات نے ایک نئی کروٹ لی مکہ فتح ہوا اور دعوت کی بنائی ہوئی زمین پر دعایت کی گاڑی چلنے لگی یعنی اسلام نے افراد کی اخلاقی اور اعتقادی اصلاح سے آگے قدم بڑھا کر سیاست وقانون میں رکھ دیا سب ہی کام کر رہے تھے اور ہر شخص اپنا

اپنے فرض کی تلاش میں تھا۔ ایک روز یہی طفیل بولے یا رسول اللہ ذی الکفین کو ڈھانے اور جلانے کے لئے مجھے مقرر کیجئے۔ ذی الکفین دوس بستی کا ایک بت تھا۔ حضرت جندب کے والد اس کے متولی تھے حکم ملنے پر روانہ ہو گئے۔ آگ لگاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے۔

یاذا الکفین لست من عبادکا میلادنا اقدم من میلادکا
انی حششت النار فی فوادکا

اے ذوالکفین! میں تیرے پرستاروں میں سے نہیں ہوں۔ ہماری تاریخ پیدائش تیری پیدائش سے قدیم ہے۔ میں نے تیرے دل میں آگ بھر دی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک مدینے ہی میں قیام کیا۔ فتنہ ارتداد میں حضرت ابوبکر کے ساتھ کام کیا اور یمامہ میں شہید ہو گئے۔
فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

بنام جناب میجر اللہ دتا صاحب محلہ احمد پورہ سیالکوٹ شہر

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۳۰ر جنوری سنہ ۱۹۵۴ء

حدیث الدنیا سجن المؤمن کی تشریح۔ مسلمان کے لئے دنیا کے جیل خانہ ہونے کا مشہور مطلب اور احادیث کی روشنی میں اس کی تردید۔ یزدگرد کے دربار میں ربعی ابن عامر کی تقریر۔ محدثین پر حرف گیری گمراہی اور فقہاء پر بے اعتمادی بے راہ روی ہے۔

صدیقی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

یہاں کے در و دیوار آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں نہیں بلکہ آپ کے فراق میں۔ مکر کے نہیں۔ ہمدردی کے آنسو بہاتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی کچھ نہ کچھ آپ کی داستان سنا ہی دیتا ہے۔ آج مسٹر غلام محمد نے آپ کی کہانی چھیڑ دی۔ آپ کی آمد، آپ کی رہائش اور آپ کی روانگی غرض آپ کی جیل یاترا کا ایک ایک گوشہ سنایا اور خوب مزے لے لے کر سنایا۔ میں بار بار اپنی عدیم الفرصتی کو درمیان میں آڑ بنا کر پیش کرتا ہوں مگر وہ سنائے ہی جاتے ہیں اور روزانہ بعد نماز عصر کھانے پر آپ کا افسانہ چھیڑ دیتے ہیں۔ خوب آدمی ہیں مگر حرفوں کے بنے ہوئے ہیں۔

دراصل ایک مسلمان کی پوری زندگی اس حیثیت سے جیل کی زندگی سے مشابہ ہے کہ اس میں بے راہ روی آزادی اور خود مختاری کو ختم کر کے قانون کی پابندی کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ صحیح مسلم میں جو یہ حدیث آئی ہے کہ الدنیا سجن المومن وجنۃ للکافر تو اس کا مطلب یہی ہے کہ دنیا میں کافر کی زندگی آزاد بے راہ روی اباحت مطلقہ اور خود رائی کی ہے اور مسلمان اس دنیا میں اللہ کی بندگی، پیغمبر کی طاعت اور اس کی پیروی لے کر آیا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان دنیا میں ہجوم نوازل، انبوہ زلازل اور احاطہ حوادث کے لئے آیا ہے اور کافر سرفرازیوں، بالادستیوں نعمتوں

اور آسائشوں سے ہمدوش ہونے کے لئے آیا ہے مسلمانوں کی تاریخ اس کی تکذیب کرتی ہے یاد پڑتا ہے کہ ربعی ابن عامر نے یزدگرد کے دربار میں مسلمانوں کے قاصد کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

> اللہ نے ہمیں اس لئے روانہ فرمایا کہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکالکر روشنی میں لائیں۔ انسانوں کی بندگی چھڑا کر خدا کی بندگی پر آمادہ کریں۔ انکو دنیا کی تنگی سے نکال کر کشادگی کی طرف لائیں اور مذاہب کی کجروی اور بے اعتدالی سے نکال کر اسلام کی صراط مستقیم پر لگائیں۔

یقین فرمایئے اللہ نے مسلمانوں کو کافروں کی زمین، مکانات اور مال و اسباب کا وارث بنایا ہے اور ایسی زمین کا وارث بنایا ہے جس پر وہ ابھی چلے نہیں "واورثکم ارضھم ودیارھم واموالھم وارضا لم تطؤوھا" انہیں زمین کی خلافت دی ہے اور اقتدار عطا کیا ہے۔

حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تم نے پڑھا یا سنا ہوگا کہ

ان اللہ زوی لی الارض فرأیت مشارقھا ومغاربھا وان امتی سیبلغ ملکھا ما زوی لی منھا واعطیت الکنزین الاحمر والابیض (او کما قال) (ترمذی)

اللہ نے میرے لئے زمین کو سمیٹا تو میں نے مشرق اور مغرب کو دیکھ لیا میری امت کی حکومت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک میرے لئے زمین سمیٹی گئی اور مجھے سرخ و سفید یعنی سونا اور چاندی کے دونوں خزانے دیئے گئے

اور یہ ارشاد بھی تم نے سنا ہوگا کہ:۔

اذا ھلک کسری فلا کسری بعدہ واذا ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ والذی نفسی بیدہ لتنفقن کنوزھما فی سبیل اللہ او کما قال (ترمذی)

جب کسری نہ رہیگا تو پھر کوئی کسری نہ ہوگا۔ اور جب قیصر ختم ہو جائے گا۔ تو پھر کوئی بھی قیصر نہ ہوگا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے تم ان دونوں کے خزانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کروگے۔

سوچئے کہ کیا ان ارشادات کی موجودگی میں کوئی شخص یہ سوچ بھی سکتا ہے کہ دنیا کے مسلمان کے لئے جیل ہونے کا مطلب اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔

دراصل لوگ دہانِ نبوت سے نکلی ہوئی بات خود نہیں سمجھتے اور اس کے نتیجے میں یا تو ارشاد ہی کا انکار کر دیتے ہیں اور بلب کی روشنیوں اور پنکھوں کی ہواؤں میں بیٹھ کر محدثین پر حرف گیری کرتے ہیں یا پھر جنہوں نے ارشادات کے معانی کو سمجھا ہے یعنی فقہا ان کے علم کو اپنے خود ساختہ گزوں سے ناپنے لگتے ہیں۔ اول سر تا سر گمراہی اور دوسرا سر تا سر خود رائی اور بے راہ روی ہے۔

اچھا اب آنکھوں میں نیند بھر آئی ہے دیکھتا نہیں بلکہ زور سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لالٹین کی روشنی بھی مدہم پڑ رہی ہے اسے بھی تیل کی کمی کی شکایت ہے۔ جیل سے تیل تھوڑا ہی ملتا ہے۔ گھر سے تیل منگایا تھا جس میں جو کچھ تھا وہ لالٹین کی نذر کر چکا ہوں۔ شاید کل کو آجائے۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

بنام جناب شیخ احمد دین صاحب سابق صدر جمعیۃ انصار الاسلام محلہ احمد پورہ سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ
۲ر فروری ۱۹۵۴ء

یزید بن رومان کی روایتی تحقیق۔ تراویح کا اختلاف کا بنیادی نقطہ۔ مرسل حدیث کی تعریف۔ مرسلات مؤطا کا حکم۔ مرویات مرسلہ کی آئینی حیثیت۔ تابعین کو اپنے بزرگوں پر ایسا ہی اعتماد تھا۔ جیسے ہمیں بخاری اور مسلم پر۔ روایات مرسلہ میں محدثین کا مذہب۔

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اس وقت تم یاد آگئے۔ عشاء کی نماز سے فراغت کے بعد چارپائی پر بیٹھا ہوں۔ یکایک دماغ میں تمہارا خیال آیا اور خیال کے ساتھ دل میں تمہاری یاد چٹکیاں لینے لگی۔ اور یکدم تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا تو تمہاری مؤطا امام مالک کی یزید بن رومان کی روایت تنقید یاد آگئی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تم نے ایک بار کہا تھا۔ کہ مؤطا امام مالک کی یہ روایت مرسل ہے۔ جی چاہا کہ آج کی صحبت میں تمہیں یہی بتاؤں۔ پہلے روایت سن لو۔

عن مالك عن يزيد بن رومان قال: كان الناس يقومون في زمان عمر بن الخطاب في رمضان بثلاث وعشرين ركعة۔ او كما قال۔ (مؤطا)

یہ جمہور اور ائمہ اربعہ کا تراویح کے زمانہ عمر میں بیس ہونے کے لئے استدلال ہے اگرچہ زمانہ عمر میں تراویح کا بیس ہونا اس پر موقوف نہیں ہے کیونکہ یہ مسئلہ امت میں اتفاقی ہے کہ زمانہ عمر میں تراویح بیس تھی یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس کا منکر کوئی نہیں اور اس میں امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں۔

نواب صدیق حسن خان قنوجی ہوں یا امیر محمد بن اسماعیل یمانی حافظ محمد بن ابراہیم

یمانی ہوں یا قاضی شوکانی یمانی سب اس پر متفق ہیں۔ افسوس کہ میرے پاس کتابیں نہیں ہیں۔ ورنہ ایک ایک کے متعلق تصریحًا بتا دیتا کہ سب زمانہ عمر میں بیس ہونے کے اقراری ہیں۔ نواب صدیق حسن خان کے الفاظ تو کوذۂ ذہن میں اب بھی محفوظ ہیں۔ حکیم احمد دین نقشبند نے ایک بار اپنی حیات میں اپنی کچھ کتابیں مدرسہ کو منتقل کی تھیں۔ ان میں نواب صاحب رح کی ایک کتاب ہدایۃ السائل الی ادلۃ المسائل بھی آئی تھی۔ یہ نواب صاحب رح کا فتاویٰ ہے۔ اس میں لکھا ہے۔

فالحاصل انہ ماصح عنہ صلے اللہ علیہ وسلّم و انما ھو من سنن عمر

قال العسکری اول من قیام رمضان عمر سنۃ اربعۃ عشر۔

چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں۔

مقصود آنکہ یازدہ از آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مروی گشتہ و بست

رکعات زیادت عمر بن الخطاب است۔

یہ یا اسی طرح کی عبادت ہے۔

الغرض زمانہ عمر میں تراویح کا بیس ہونا مسئلہ اختلافی نہیں ہے۔

اختلاف تو صرف اس میں ہے۔ کہ خلافت کے اعمال دین میں حجت ہیں یا نہیں جمہور اہل السنت صحابہ کے اعمال کو حجت اور ان کی سنت کو سنت اور ان کو معیار حق مانتے ہیں مگر ایک شر ذمہ قلیلہ کا دعویٰ یہ ہے۔ کہ صحابہ کے اعمال دین میں حجت نہیں ہیں۔ یاد پڑتا ہے کہ مشہور اہلحدیث عالم امیر محمد بن اسماعیل یمانی نے سبل السلام میں لکھا ہے کہ خلیفہ راشد کو کوئی ایسا طریقہ رائج کرنے کا حق نہیں ہے۔ جس پر حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم عمل پیرا نہ تھے۔

اگر چہ یہ ان کی غلطی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ ایک سے زیادہ مسائل میں جمہور اہل السنت سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ مگر بنائے نزاع یہی ہے۔ یہ نہیں کہ زمانہ

عمر میں تراویح بیس تھی یا نہیں۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ زمانہ عمر میں تراویح کا بیس ہونا اس روایت پر موقوف نہیں ہے۔ اس کی تکذیب تو محدثین، مورخین کی تکذیب ہے۔ جہاں تک اس روایت پر تمہاری تنقید کا معاملہ ہے سردست میں اسی کو سلجھانا چاہتا ہوں۔

محدثین کی اصطلاح میں حدیث مرسل وہ کہلاتی ہے۔ جس میں تابعی اپنے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان جو واسطہ ہے۔ اس کو بیان کئے بغیر بیان کر دے جیسے اس حدیث میں یزید بن رومان نے کیا کہ زمانہ عمر نہیں پایا مگر بتا دیا کہ زمانہ عمر میں بیس تراویح ہوتی تھی۔

یہاں دو باتیں تنقیح طلب ہیں۔

ایک مرسل روایات کی آئینی حیثیت

دوسرے مراسیل مؤطا کا حکم۔

موطا کے مراسیل کی حد تک تو محدثین کا فیصلہ ہے کہ موطا کے تمام مراسیل، منقطعات اور بلاغات متصل اور مسند ہیں۔ چنانچہ علامہ صالح فلانی لکھتے ہیں

ابن عبد البر نے بجز چار روایتوں کے تمام مراسیل اور منقطعات موطا کو باسانید صحیحہ موصولاً ذکر کیا ہے۔ اور ان چار کے متصل ہونے پر بھی حافظ ابن الصلاح نے ایک مستقل تالیف کی ہے جو میرے پاس موجود ہے۔ اور اس پر خود ان کے قلم کی تحریر بھی ہے۔

ایک مقام پر حافظ مغلطائی نے دعویٰ کیا ہے کہ دفتر حدیث میں سب سے پہلی صحیح کتاب موطا امام مالک ہے۔ حافظ مغلطائی کے اس دعویٰ پر حافظ عسقلانی نے

یہ اعتراض کیا کہ چونکہ موطا میں روایات مرسلہ ہیں۔ اس لئے مؤطا صرف امام مالک کو ماننے والوں کے نزدیک ہی صحیح ہے۔ دوسروں کے نزدیک نہیں۔ اس کا جواب تنویر الحوالک میں حافظ جلال الدین السیوطی نے جو دیا ہے وہ ہی سنانا چاہتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔

مؤطا میں جو مراسیل ہیں علاوہ اس کے کہ وہ بلا کسی شرط امام، مالک اور ان کے ماننے والوں میں حجت ہیں۔ ہمارے نزدیک بھی حجت ہیں کیونکہ ہمارے یہاں جب مرسل کا کوئی موید موجود ہو تو وہ حجت ہے اور موطا میں کوئی مرسل روایت ایسی موجود نہیں ہے کہ جس کا ایک یا ایک سے زیادہ موید موجود نہ ہو۔ (تنویر الحوالک)

یہ تو مراسیل مؤطا کی بات ہے۔ اور جہاں تک مرسل روایات کی آئینی حیثیت کا تعلق ہے۔ تو یہ حقیقت ہے کہ تیسری صدی سے پہلے مرسل روایات مسند کی طرح قابل حجت سمجھی جاتی تھیں۔ تیسری صدی کے شروع میں محدثین میں حدیث مرسل کے بارے میں اختلاف رونما ہوا۔ کچھ نے اس کو حجت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ نے اس کا درجہ مسند کے بعد رکھا اور کچھ نے اس کو مسند پر ترجیح دی۔

سب سے پہلے امام شافعی نے مرسل روایات پر کلام کیا ہے۔ چنانچہ امام ابوداؤد اپنے خط میں جو انہوں نے اہل مکہ کے نام لکھا ہے۔ اور جس میں انہوں نے اپنی کتاب سنن ابوداؤد کا تعارف کرایا ہے اور جس کے اقتباسات مشہور اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خان نے الحطہ میں درج کیے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

مرسل حدیثوں سے گذشتہ علماء جیسے سفیان ثوری۔ مالک بن انس اور اوزاعی استدلال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ امام شافعی آئے اور انہوں نے اس پر گفتگو کا دروازہ کھولا اور احمد بن حنبل وغیرہ نے اس موضوع پر ان ہی کی پیروی

کی ہے۔ لہذا جب کوئی مسند روایت مرسل روایت کے خلاف موجود نہ ہو۔ تو ایسی صورت میں مرسل روایت کو اپنایا جائے گا۔

لیکن الآمدی نے امام شافعی کے متعلق یہ بھی نقل کیا ہے کہ ایسے "مرسلات"،

جن کے ارسال کرنے والے کے متعلق یہ معلوم ہو گیا کہ وہ ارسال ایسے لوگوں سے نہیں کرتا جن میں جہالت نہ ہو۔ تو اس قسم کے لوگوں کی روایات قابل قبول ہوں گی۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ قابل اعتماد لوگوں کی روایات چاہے وہ اس کی سند نہ بتائیں۔ لیکن ان کا بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے بے سوچے سمجھے اس کو بیان نہیں کیا ہے۔ کیونکہ غالب امید ایک متدین متقی اور پرہیزگار آدمی سے یہی کی جا سکتی ہے کہ اپنے آپکو مطمئن کر لینے کے بعد ہی اس بڑی ذمہ داری کو انہوں نے قبول کیا ہے۔ یقیناً یہ ایک حیثیت سے افتراء علی اللہ ہے اور قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر افتراء علی اللہ کو سب سے بڑا ظلم قرار دیا گیا ہے۔ جن بزرگوں کی عدالت مسلم ہو ان سے   اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ کھلا ہوا ایک عقلی قانون ہے اور اسی بنا پر مرسل روایات کو عموماً حجت قرار دیا جاتا ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ الآمدی نے لکھا ہے۔

والمختار قبول مراسیل العدل مطلقا۔

بتایا جائے کہ یزید بن رومان ثقہ اور عادل ہے کہ نہیں۔ ان کی عدالت پر حرف گیری مسند روایات کی بربادی ہے۔ یہ اس موضوع پر تیسری صدی کے ارباب حدیث کے نظریہ کی توضیح ہے۔ ورنہ دوسری صدی کے محدثین یعنی تابعین کے یہاں تو اس موضوع پر کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ چنانچہ امام محمد بن جریر طبری کے حوالہ سے حافظ ابن عبدالبر نے نقل کیا ہے۔

ان التابعين اجمعوا باسرھم علی قبول المراسیل

اور یہ بھی لکھا ہے کہ دوسری صدی تک اس کا تابعین میں سے نہ کسی نے انکار کیا اور نہ ہی ائمہ میں سے کسی سے اس کے خلاف کوئی نکیر ثابت ہے۔ مصنفین صحاح میں سے صرف امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں تصریح کی ہے کہ مرسل روایات حجت نہیں ہیں۔ لیکن یہ تمام ارباب صحاح کا متفقہ فیصلہ نہیں ہے۔ امام ابوداؤد کے متعلق آپ سن آئے ہیں کہ

جب مسند مرسل کے خلاف نہ ہو اور مسند موجود نہ ہو تو مرسل سے استدلال کیا جائے گا۔

بلکہ حافظ ابوالفرج ابن الجوزی نے اپنی مشہور کتاب التحقیق فی احادیث الخلاف میں اور محدث خطیب بغدادی نے الجامع فی آداب الراوی میں امام احمد سے یہاں تک نقل کر دیا ہے کہ

بسا اوقات مرسل روایت مسند سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے۔ (شرح نقایہ ص۲۰۱)

اور تو اور متاخرین میں سے حافظ ابن حزم ظاہری تو یہاں تک فرما گئے۔

ایسے مراسیل جن کی پشت پر اجماع ہو۔ جو قرناً بعد قرنٍ نقل ہو کر آرہی ہو۔ اس کے لئے کسی بھی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ واقعہ کے ہونے کے لئے اس مرسل کا ہونا اور نہ ہونا دونوں یکساں ہیں۔ (توجیہہ النظر)

آیئے اس ترازو میں یزید بن رومان کی روایت کو تول کر دیکھ لیجئے۔ کیا اس کی پشت پر سیزدہ صد سالہ امت کی اجماعی قوت نہیں ہے۔ کیا یہ قرناً بعد قرنٍ نقل ہو کر نہیں آرہی ہے؟ بتلایا جائے کہ کیا اسکی حیثیت لا وصیۃ لوارث سے کچھ بھی

مختلف ہے ۔

اگر یہ بغیر سند کے صرف اس لئے مقبول ہے کہ اس کی پشت پر امت کی اجماعی طاقت ہے ۔ تو بتلایا جائے ۔ کہ یزید بن رومان کی روایت کو درجہ پذیرائی کیوں نہیں ہے ؟ یہ تو مرسلات تابعین ہیں ۔۔۔ ان کا تو مقام ہی بالا ہے آج تو خود مرسلات علماء بھی حجت ہیں ۔ بتلایا جائے ۔ کہ آج بھی بخاری و مسلم وغیرہ کی متصل روایات کو ہم جو صحیح مانتے ہیں تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ صرف ان ائمہ کی دیانت پر اعتماد ہی کی وجہ سے ان کو صحیح کہا جاتا ہے ۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر کہتے ہیں ۔

اعلم ان اقوی المراسیل ما ارسله العلماء من احادیث

هذه الکتب ۔

اللہ اکبر ! ہم اگر کہیں کہ یہ کتاب امام بخاری کی تصنیف ہے یہ تو صحیح ہے حالانکہ یہ بات ہم دس صدیاں گذرنے پر لوگوں کو بتلا رہے ہیں اور یزید بن رومان اگر پہلی ہی صدی میں صرف چند سال پہلے کی بات بتائیں کہ یہ کام زمانہ عمر میں ہوتا تھا تو یہ غلط ہے ۔ چاہے یزید نے حضرت عمر کے پوتوں عبید اللہ اور سالم کے سامنے ہی زانوئے شاگردی نہ کیا ہو ۔ اور چاہے وہ عالم ہوں ، کثیر الحدیث ہوں اور ثقہ ہوں مگر منظور نہیں ۔ فانا للہ والی اللہ المشتکی ۔

اسی قسم کے اختراعی قواعد کے نتیجے میں متعدد مسائل میں ائمہ مجتہدین اور فقہاء سے کٹ کر نئے نئے فرقوں کی بنیاد پڑ گئی ہے ۔

سچ یہ ہے کہ تابعین کو اپنے بزرگوں پر ویسا ہی اعتماد تھا ۔ جیسا کہ صاحب مشکوٰۃ اور صاحب مصابیح کو صحاح ستہ کے مؤلفین پر تھا ۔ اور جس طرح انہوں نے حدیثوں کو اپنی کتابوں میں صرف اپنے بزرگوں کے اعتماد پر بلا سند یہ کہہ کر کہ

وان کان نقلہ وانہ من الثقات کالاسناد

درج کر دیا ہے۔ اسی طرح تابعین نے اپنے اساتذہ کی روایات کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ آخر یہ کونسا انصاف ہے کہ ہم تو اپنے اساتذہ پر اعتماد کریں۔ اور تابعین سے اپنے اساتذہ پر اعتماد کی توقع نہ رکھیں۔ ہمارے مراسیل تو مقبول ہوں اور تابعین کے مراسیل مردود ہوں فیا للاسف ویا للعار لیجئے اب وقت زیادہ ہو گیا ہے۔ ختم کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

بنام مولانا سید کرامت علیشاہ صاحب فاضل دیوبند مدرس عربی تبلیغ الاسلام ہائی اسکول۔ چونڈہ ضلع سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۰ر فروری ۱۹۵۴ء

رہائی کی تاریخ اور پھر قید کی توسیع۔ جیل کی زندگی میں بے فکری، علائق کی کثرت غم والم کا سامان ہے۔ عزلت کی برکتیں، دنیا سے بحیثیت دنیا کے بے تعلقی اور دل میں اللہ کی لگن، ایمانِ کامل ہی دل کی راحت کا ضامن ہے۔ جیل میں قیدیوں کی قید کا پسِ منظر۔ اگر جیل میں آنا ہی سزا ہے۔ تو مجرم اور غیر مجرم میں کیا فرق۔ جیل میں قیدیوں کی زندگی کی تصویر۔ اگر اسلام کے صرف فوجداری حصہ کو اپنایا جائے تو جیلیں اسّی فیصدی خالی ہو جاتی ہیں۔ اسلام کی خاطر چراغ آرزو روشن ہو کر بھڑک بھی گیا۔

عزیز من! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

جی چاہا کہ تم سے کچھ دل بہلاؤں۔ کیا کہوں ایک بجا تھا۔ آسمان نکھرا ہوا تھا چمکتے آفتاب کی تیز کرنوں میں دیوار پہ بیٹھا سرمائی سلوٹوں کو کھول رہا تھا۔ میری نگاہ سامنے جیل کی دیوار پہ بیٹھی ہوئی چڑیوں کے تماشے میں تھی۔ کبھی وہ سطح دیوار پہ آتیں اور کبھی جیل کی کوٹھڑیوں میں گھس جاتیں۔ پھر اُٹھتیں۔ اِدھر اُدھر اڑتیں۔ جیل کی دیواروں سے گزر کر واپس آجاتیں۔ ان کی اسی آزادی سے اپنی نظر بندی کا خیال آیا۔ اور اسی خیال میں ڈوب کر رہ گیا۔ اور سوچ ہی رہا تھا کہ

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

پچھ تاریخ کے بعد رہا ہو کر کیا کرونگا۔ کہاں جاؤنگا۔ لوگوں کو کیا سناؤنگا۔ اور ان سے کس چیز کا مطالبہ کرونگا۔ اس وقت مشکلات کیا ہیں۔ وقت کے سوالات

کیا ہیں۔ میں اندر کیوں آیا تھا۔ اور باہر کیوں جا رہا ہوں۔ اگر میرا آنا کسی مقصد کی خاطر تھا تو جانا کیوں؟ دماغ میں جانے کے خیالات کیوں چٹکیاں لیتے ہیں کیا اس لئے کہ جا کر کچھ کرنا ہے۔ کرنا ہے تو کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ انہیں خیالات کی ادھیڑ بن میں تھا کہ اچانک دروازہ کھلا۔ آگے آگے کرنل فخرالدین اور پیچھے راجہ صاحب۔ ہیڈ کلرک وغیرہ ہاتھوں میں کچھ کاغذ لئے آئے۔ حالات کیسے ہی خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار مگر کرنل صاحب اپنی خاص ادائیں رکھتے ہیں۔ میں کاغذات کو دیکھ کر متحیر سا ہوا۔ رہائی کا بھوت دماغ پر پہلے ہی سے سوار تھا کاغذات کی نمود نے ایک تلاطم پیدا کر دیا۔ کچھ حیرت سے اور کچھ تعجب سے آئندگان کے چہروں کو پڑھنے میں لگ گیا مگر

شمع خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کرنل صاحب نے

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں

گفتہ آید در حدیث دیگراں

کی طرح ڈالتے ہوئے چولھے پر رکھی ہوئی دیگچی کے متعلق پوچھ لیا کہ کیا پک رہا ہے۔ ہم دلبران نظم و نسق کی ایک ایک ادا کے محرم راز ہو چکے تھے۔ بھانپ گئے کہ اسرار کی منادی سر بازار ہونے والی ہے وہ تو سے

ہاون تو ہے عقل کا دستہ پالسی کا

کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ مگر یہاں معاملہ اور تھا گویا سے

لیکن ادھر تصور جانا نہیں کسی کا

مانا کہ نظر بند ہیں لیکن سے

زباں ہے اگر ناتوانی سے بند
مرے دل پہ نہیں معنی کے در بند

کھل گئے اور یوں گویا ہوئے کہ لو دستخط کرو۔ دستخط کا نام سنتے ہی اپنے طوطے اڑ گئے قلم لیا۔ شرم سے گڑ گیا۔ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جو نام سب سے بڑے نبی اور سب سے اونچے ولی کے ناموں کا مجموعہ یعنی محمدؐ علیؑ۔ اس کے پہلے ہی لفظ نے زبانِ قلم پہ آنے سے یہ خیال کر کے انکار کر دیا۔ کہ رہائی کی خاطر شائد یہ پیکٹ ہو رہا ہے۔ کہ یکایک ہجوم عام میں نگاہ نے پیشانی کو دیکھا۔ تو

یہ نظر بندی نکلی نورِ سحر　　　دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

پتہ چلا کہ رہائی نہیں بلکہ نظر بندی کی توسیع ہے ؎

سنتے دار کو حکم نظر بندی ملا

کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ آپ کہیں گے کیا خوب ہو ند لگایا ہے میں کہوں گا کیا خوب اظہار حقیقت ہے۔ دل باغ باغ ہو کر بلیوں اچھلنے لگا۔ ساری الجھنیں ختم ہو گئیں۔ خیالات میں جس قدر گلجھٹیاں تھیں اب ایک ایک کر کے خود بخود کھل گئیں۔ بارگاہ اقدس سے پر امید ہوں۔

امتحاں سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا　　　جو ہر ایک حال میں امید سے معمور نہیں

ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ　　　اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

اب تو یہی کہتا ہوں کہ خداوندا تیری رضا مطلوب اور تیری پسند مقصود ہے۔ جوہر کا ایک شعر ذرا سی ترمیم سے میرے محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

اپنی عزت مجھے مطلوب ہے لیکن انکو　　　نہیں منظور تو پھر مجھ کو بھی منظور نہیں

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی محسوس کرتا ہوں کہ وقت گزر رہا ہے۔ معاش کی ساری الجھنوں سے آزاد ہوں۔ چائے تین وقت اور کھانا شاندار صبح و شام مل جاتا ہے۔ زندگی کی ساری آسائشیں یہاں جمع ہیں۔ سب سے بڑی آسائش اور سب سے بڑی نعمت جو باہر کسی قیمت پر نہیں ملتی۔ وہ خلوت اور تنہائی ہے۔ اور گویا

بقول حضرت جوہر ؎

تنہائی کے سب دن ہیں اور تنہائی کی سب راتیں

اب ہونے لگیں خلوت میں ان سے ملاقاتیں

تو سیلیع آنے سے پہلے بھی خلوت تھی۔ مگر ایسی نہ تھی۔ اب تو واقعی ؎

تنہائی کے سب دن اور تنہائی کی سب راتیں ہیں۔ اکیلا رہتا ہوں کوئی نہیں ہے۔ اب دل میں باہر جانے کی وہ بھڑک نہیں جو یکم فروری سے پہلے تھی۔ اب تو یوں محسوس ہو رہا ہے۔

بس تیرا گھر سمجھ کے سرِ راہ گر پڑا	دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

تجربہ یہی ہے کہ علائق کی کثرت جس قدر ہو گی اسی نسبت سے سامانِ غم والم بھی بڑھتے جائیں گے۔ امن و عافیت تو بس خلوت میں ہے۔ اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے ؎

دل تعلق بڑھا کے پچھتایا	پاؤں پھیلا کے ہاتھ ملتا ہے

اگر جلوت صالحہ نہ ہو تو سارا وقت دوسروں کی عیب چینی اور نقص جوئی میں گزرتا ہے اور اپنی کمزوریوں، خطا کاریوں کی طرف خلوت میں بھولے سے بھی توجہ نہیں ہوتی۔ آہ ؎ میری نسبت جو ارشاد ہوا وہ میں نے سنا ٭ یہ تو کہیئے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہے۔

انسان کی نسبت سب سے زیادہ صحیح رائے خود اس کا ضمیر قائم کر سکتا ہے کیونکہ وہ اس کی اصلی کمزوریوں سے واقف ہوتا ہے۔ میں ساری دنیا کو دھوکہ دے سکتا ہوں۔ لیکن خود اپنے ضمیر سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔

نہ بھول اس پر کہ یہ اور وہ تجھے ایسا سمجھتا ہے

تو اے دل اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے

دل کا معاملہ اللہ جل شانہٗ کے ساتھ ہے اصل میں خود کمزور ہوں۔ ورنہ اخلاق کی

صفائی، تزکیہ نفس صرف گوشہ نشینی سے حاصل نہیں ہوتی۔ اصل چیزوں کی بے تعلقی اور اس کا مدار عمل پر ہے۔ اچھی باتوں کی داد دینے والے بہت سے مل جاتے ہیں۔ دل سے ماننے والے ان پر عمل کر کے دکھانے والے کم ہی ہوتے ہیں۔

حرص دنیا سے نہیں ہر صاحب عزلت بری　　خانقاہیں اور ہیں اور دل کا کونا اور ہے

مدحت گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند　　خوب کہنا اور ہے اور خوب ہونا اور ہے

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ عزلت میرے لئے راحتوں کا سامان ہے اور اسمیں بھی میری ہی کمزوری کا راز چھپا ہوا ہے کہ نفس کی راحتوں کے سامان تلاش کرتا ہوں۔ اب خود ہی سوچ لیجئے کہ مجھ میں اور بزرگوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ وہاں خلوت کی اسلئے تلاش ہے کہ اسمیں نفس کی ناگواریاں سمٹی ہوئی ہیں۔ اور اب اسلئے مطلوب ہے کہ اس میں لذتوں کا سامان ہے۔ سکون دل اور اطمینان خاطر کا راستہ خلوت نہیں اسکی شاہراہ اور ہے۔ سارے ولیوں کا سمجھایا ہوا راستہ یعنی دنیا سے بحیثیت دنیا کی بے تعلقی و بے زاری اور دل میں کسی کی لگن۔ ہاتھ پیر چلیں پھریں مگر دل میں انگیٹھی دہکتی رہے۔ جو اہل دنیا کا رخ کرو گے۔ سکون خاطر کبھی نہ ہوگا۔ شریک غفلت بہت سے ملینگے۔ شریک عبرت کوئی نہ ہوگا۔ صدیوں پیشتر اسکی منادی کردیگئی۔ کہ اطمینان و راحت دل صرف ان لوگوں کا حصہ ہے۔ جو ایمان کامل رکھتے ہیں۔ اور اپنی بدعملیوں سے اپنی ایمان کو زنگ آلود نہیں بناتے۔

نیکی کیطرف رخ ہو یہی ناموری ہے　　کھوٹے کو جدا کردے وہی بات کھری ہے

جوہر کی آواز بھی اس آوازہ حق کی صدائے بازگشت ہے۔

سوز دروں سے جل بھنو لیکن دھواں نہ ہو　　ہے درد کی یہ شرط کہ لب پہ فغاں نہ ہو

سر دلبراں کچھ حدیث دیگراں ہی میں خوش تر و خوشگوار تر ہوتا ہے۔ اور استاد غالب اپنی زبان میں فرماتے ہیں۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

سنتے ہیں۔ قدیم صوفیہ میں ایک فرقہ ملامتیہ تھا۔ ظاہر خراب باطن آراستہ، وضع رندانہ اور صورت مستانہ، لیکن اعمال زاہدانہ اور سیرت فقیرانہ۔ جیل بھی ایک چھوٹے پیمانہ پر عالم صغیر ہے۔

یعنی عالمِ کبیر میں جو کچھ بھی ہے۔ سب کا نمونہ انگریزیہ کی بسائی ہوئی اس نگری کے اندر موجود ہے کم از کم ضلع سیالکوٹ کا تو اسے ایک زندہ عجائب خانہ سمجھ لیجئے۔ ہر نوع، ہر قماش، ہر نمونہ کے انسان کو اس ننھی سی دُنیا میں آ کر دیکھ لیجئے۔ گویا یہاں انسانیت بکھری ہوئی ہے۔ سب کے باطن سب کے اخلاق، سب کمالات یہاں کے یونیفارم کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔ مہا قزاق، مہا ڈاکو، قاتلوں کے راجہ، چوروں کے گرووں کے گروپ میں وہ بے گناہ چہرے بھی ہیں۔ جو سورج کی کرنوں سے شرما جائیں۔ اور جن میں ابھی تک ماں کے دودھ کی آب باقی ہے۔

بدل جائیگا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے   نئی صورت کی خوشیاں اور نئے سامانِ غم ہونگے

یہاں لباس کی سادگی۔ رہائش کی سادگی، خوراک کی سادگی کو دیکھ کر ملامتیوں کا تصور آجاتا ہے۔ مگر یہ نہ سمجھ لیجئے کہ یہ ملامتی ہیں۔ تشبیہ صرف ظاہر میں ہے۔ کردار اور اعمال میں ہرگز تشبیہ نہیں ہے باطن کا حال سب کا خدا کو معلوم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جیل کے قانون کا پس منظر کیا ہے عقوبت وقصاص یا اصلاح و تربیت۔ اس نگری میں زندگی کے جو نقوش پائے جاتے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے کوئی پس منظر منفرد کرنا از بس مشکل ہے۔ بیشک یہاں مناظر کا لطف عمدہ ترین کھانوں کی لذت بہترین نعمتوں کا مزہ، شیریں پھل اور ٹھنڈے پانی کی روح افزائی، بہتی ندیوں کے کناروں کے دلربا سائے حور وش بھولی اور مسلمان رو بچوں کی رفاقت نصیب نہیں ہے مگر اس میں سزا اور عقوبت کا تصور ہی کیا ہے۔ جیل سے باہر بھی کتنے ناکردہ گناہوں کی زندگیاں ان سے محروم ہیں۔ اگر یہی سزا ہے۔ تو مجرم اور غیر مجرم میں کیا فرق؟ ذرا غور سے دیکھو کہ یہاں معیشت کا معیار خواہ کتنا سادہ ہے۔ مگر بے فکری سے کھانے کیلئے روٹی۔ پہننے کیلئے کپڑے، رہنے کیلئے مکان بغیر بلے جلے ملتا ہے۔ اے کاش حکومت باہر غریبوں، اندھوں، اپاہجوں، لنگڑوں، بوڑھوں اور بے کاروں کیلئے جیل ہی جیسی معیاری معیشت کا انتظام کردے۔ یا کم از کم ان ہٹے کٹوں سے قوم کیلئے کوئی مفید کام کرائے۔ تم یہ سُن کر حیران ہوگے، کہ کوئی جیل خانہ بھی خود کفیل نہیں ہے۔ بلکہ چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں کا بوجھ عوام کی جیبوں

پر پڑتا ہے۔ لیجئے جرم کون کرتا ہے۔ اور جرمانہ کس کو ہے۔ مجھے ہی لے لیجئے۔ کہ میں ناکردہ گناہ کے جرم میں اندر پڑا ہوں۔ کوئی اصولی حکومت ہو تو مجھ پہ عدالت میں مقدمہ چلائے جرم ثابت ہو جائے۔ تو تختہ دار پہ لٹکا دے۔ مگر داد دیجئے اس بے عقلی کی کہ اندر رکھے ہوئے ہیں۔ اور پورے ۷۵ روپے ماہانہ خرچ کر رہے ہیں۔ اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ اسلام اپنانے میں بڑی راحت ہے۔ سچ کہتا ہوں۔ آج اگر صرف فوجداری عدالت میں اسلامی قانون اپناتے تو جیلیں اسّی فیصدی خالی ہو جاتی ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ یہاں ۸۰ فیصد قیدی فوجداری الزامات میں آئے ہیں۔ اگر آج کچھ نہیں پاکستان میں صرف فوجداری الزامات کی حد تک اسلامی قانون نافذ ہو جائے تو میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں۔ کہ جیل کی ۸۰ فیصدی آبادی گھٹ جائے اور بالفاظ دیگر ۸۰ فیصدی حکومت کو مالیاتی شعبے میں اخراجات کی بچت ہو۔ اس سے بھی آگے ترقی کر کے کہتا ہوں کہ عوام سے ۸۰ فیصدی بوجھ ہٹ جائے۔ مگر کیا کہوں اور کس سے کہوں۔ بھلا ان اسلامی آئین کے ڈھنڈورچیوں کو کون سمجھائے۔ وعدہ تو کرتے ہیں مگر

یقین آنے کو تو آجائے تیرے عہد پیماں کا　　تیری آنکھ لے وعدہ بت شکن کچھ اور کہتی ہے

کن کن صبر آزمائیوں کے بعد آرزوں کی یہ کلی کھلی تھی۔ کہ اسلامی تہذیب، اسلامی تمدن، اسلامی ثقافت، اسلامی روایات اور اسلامی معاشرت کو گوشۂ آزادی نصیب ہوا۔

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش　　تھی رات یاس اور دل ناصبور تھا

بیشک دستور میں اسلام کی خاطر کچھ دفعات کا اضافہ ہوا ہے ؎

پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور ہی کہتی ہے

خوب کہنے کی حد تک تو میں بھی خداوندان پاکستان کی بڑھ بڑھ کر داد دیتا ہوں۔ مگر

خوب کہنا اور ہے اور خوب ہونا اور ہے

کیونکہ حکومت کے کردار کا مظہر ہی عوام ہوتے ہیں۔ اکبر کا ایک شعر ذرا سی ترمیم سے حالات

کا نقاش بن جاتا ہے۔

باتوں کو تم نہ جانچو پبلک سے مل کے دیکھو
کیا ہو رہا ہے آخر کیسی گذر رہی ہے

یہ شاعری نہیں بلکہ واقعات کی ترجمانی ہے۔ اقبال نے جو دعا مانگی تھی کہ

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کردے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کردے

وہ آدھی تو پوری ہو گئی۔ اسلام کی خاطر چراغ آرزو روشن ہو کر بھڑک بھی گیا۔ لیکن ابھی اسلام کو ضرورت ہے۔ شہیدان جستجو کی ہیں دور نکل گیا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں۔ کہ اگر ضابطہ فوجداری کی حد تک اسلام کو اپنا لیا جائے تو جیل کی آبادکاری کی مہم ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اچھا لو۔ آپ بچوں کے لئے پیاروں کی سوغات، بڑوں کے لئے سلاموں کی ڈالیاں، اور دوستوں کے لئے دعاؤں کے تحفے لے جاؤ۔ سچ بتاؤ کبھی یاد بھی کرتے ہو۔ تمہارا متبسم چہرہ ہر وقت نگاہوں میں کھیلتا رہتا ہے۔ ۲۳ سال پیچھے الٹی زقند لگا کر تمہیں دیکھتا ہوں۔ تو حیران رہجاتا ہوں۔ اور اپنا اب کچھ نہ پوچھو۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

بنام چوہدری محمد جمیل صاحب آڑھتی گندم منڈی شہر سیالکوٹ